بندھن
رضیہ بٹ
www.pklibrary.com

ہماری پوسٹنگ اس اسٹیشن پر دو ماہ ہوئے ہوئی تھی۔ کرنل صاحب تو پوسٹنگ کے ساتھ ہی یہاں آ گئے تھے۔ لیکن ہمیں گھر کے لیے دو ماہ انتظار کرنا پڑا تھا۔۔۔ دو ماہ ہم کھاریاں ہی میں رہے تھے۔ پوسٹنگز میں ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ پنڈی جیسی جگہ پر گھر ملنا خاصا مسئلہ ہے۔ ویٹنگ لسٹ پر ہی کئی کئی ماہ گزر جاتے ہیں۔ آفیسر زیادہ ہیں اور جگہیں کم۔ اس لیے گھروں کا مسئلہ اکثر پریشان کرتا ہے۔ میرے میاں کی پروموشن ہوئی تھی۔ فل کرنل ہوئے تھے۔ ٹرانسفر بھی اسی لیے ہوئی تھی۔ کھاریاں میں ہم پونے تین سال ہی رہ پائے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمیں دو ماہ کے اندر ہی گھر مل گیا۔ ایک مہینہ ہمیں اس میں مقیم آفیسر کی فیملی کے لیے انتظار کرنا پڑا۔ وہ لوگ کوئٹہ پوسٹ ہوئے تھے۔ اور جب تک انہیں کوئٹہ گھر نہیں ملا۔ وہ یہ گھر نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ ہمارا سامان اسی ہفتے یہاں پہنچا تھا۔ بالکل ویسا ہی گھر تھا۔ جیسا ہم کھاریاں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس لیے اسے سیٹ کرنے میں زیادہ دقت نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے تو یوں لگتا تھا وہی گھر اٹھا کر یہاں لے جایا گیا ہو۔ ہر جگہ اسی طرح دکھ رہی تھی۔ جیسی کھاریاں میں تھی۔ حالانکہ میری بارہ سالہ بچی مونا کو ویسی ہی سیٹنگ پسند نہ تھی۔ وہ کچھ نہ کچھ تبدیلی چاہتی تھی۔

"امی اگر یہ صوفہ اس طرف رکھوا دیں تو۔۔۔ کھاریاں میں بھی ایسے ہی کھڑکی کے سامنے ہوتا تھا۔ لگتا ہی نہیں کہ ہم کسی دوسرے شہر میں آ گئے ہیں۔"

"یہ تو اور بھی اچھی بات ہے کہ محسوس ہی نہ ہو ہم تبدیل ہو کر کسی اور جگہ آ گئے ہیں۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"ہم اپنا کمرہ اوپر بنائیں گے۔" مونا نے کہا، جو کھاریاں میں نچلے بیڈروم میں اپنی بہن کے ساتھ رہتی تھی۔

"ہاں یہ تبدیلی تم کر سکتی ہو۔ ویسے جینی سے پوچھ لو۔"

"اس نے بھی یہی کہا ہے۔"

"پھر ٹھیک ہے، نچلا کمرہ گیسٹ روم بن جائے گا۔"

"ہاں بنالیں۔"

نئے اسٹیشن پر آکر خاصی مصروفیت ہو جاتی ہے۔ نئی جگہ نئے ماحول میں اپنے آپ کو سیٹ کرنا پڑتا ہے۔ نئے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، نئے دوست بنانا پڑتے ہیں۔ بچوں کے مسائل ہوتے ہیں۔ ان کے داخلے نئے سکولوں میں کروانا ہوتے ہیں۔ ٹیچرز سے ملنا، سکول دیکھنا، پڑھائی کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہوتی ہیں۔ پھر سکول آنے جانے کیلیئے بندوبست کرنا ہوتا ہے۔ غرضیکہ کئی مسائل ہوتے ہیں۔ کئی جھنجھٹ ہوتے ہیں، جن سے نپٹنا پڑتا ہے۔ مجھے بھی پتہ تھا کہ یہ سب کام کرنے ہیں۔ اس لیے میں جلدی جلدی گھر سیٹ کر رہی تھی۔

پورا ہفتہ میں اس کام میں مصروف رہی۔ اردلی کے ساتھ خود بھی کام کرنا پڑتا تھا۔ ہر چیز ٹھکانے پر مجھے ہی رکھنا تھی نا۔۔۔ پورا ہفتہ مصروفیت میں گزرا۔ میں اپنے ہمسایوں تک سے نہ مل پائی۔۔۔ شام کو کرنل صاحب کہتے ہیں۔ "چلو ارد گرد کے لوگوں سے متعارف ہو جائیں۔ کال کرنے چلیں۔"

لیکن میں تھکی ہوئی جواب دیتی۔۔۔ "مل لیں گے۔ ہم بھاگے جا رہے ہیں نہ ارد گرد کے لوگ۔۔۔۔ یہیں رہنا ہے۔۔۔ ذرا فارغ ہو لوں۔۔ پھر یہی کام ہو گا۔"

ہم فوجی لوگوں کی مخصوص طرز کی زندگی ہوتی ہے۔ ہم سب کے وسائل ایک سے ہوتے

ہیں۔ مسائل ایک سے ہوتے ہیں۔ لگی بندھی تنخواہیں ہوتی ہیں۔ اس لیے عام طور پر طرز زندگی بھی ایک

جیسا ہی ہوتا ہے۔ ویسے عام طور پر ہم لوگ ایک دوسرے سے خوش دلی سے ملتے ہیں۔ چھوٹی موٹی پارٹیاں کرتے رہتے ہیں۔ یوں ملنے ملانے کے موقعے ملتے رہتے ہیں۔ ہم سب آفیسرز اسی وجہ سے لگتا ہے کہ ایک بڑے کنبے کے افراد ہیں۔

ہم لوگ تو جس سٹیشن پر بھی رہے۔۔۔ خلوص سے دوست بنائے اور دوستی نبھائی۔ کھاریاں چھوڑتے ہوئے افسوس بھی اسی لیے تھا کہ بہت قریبی دوست یہاں رہ گئے تھے۔ لیکن یوں تو ہوتا رہتا ہے کہ اب یہاں وہی طریق کار اپنائیں گے۔ ملیں ملائیں گے۔ اور جو ہمارے مزاج سے موافقت رکھتے ہوں گے، ان سے دوستی ہو گی اور خلوص سے نبھے گی۔

اس دن میں مونا اور جینی کا کمرہ سیٹ کر رہی تھی۔ ان کے بیڈ ڈلوائے، الماریاں درست کیں۔ ان کی کتابیں شیلف میں رکھیں۔ پڑھنے کے لیے میز اور کرسیاں ڈلوا کر ٹیبل لیمپ سیٹ کروایا۔ میں صبح سے اسی کمرے میں تھی۔ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ نیچے جیپ کے رکنے کی آواز آئی تو پتہ چلا۔۔۔ کہ دو بج چکے ہیں۔

"کرنل صاحب آ گئے۔" اردلی نے بچوں کے جوتے الماری کے نچلے خانے میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو وقت کا پتہ ہی نہیں چلا آج۔۔۔ اتنا کاٹھ کباڑ تھا بچوں کا۔۔" میں نے جینی کی کتابیں درست کیں اور کہا۔ "کھانا تو تیار ہے نا۔"

"جی۔۔۔ لیکن میز نہیں لگائی ابھی۔۔۔"

"تم جاؤ۔۔۔ مونا سے کہو میز لگائے۔ تم کھانا گرم کرو اور پھلکے بناؤ۔"

"اچھا جی۔"

"میں بھی ابھی آتی ہوں۔"

"بہت اچھا۔۔۔"

اردلی چلا گیا۔ میں جلدی جلدی بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔

کرنل صاحب اوپر اسی کمرے میں آگئے۔

"توبہ۔۔۔ کب فراغت ملے گی تمہیں۔۔۔" وہ بیلٹ اتارتے ہوئے بولے۔

"بس تقریباً ختم ہی ہے کام۔"

"تم نے تو لگتا ہے منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا، صبح سے لگی ہو نا یہ کام کرنے۔"

"جب تک نپٹا نہ لوں گی۔ قرار نہیں آئے گا مجھے، آپ میری عادت سے واقف تو ہیں۔"

کرنل صاحب مسکرائے۔ پھر بچوں س کی کتابیں الٹنے پلٹنے لگے۔

"آپ وردی تبدیل کر لیں۔ کھانا تیار ہے۔ میں بھی فارغ ہو کر آتی ہوں۔"

"اچھا۔۔۔" وہ کمرے سے نکلنے لگے۔ لیکن پھر ایک دم مڑے اور بولے۔ "تمہیں بتانا تو بھول ہی گیا۔"

"کیا؟"

"وہ اپنے بریگیڈر لطیف تھے نا۔"

"ہاں۔ ہاں۔"

"وہ بھی ان دنوں یہیں ہیں۔"

"سچ۔"

"ہاں آج ہی پتہ چلا ہے۔"

میں خوش ہوگئی۔ "یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔"

"مجھے بھی آج ہی پتہ چلا۔ بہت خوشی ہوئی۔ اسی ہفتے وہ یہاں آئے ہیں۔"

"کوئٹہ سے۔"

"نہیں، کراچی سے یہاں پوسٹ ہوئے ہیں۔"

"فیملی تو نہیں آئی ہوگی ابھی۔"

"شاید نہیں۔"

"چلو نہیں آئے تو آجائیں گے۔ ان کی بچیاں تو اب جوان ہوں گی۔ ثمینہ تو میرا خیال ہے ایم اے میں پہنچ چکی ہوگی۔ روبینہ بی اے میں اور وہ روزی۔ شاید آٹھویں نویں میں ہوگی۔"

میں سالوں کا حساب لگانے لگی۔ پھر بولی۔ "چار سال کے بعد ہم پھر اکٹھے ہوں گے۔"

"ہاں! یہ تیسرا موقع ہے اکٹھے ہونے کا۔" کرنل صاحب نے اپنی سروس کا حساب لگاتے ہوئے کہا۔

"ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ پرانے لوگ بار بار اکٹھے ہوں۔"

"واقعی اتفاق ہی ہے۔"

"ہماری دوستی میں بے پناہ خلوص ہے نا۔ اس لیے کھنچے چلے آتے ہیں ایک دوسری کی طرف۔" میں نے کہا تو کرنل ہنس دیے۔

میں نے ہاتھ میں پکڑے دونوں تولیے، جو میں بچوں کے باتھ روم میں رکھنے جا رہی تھی وہیں ٹیبل پر رکھ دیئے اور کرنل صاحب کے پیچھے پیچھے اپنے بیڈ روم میں آگئی۔ انہوں نے لباس تبدیل کیا۔ پھر ہم کھانے کے کمرے میں چلے گئے۔ جہاں مونا، جینی اور ہمارا بیٹا فرید پہلے ہی سے موجود تھے۔ ہم کھانے کے دوران بھی بریگیڈئر لطیف اور ان کے اہل خانہ ہی کی باتیں کرتے رہے۔

بریگیڈیر لطیف اور ان کے اہل خانہ سے ہمارے بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ جب ہماری شادی ہونی تھی اور میرے میاں کیپٹن تھے، ان دنوں بریگیڈیر لطیف کرنل تھے۔ بڑے ادب نواز تھے۔ اور سچی بات میرے میاں اور ان کی دوستی کا واسطہ بھی یہی تھا۔

ورنہ رینک کا اتنا فرق، بے تکلفانہ دوستی کا کبھی حامل نہیں ہوتا۔ بریگیڈیر صاحب کا رویہ ہمارے ساتھ کبھی باس کا سا نہیں ہوا تھا۔ بالکل چھوٹے بھائی بہنوں کے طرح ہم سے پیار کرتے تھے۔ ان کی بیگم رخشندہ آپا بھی بڑی ملنسار اور خوش اخلاق عورت تھیں۔ بہت سلجھی ہوئی، باوقار سی خاتون تھیں۔ میں نے ازدواجی زندگی میں قدم رکھا تو ان کی رفاقت نصیب ہوئی اور میں سمجھتی ہوں کہ میری خوشگوار ازدواجی زندگی کا کریڈٹ بہت حد تک انہیں جاتا ہے۔ مجھے کس طرح باتوں باتوں میں ہی وہ زندگی کو خوش گوار بنانے کے گر بتایا کرتی تھیں، مجھے اب تک یاد ہے میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا، بہت کچھ پایا تھا۔ ایسی مکمل خاتون میری نظروں سے کوئی نہیں گزری۔ چار پانچ سال پہلے ہم کوئٹہ میں اکٹھے رہے تھے۔ تین چار سال کا عرصہ بھی ہمارے لیے یادگار تھا۔ دونوں میاں بیوی ہمارا اس طرح خیال رکھتے تھے کہ ہمیں اپنے والدین سے دوری کا احساس بھی کبھی نہ ہوتا۔ ان کی تینوں بچیاں مجھ سے بڑی مانوس تھیں۔ رخشندہ آپا نے اپنی بچیوں کی جس طرح تربیت کی تھی، وہ قابل تحسین تھیں۔ تینوں بچیاں بڑی پیاری اور ماں ہی کی طرح سلجھی ہوئی تھیں۔ خاص کر ثمینہ تو بہت ہی سدھری اور نکھری ہوئی لڑکی تھی۔ ان دنوں وہ شاید تھرڈ ائیر میں تھی۔ پڑھائی میں بہت تیز تھی۔ ہمیشہ اچھی پوزیشن لے کر پاس ہوتی تھی۔ پڑھنے کے ساتھ گھر کے کاموں میں بھی ماں نے طاق کر دیا تھا۔ سلائی کڑھائی، کھانا پکانا اور گھر کو سجانا بنانا اسے خوب آتا تھا۔ رخشندہ آپا نے بچیوں کو مذہب سے بیگانہ بھی نہیں کیا تھا۔ زمانے کو دیکھتے ہوئے رخشندہ آپا نے اپنی بچیوں کی تربیت ایسی کی تھی کہ وہ سوسائٹی میں بھی

وقار سے اپنا مقام بنائے تھیں اور گھریلو بھی حد درجہ کی تھیں۔ انہوں نے ثمینہ کو گھڑ سواری اور تیراکی میں بھی ماہر کیا تھا۔ ڈرائیونگ تو وہ بہت چھوٹی تھیں، تب سے کرتی تھیں۔

رخشندہ آپا کہا کرتیں۔

"لڑکیوں کو ہر قسم کے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے کے قابل بنانا چاہئے۔ زمانہ تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ آج کل کے لڑکے ایسی بیویاں چاہتے ہیں جو گھر اور باہر پوری طرح ان کا ساتھ

دے سکیں۔ اس لیے لڑکیوں کی تربیت بھی اسی طرح کرنا چاہئے۔"

واقعی ان کی بچیاں زمانے کا ساتھ دے سکتی تھیں، ان میں بھرپور اعتماد تھا۔

ان کی تینوں ہی بیٹیاں قابل ستائش تھیں لیکن ثمینہ مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ شکل وصورت بھی پیاری تھی۔ سمارٹ بھی تھی۔ اسے رنگ رنگ کے لباس پہننے کا بہت شوق تھا۔ کئی لباس اس نے خود وضع کیے تھے۔ ان لباسوں کی جدت اور انفرادیت کو دوسرے آفیسرز کی بیویاں اور بچیاں بہت سراہا کرتی تھیں۔

اسے بالوں کے سٹائل بدلنے کا بھی کریز تھا۔ اپنے کندھوں تک کٹے بالوں کو وہ بڑے خوبصورت انداز میں بنایا کرتی۔ تقریبات اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ میں نے ہر تقریب میں اس کے بالوں کا سٹائل مختلف دیکھا تھا۔ لوگ اس کی بہت تعریفیں کیا کرتے تھے۔ اور وہ ان تعریفوں کا شکریہ ادا کرتے پھولے نہ سمایا کرتی تھی۔ شاید اسی لیے وہ ہر تقریب، ہر پارٹی میں ضرور شریک ہوا کرتی تھی۔ ہنسا کرتی تھی اور ہنسایا کرتی تھی۔ بہت خوش خلق، بڑی ملنسار اور بڑی محبت کرنے والی تھی۔

انسان خوبیوں اور خامیوں کا مرقع ہے۔ بریگیڈیر صاحب اور رخشندہ آپا بھی انسان تھے۔ ہو سکتا ہے ان میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ خامیاں بھی ہوں لیکن ثمینہ کے بارے میں میں اکثر کہا کرتی تھی۔ "اس لڑکی نے

ماں اور باپ سے صرف خوبیاں ہی لی تھیں۔ان کی ساری صلاحیتیں اپنے اندر جمع کرلی ہیں۔"
میں ثمینہ سے کہا کرتی۔"وہ دنیا کا انتہائی خوش قسمت انسان ہوگا، جو تمھیں لے جائے گا۔کون سی خوبی ہے جو تم میں موجود نہیں۔"وہ میری بات پر بڑے معصومانہ انداز میں مسکرایا کرتی۔

میری بڑی خواہش تھی کہ میری بچیاں بھی ثمینہ کی طرح ہر فن مولا ہوں۔میں اپنے طور پر ان کی تربیت انہی خطوط پر کر رہی تھی۔لیکن کہاں رخشندہ آپا اور کہاں میں۔میں مزاج کی ذرا تیز واقع ہوئی تھی۔ہر کام اس تیزی ہی کی وجہ سے اس طرح نہ ہو پاتا، جس طرح وہ

کیا کرتی تھیں۔

مجھے رخشندہ آپا کا انتظار تھا۔اس لیے کرنل صاحب سے میں ہر روز ہی پوچھا کرتی۔اگلے ماہ مجھے پتہ لگا کہ وہ لوگ یہاں آگئے ہیں۔میں ملنے کو بے تاب تھی۔کرنل صاحب نے جب بتایا تو میں بولی۔

"انہیں سیٹ تو ہو لینے دو۔"

"ہفتہ تو ہو گیا انہیں آئے۔"

"پھر بھی۔"

"نہیں آج ہی چلیں گے۔"

"آج میں نہیں جا سکتا۔گیمز کے لیے جانا ہے، اس کے بعد وہیں کچھ کام بھی کرنے ہیں۔"

"کل؟"

"کل۔۔۔ہاں کل تو میس پارٹی ہے۔شاید وہ لوگ بھی آئے ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔نہ آئے ہوں تو میس سے سیدھا ان کے ہاں چلنا ہوگا۔آپ کو۔"

"ٹھیک ہے۔"

دوسری شام میں تقریب میں جانے کے لیے تیار تھی۔میس میں اکثر پارٹیاں ہوتی رہتی تھی۔یوں کئی ایسے لوگوں سے بھی ملنا ہو جاتا تھا۔جن کے گھروں میں جانا یا انہیں بطور خاص گھر پہ بلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

میں نے بادامی شیفون کی ساڑھی پہنی۔ہلکا سا میک اپ کیا۔بال سنوارتے ہوئے مجھے ثمینہ یاد آگئی۔اتنے منفرد سٹائل وہ خود سے جانے کیسے بنا لیا کرتی تھی۔

میں تیار ہوتے دعائیں کر رہی تھی۔اللہ کرے لطیف بھائی اور رخشندہ آپا بھی پارٹی میں آئے ہوئے ہوں۔
ثمینہ سے ملنے کو تو بہت ہی جی چاہ رہا تھا۔انہیں گھر مدعو کرنے کے بارے

میں بھی سوچ رہی تھی۔

ہم دونوں وقت مقررہ پر میس گئے۔گاڑیوں کی قطاروں سے پتہ چلتا تھا کہ فنکشن خاصا بڑا ہے اور لوگوں کی کافی تعداد پہنچ چکی ہے۔

میں یہاں اس میس میں پہلا فنکشن اٹینڈ کر رہی تھی۔کافی چہرے نئے تھے۔کچھ پرانے لوگ نظر آئے۔مسز اور مسٹر بیگ ملے۔جن کی شادی ہمارے ساتھ ہی ہوئی تھی۔مسز بیگ خاصی فربہ خاتون تھی۔میں نے اسے پہچان تو پہلی نظر میں ہی لیا تھا۔لیکن اتنا موٹا پا ذہن قبول ہی نہیں کر رہا تھا۔ہم بڑے تپاک سے ملے اور حال احوال پوچھا۔

کرنل مختار میرے میاں کے جاننے والے تھے۔وہ اور ان کی بیگم ہم سے پہلی بار ملے۔بہت اچھا کپل تھا۔مجھے محسوس ہو گیا کہ یہ ہمارے مستقبل کے مستقل دوست ہوں گے۔

اور بھی بہت سے لوگوں سے تعارف ہوا۔پھر کرنل صاحب بولے۔میں دیکھوں بریگیڈیر صاحب بھی آئے ہیں یا نہیں۔

"اچھا!" میں اس سمت بڑھ گئی جہاں زیادہ عورتیں تھیں۔ کچھ گروپوں کی صورت میں کھڑی تھیں۔ کچھ صوفوں پر بیٹھی تھیں۔

وہیں ایک کونے میں دو عورتوں کے ساتھ مجھے وہ نظر آئی۔ اسے ملنے کا جتنا شوق اور جتنی خواہش مجھے تھی کہ میں ایک دم اس تک پہنچ کر اس سے لپٹ کیوں نہ گئی۔ میں نے اسے دیکھا۔ ہلکے فیروزی سی رنگ کے کپڑوں میں اس نے ململ کا کھلا پرنٹڈ دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔

بال بالکل سیدھے بندھے تھے۔ چہرہ بھی ویسا شگفتہ نہ تھا۔ وہ ثمینہ ہی تھی لیکن ثمینہ لگی نہیں مجھے۔ اسی لیے لپک کر میں اس تک گئی تھی۔ اس نے بھی اچانک مجھے دیکھا تو تیزی سے میری طرف آئی۔

"اوہ آنٹی آپ۔۔۔" وہ کہتی قدموں کے فاصلے سے ہی بولی۔

ثمینہ۔۔۔" میں نے بازو پھیلا دیئے۔ اور وہ ان بازوؤں میں سما جانے کے انداز میں سمٹ آئی۔ اس نے اپنا سر میرے سینے میں چھپا لینے کی جیسے کوشش کی۔

ثمینہ۔۔۔ اللہ! کتنے سالوں بعد تمھیں دیکھا ہے۔ امی آئی ہیں۔ روبینہ کا کیا حال ہے۔ گڈی کیسی ہے۔ شکر ہے تم لوگ یہاں ہو۔ ہماری پوسٹنگ بھی یہاں ہوئی ہے۔ کچھ سال تو انشااللہ۔۔۔۔" میں بے صبری سے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہے جا رہی تھی۔ ثمینہ کو لپٹاتے بول رہی تھی، ثمینہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں نے رک کر بازو ڈھیلے کیے۔ ثمینہ کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کرتے ہوئے غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور بولی۔ "کس کلاس میں ہو، بی اے تو کر لیا تھا نا۔ پڑھ رہی ہو یا نہیں۔"

"آنٹی۔۔۔۔ میں تو ساری کلاسیں پڑھ کر فیل بھی ہو چکی۔" ثمینہ نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

مجھے محسوس ہوا کہ وہ تازہ دم نہیں ہے بلکہ اس مسافر کی طرح ہے، جو منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی دوری کے احساس سے خوف زدہ ہو کر ستانے بیٹھ گیا ہو۔

اس کی بات میں نے سمجھی نہیں۔۔۔۔ پیار سے اس کے کندھوں کو جھٹکا دے کر کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو ثمینہ۔" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ کو پتہ نہیں۔"

"کیا۔" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"میری تو ڈائیورس بھی ہو گئی ہے۔" اس نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تیری شادی ہو گئی تھی۔" میں نے بے تکے پن سے پوچھا۔ تو وہ دکھی لہجے میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"ظاہر ہے آنٹی۔ شادی ہوئی تو ڈائیورس بھی ہوئی نا۔"

میری آنکھوں میں، دل میں، دماغ میں خوف سے بھر گیا۔ اس کی بات پر یقین نہ کرتے ہوئے میں نے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو۔"

ثمینہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "سچ کہہ رہی ہوں آنٹی۔"

"واقعی۔" مجھ سے کھڑا نہ رہا گیا۔ میں قریبی صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔ ثمینہ کا ہاتھ میں نے مضبوطی سے پکڑ کر اسے بھی اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔

"آپ کو اس ٹریجڈی کا پتہ نہیں۔" وہ ہولے سے بولی۔

مجھ میں شاید اس ٹریجڈی کے سننے کا حوصلہ نہیں تھا، بے یقینی تھی۔ اس لیے میں نے بات بدل کر کہا۔ "امی آئی ہیں۔"

"نہیں۔"

"کیوں۔"

"طبیعت ٹھیک نہیں تھی ان کی۔"

"کیا ہوا؟"

"ہوا تو بہت کچھ ہے آنٹی۔ میری وجہ سے انہوں نے دل کا روگ پال لیا ہے۔"

"تو تم سچ کہہ رہی ہو کہ تمہاری۔"

اس نے گہری سانس کھینچی اور ہنسنے کی ناتمام کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "گھر آیئے گا کسی دن، سن لیجیے گا رام کہانی۔ اب تو لوگ آجا رہے ہیں۔ ہاں آنٹی مونا، جینی کی سنایئے۔ فرید کیسا ہے۔ بڑے بڑے ہو گئے ہوں گے۔ انکل کو نہیں دیکھا۔ آئے تو ہوں گے۔"

میں آنکھیں پھیلائے اسے تکے جا رہی تھی۔ جی تو چاہ رہا تھا اس کے دکھ کے پرت ایک ایک کر کے ابھی کھلواؤں۔ لیکن واقعی لوگ کافی آچکے تھے۔ کھانے کے لیے بلایا جا رہا تھا۔ میں دکھی دل لیے تقریب میں شریک ہو گئی۔

لطیف بھائی بھی ملے۔ وہ بھی پہلے سے نہ تھے۔ کرنل صاحب نے ہولے سے کہا۔

"ثمینہ کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہو چکی ہے۔ ایک سال میں شادی بھی ہوئی اور طلاق بھی ہوئی۔"

میں اپنی آنکھوں میں امڈتے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے دوسرے لوگوں کی طرف مڑ گئی۔

میں اگلے ہی دن بریگیڈیر ہاؤس گئی۔ رخشندہ آپا سے مل کر ثمینہ کے متعلق جاننے کے لیے میں بے تاب تھی۔ اتنی آئیڈیل لڑکی ایسے ہولناک انجام سے دوچار ہو چکی تھی۔ یقین نہ آتا تھا کہ رخشندہ آپا کو دیکھتے ہی یقین آگیا۔ حادثہ بے دردی سے ان کی پوری شخصیت کو مسل گیا تھا۔ ثمینہ کا دکھ ان کے پورے وجود سے چھلک رہا تھا۔

رخشندہ آپا اور ثمینہ نے ساری کہانی مجھے سنائی۔ سناتے ہوئے ان کی آوازیں ڈوب ڈوب گئیں۔ دل بھر بھر آیا۔ میں نے سب کچھ سنا۔ یقین نہ آتا تھا۔ کہ دنیا میں یوں بھی ہو سکتا ہے۔

ڈیڑھ دو برس پہلے ثمینہ بے بی اے کیا ہی تھا کہ دو تین رشتے آگئے۔ ان رشتوں میں ڈاکٹر سہیل کر رشتہ

موزوں ترین نظر آیا۔ وہ ان دونوں کویت میں ملازم تھا اور بہت بڑی تنخواہ پا رہا تھا۔ اس کی ماں اور دو بہنیں سوتیلی تھیں۔ باپ پچھلے سال فوت ہو گیا تھا۔ امیر کبیر لوگ تھے۔ گلبرگ میں چار کنال کی کوٹھی تھی۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ شہر کے اندر اور بھی بہت سی جائیداد تھی۔ جس کا معقول کرایہ آتا تھا۔ سہیل کی امی اور بہنیں پڑھی لکھی تھیں۔ بڑی بہن کا میاں بزنس کرتا تھا۔ چھوٹی کی منگنی ایک انجینئر سے ہوئی تھی۔ آزاد خیال لوگ تھے۔ بلکہ بہت حد تک ماڈرن بھی کہا جا سکتا تھا۔ بچی کا رشتہ طے کرتے وقت جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں، جو جو تحقیقات کی جاتی ہے۔ جس جس طرح رشتہ پرکھا جاتا ہے، وہ لطیف بھائی اور رخشندہ آپا نے کیا۔

"ایک تقدیر ہی نہیں پرکھی تھی۔" رخشندہ آپا نے روہانسی ہو کر کہا تھا۔ ہر لحاظ سے موزوں رشتہ سمجھا تھا۔

منگنی دھوم دھام سی ہو گئی تھی۔ لڑکے والوں نے اپنی امارت کا اتنا مظاہرہ کیا تھا کہ تنخواہ دار فوجی دنگ رہ گئے تھے۔ چٹ پٹ منگنی ہوئی اور لڑکے کے چھٹی آنے پر شادی ہونا قرار پائی۔ دو ماہ بعد لڑکا ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آگیا۔

"لڑکے سے مل کر آپ کو کچھ اندازہ نہ ہوا تھا۔۔۔" میں نے رخشندہ سے پوچھا۔

"معقول لڑکا تھا۔۔۔ صرف اس کی داڑھی پر ثمینہ کو اعتراض ہوا تھا۔" وہ بولیں۔ "لیکن ہم نے اس اعتراض کو نظر انداز کر دیا بلکہ ثمینہ کو سمجھایا کہ شریف لڑکا ہے۔ صحیح مسلمان ہے۔ مذہب سے اس کا لگاؤ زیادہ ہے، اس لیے یہ قابل اعتراض بات نہیں۔"

"وہ جنونی تھا آنٹی۔" ثمینہ نے کہا۔ "جنونی صرف جنونی۔"

"کیا پتہ تھا۔" رخشندہ آپا نے گہری سانس لی۔ "شادی ہوئی تو لگتا تھا ثمینہ جیسی قسمت کسی لڑکی نے آج تک پائی نہیں۔ جب دلہن بنی تھی تو نظر نہ ٹھہرتی تھی اس پر۔۔۔۔ زیور سے پیلی ہو گئی تھی۔ اتنا روپ آیا تھا کہ بتا

نہیں سکتی۔۔۔اپنی بچی کے نصیب پر میں نازاں تھی۔خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی۔"

"نظر ہی لگ گئی۔" میں نے کہا۔

"سہیل کی ایک ہفتہ کی چھٹی تھی۔ شادی کر کے وہ چلا گیا۔ تین چار ماہ بعد ثمینہ کے جانے کا بھی بندوبست ہو گیا اور وہ کویت چلی گئی۔ شادی کے بعد تو تین چار دن ہی سہیل کے ساتھ گزارے تھے۔اس کے متعلق کچھ جان نہ پائی تھی لیکن جب کویت گئی تو سہیل کا پتہ چلا۔ ثمینہ نے جو کچھ اس کے متعلق بتایا۔ میں سن کر حیران رہ گئی۔وہ کویت کیا پہنچی جہنم میں پہنچ گئی۔۔۔دولہناپہ تو چار دن بھی نہ دیکھا۔"

"آنٹی سب سے پہلے تو اس نے مجھ سے کہا نماز پڑھا کرو۔"ثمینہ بولی۔"یہ کوئی غلط بات نہ تھی۔ میں نے ہنس کر کہا ضرور پڑھوں گی۔ میں پانچ وقت باقاعدگی سے نماز پڑھنے لگی۔ پھر وہ مصر ہوا۔ کہ تہجد بھی پڑھا کرو۔ میں نے صاف کہہ دیا۔ بھئی! یہ نہیں ہو سکے گا۔ایک تو مجھے پتہ ہی نہیں، تہجد کیسے پڑھتے ہیں۔دوسرے آدھی رات کو کون اٹھے گا۔اس بات پر آنٹی اس نے پہلی بات مجھے زوردار تھپڑ مارا۔ میں بلبلا اٹھی۔"ثمینہ نے غیر شعوری طور پر ہاتھ گال پر رکھ لیا۔اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر وہ روہانسی آواز میں بولی۔

"میں نے اس کی بات نہیں ٹالی۔اس سے صرف اتنا کہا آپ مجھے گائیڈ کریں۔ سکھادیں۔ تہجد کیسے

پڑھتے ہیں۔ میں پڑھنے لگوں گی۔"

اس بات پر سہیل برافروختہ ہو گیا اور ثمینہ کو زدوکوب کیا کہ ماں کے گھر سے کیا سیکھ کر آئی ہو؟

اب بات بات پر مذہب کی آڑ لے کر وہ ثمینہ کو مارنے پیٹنے لگا۔

ایک دن ثمینہ نے اس کی ڈاڑھی کے بارے میں کچھ کہہ دیا۔وہ تو آپے سے باہر ہو گیا۔اسے بے نقط سنائیں۔ بے ریش باپ کے طعنے دیے۔کافر تک کہا۔اور بہانہ بنا کر مار پیٹ بھی ڈالا۔مار پیٹ تو جیسے اس نے معمول ہی بنالیا تھا۔

ثمینہ کے بال بچپن سے کٹے تھے۔ سہیل نے ایک دن اس کے بال نوچ ڈالے۔ ثمینہ نے رو رو کر کہا۔ کہ آئندہ وہ بال نہیں ترشوائے گی لیکن وہ تو ہمیشہ ترشوانے کی سزا دینا چاہتا تھا۔اس دن اس نے تپتی سلاخ سے ثمینہ کی گردن داغ ڈالی۔

روتے ہوئے ثمینہ نے اپنے دونوں داغ مجھے دکھائے۔

ثمینہ نے اس ماحول اور گھر میں ایڈجسٹ ہونے کی ہر ممکن کوشش کی۔ سہیل نے کہا۔ برقعہ پہنا کرو۔اس نے کبھی چادر بھی نہیں اوڑھی تھی۔ سہیل کے کہنے پر برقعہ پہنا۔ صرف برقعہ ہی نہیں، جب کبھی کبھار وہ اسے گھر سے باہر لے جاتا۔ہاتھوں میں دستانے اور پیروں میں جرابوں سمیت بوٹ پہننے کا حکم دیتا۔ ثمینہ کو ٹھیک طرح سے برقعہ نہ اوڑھنا آتا تھا۔اس بات پر بھی اس نے کئی بار پیٹا تھا۔

شادی کے تیسرے مہینے ہی عید آ گئی۔ ثمینہ نے پورے روزے رکھے تھے۔ عید کے دن اس نے اپنا ایک خوبصورت سا لباس نکالا، جسے دیکھتے ہی سہیل آگ بگولا ہو گیا۔

"یہ شریفوں کا لباس ہے۔"وہ غرایا۔

"کیوں؟"ثمینہ کا دل بھی کباب ہو گیا تھا۔

"کچھ اور پہنو۔"

جلتے بھنتے ثمینہ نے ایک خوبصورت ساڑھی نکالی۔ لیکن بغیر آستین کا بلاؤز تھا۔وہ تذبذب ہی میں تھی۔ کہ سہیل نے بلاوز دیکھ لیا۔

"تمہارے سارے کپڑے اسی طرح کے ہیں۔"وہ بولا۔

"ساڑھیوں کے بلاؤز سب ایسے ہی ہیں۔"

"نکالو ذرا۔۔۔"

ثمینہ نے سارے بلاؤز نکال کر اسے دکھائے۔ سہیل نے انہیں اکھٹا کیا۔ پھر سب کو ماچس دکھادی۔
ثمینہ نے پھر بھی احتجاج نہیں کیا۔
"نہ ہمیں کبھی لکھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔" رخشندہ آپا نے گیلی آنکھیں صاف کیں۔
"لکھتی کیسے! لکھنے دیتا تھا وہ۔" ثمینہ دکھ سے بولی۔ "پھر میں بھی تو نہیں چاہتی تھی۔ اپنے ماں باپ کو دکھ دوں۔"
"یہ سارے ظلم تم اکیلی جان پر جھیلتی رہی۔" میں نے افسردگی سے کہا۔
"اکیلی کہاں آنٹی۔۔۔ میری کوکھ میں میرا بچہ بھی یہ ظلم جھیلتا رہا۔ میرا بیٹا۔۔۔"
"بیٹا بھی ہوا تھا۔"
"ہاں شادی کے پورے دس ماہ بعد وہ پیدا ہوا۔"
"اب کہاں ہے۔"
"مر گیا تھا۔۔۔۔ آنٹی۔" ثمینہ نے اتنے کرب سے کہا کہ میرا دل مسلا گیا۔ "اچھا ہوا کہ مر گیا تھا۔ خدا نے چھین لیا تھا تو مجھے صبر آگیا۔ وہ چھین لیتا تو ساری عمر میں تڑپتی رہتی۔"
تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر ثمینہ کھلی آنکھوں میں جیسے خوابوں کا عکس لیے بولی۔ "آنٹی میرا بچہ بہت خوبصورت تھا، وہ دوماہ میری گود میں رہا۔ اس کے

ہونے سے مجھے اپنی دکھوں بھری زندگی بھی اچھی لگنے لگی تھی۔ میں نے عہد کر لیا تھا۔ کہ اس کے سہارے سہیل کو برداشت کرتی رہوں گی۔ لیکن وہ مر گیا۔" ثمینہ چپ ہو کر ناخن کریدنے لگی۔ رخشندہ آپا کے چہرے کی رنگت اور بھی پھیکی پڑ گئی۔ وہ دکھ سے بولیں۔ "پتہ نہیں۔ اس نے کونسا انتقام لینا تھا۔ کیوں اتنا سخت گیر، اتنا وحشی اور جنونی تھا۔ قصور بتادیا کرتا تو یہ اس کی تلافی کرنے کی کوشش بھی کرتی۔ اس نے جرم

کبھی بتایا ہی نہیں، سزا ہی دی۔ سال بھر میری بچی کو تڑپاتا رہا۔ کیا کیا بتاؤں کیا کیا ستم توڑے اس نے۔"
"چھوڑیں امی۔" ثمینہ نے گہری سانس کھینچی۔۔۔۔ "بات ختم ہو گئی۔ کیا فائدہ کڑھنے سے۔ سال سوا سال ہی میں جان چھوٹ گئی۔۔۔ یہ بھی غنیمت سمجھیں۔۔۔۔ پتہ چل گیا۔ کہ وہ شروع ہی سے اذیت پسند ہے، جنونی ہے۔۔۔ اپنے آپ کو بڑا مذہبی کہتا ہے لیکن ایسے آدمی کو مذہب سے دور کا بھی واسطہ لگتا ہے؟"
"ہماری تقدیر۔" رخشندہ آپا نے دکھ سے کہا۔ "کوئی قصور نہ خطا۔ انسان ایسے ہی لٹ جائے تو ہار کر اسے تقدیر ہی کہہ سکتے ہیں۔ ہم نے تو پڑھا لکھا شریف اور برسرروزگار لڑکا دیکھا تھا۔ اس کے من میں کیا تھا، کیسے جان لیتے۔"
میرا دل ثمینہ کے لیے خون کے آنسو بہا رہا تھا۔۔۔ اتنی اچھی خوش اطوار، خوش اخلاق، ہر فن مولا۔۔۔ آئیڈیل قسم کی لڑکی اس انجام سے دوچار ہوئی تھی۔
میں بوجھل دل لیے گھر آگئی۔۔۔۔ میری دونوں بچیاں اپنے ابو کے ساتھ لان میں بیڈ منٹن کھیل رہی تھیں۔
میں نے دیوانہ وار دوڑ کر دونوں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ اور انہیں سینے سے لگا کر بے اختیار رونے لگی۔
کرنل صاحب حیران و پریشان ہو گئے۔ بچیاں گھبرا گئیں لیکن میں انہیں اسی طرح دبوچے روئے گئی۔

کتنے پیارے ہوتے ہیں یہ جگر کے گوشے۔
لیکن
ان کی تقدیریں
کچھ پتا نہیں ہوتا کیسی ہوں گی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟

خالی گود کا دکھ

پاک لیبارٹری سے وہ اپنی اور کمال کی میڈیکل رپورٹ لے کر باہر آئی۔ لمبا سا سفید لفافہ اس نے ہاتھ میں مضبوطی سے پکڑا تھا۔ اتنی ہی کمزوری اس کے وجود میں اتر رہی تھی۔ اس کا دل بے ترتیبی سے دھڑک رہا تھا اور ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کی نمی آ رہی تھی۔ اس سے قدم بھی مشکل سے اٹھائے جا رہے تھے۔ لیب سے سڑک تک بمشکل سو گز کا فاصلہ تھا۔ لیکن یہ سو گز صدیوں پر محیط لگ رہے تھے۔

رکشا سڑک پر ہی کھڑا کر کے وہ رپورٹ لینے گئی تھی۔ اسے یہیں سے رضا کلینک جانا تھا۔ یہ رپورٹ گائنالوجسٹ مسز شمسہ رضا کو دکھانا تھی۔

شمسہ رضا گائنالوجسٹ تھی۔ زنانہ امراض کی ماہر تھی۔ اس کے ہاتھ میں قدرت نے شفا بخش رکھی تھی۔ کتنی خواتین جو ڈاکٹروں، حکیموں اور دیسی دواؤں سے صحت یاب نہ ہو پائی تھیں۔ اس کے علاج سے گوہر مقصود حاصل کر چکی تھیں۔ سونی اور ویران گودیں آباد ہوئی تھیں۔ ایک عورت کے ہاں تو اس کے علاج سے پورے اکیس سال بعد بچہ ہوا تھا۔ چار چار، چھ چھ سال بانجھ پن کا دکھ اٹھانے والی عورتیں تو بہت آتی تھیں۔ اس کے پاس علاج ہوتا تھا، وہ اولاد کی نعمت سے محروم نہ رہتی تھیں۔

وہ بھی ایسی ہی بانجھ عورتوں میں سے ایک تھی۔

اس کی شادی کو آٹھواں سال جا رہا تھا۔ اس کا دامن امید سے خالی تھا۔ اس کا آنگن

سونا تھا۔ اس کے کان بچوں کی چہکار کو ترس گئے تھے، اس کی گود سونی تھی۔

آٹھ سال پہلے جب وہ بڑے ارمانوں اور چاؤ سے سرخ جوڑا پہن کر سنہری گٹھڑی سی بنی کمال کی پھولوں سے سجی سیج پر بیٹھی تھی تو چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں بکھری محسوس ہوئی تھیں۔ کوئی غم نہ تھا، کوئی دکھ نہ

تھا۔ خوشیوں اور مسرتوں کی ایسی بھرمار اور یلغار تھی کہ اسے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ دل کی دھڑکن آواز چاہتی تھی۔ آج وہ قانونی اور شرعی طور پر کمال کی ہو گئی تھی۔

"کمال۔"

جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا۔ دل کی دھڑکن کی طرح اپنے آپ میں پایا تھا۔ دونوں بچپن کے دوست تھے۔ بچپن گزرا، جوانی آئی تو نگاہوں کی خاموشیوں ہی میں بڑے بڑے مراحل طے ہو گئے۔ کبھی چوری چھپے ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ نامہ و پیام بھجوایا گیا تھا۔ بس اک نگاہیں تھیں، جو بولتی تھیں، سنتی تھیں، سمجھتی تھیں۔

شاید ان نگاہوں کے راز دونوں کے والدین نے بھی پا لیے تھے۔ اعتراض کی کوئی گنجائش نہ نکلتی تھی۔

خاندانی مراسم تھے۔ اس لیے دونوں کو ازدواجی بندھن میں بڑے پیار اور خوشی سے جکڑ دیا۔

دونوں ایک دوسرے کو پا کر اتنے خوش تھے کہ زندگی بہاروں اور جنتی رعنائیوں کی حامل نظر آنے لگی تھی۔

"صفو ہم کتنے خوش قسمت ہیں۔ ہم نے جو چاہا، سو پا لیا۔" کمال سرشار سے لہجے میں کہتا۔

"ہاں کمال۔۔۔" وہ لجا کر کہتی۔

"کوئی دیوار راہ میں حائل نہیں ہوئی۔ کوئی رکاوٹ کھڑی نہیں ہوئی۔ ہم نے ایک دوسرے کو پورے خلوص سے چاہا تھا نا۔ اسی لیے تو تمھارے ماں باپ مزاحم نہیں ہوئے۔ میری ماں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔"

"یہ ہماری خوش بختی کی دلیل ہے۔"

"بالکل۔"

"خدا اس خوش بختی کو ہمیشہ قائم رکھے۔"

"رکھے گا، ضرور رکھے گا۔ صفو! جب تک میرے دم میں دم ہے۔ میں تمہارا ہوں۔ میرے خلوص اور وفا میں زندگی کے کسی موڑ پر تم کمی نہ پاؤ گی۔۔۔ تم بھی وعدہ کرو نا۔"

ہر نئے جوڑے کی طرح وہ بھی عہد وفا باندھتے۔ مستقبل کو حسین وخوشگوار کرنے کے مصمم ارادے کرتے۔ ایک دوسرے کی خوشیوں پر قربان ہو جانے کی قسمیں کھاتے۔

حیات فردوسی نغموں کی گنگناہٹ کا دوسرا نام بن گئی تھی۔

لیکن۔۔۔

دوسرا سال چونکا دینے والا تھا۔ خوشیوں، مسرتوں اور حسین ترین گہما گہمیوں کے باوجود کچھ اکیلے پن کا احساس جاگنے لگا تھا۔ بے نام سی اداسی روح میں اترنے لگی تھی۔ زندگی کا آنگن خوشیوں کے پھولوں سے پٹا پڑا تھا۔ لیکن یہ سب پھول تصنع کا لبادہ اوڑھے لگتے تھے، یہ بے مہک سے پھول پریشان کرنے لگے تھے۔

صفو کچھ زیادہ ہی پریشان رہنے لگی تھی۔ اس کے ساتھ ہی خاندان میں دو شادیاں اور ہوئی تھیں۔ ایک کا تو بیٹا دو ماہ کا ہو گیا تھا۔ دوسری اگلے مہینے بچے کو جنم دینے والی تھی۔ اس دن تو صفو کی پریشانی اتنی بڑھی کہ اپنے بستر پر اوندھی پڑ کر وہ بے اختیار ہو کر رونے لگی۔ اس نے اپنی ساس کو کسی ملنے والی سے کہتے سنا تھا۔

"میرا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ سال گزر گیا۔ ابھی تک کوئی امید نظر نہیں آئی۔ کوئی پوتا پوتی ہو جاتا تو زندگی پر سکون ہو جاتی۔"

وقت گزرتا جا رہا تھا۔

ہر مہینے وہ آس کے پھول چنتی۔ لیکن مایوس ہو جاتی۔ اب تو اس کی گود ہری نہ

ہونے کے چرچے ہونے لگے تھے۔ ساس اسے ڈاکٹروں کے پاس لیے پھری۔ ٹونے ٹوٹکے، دم درود، تعویز گنڈے ہر چیز آزما دیکھی۔ لیکن دامن امید پھر بھی گوہر مقصود سے نہ بھرا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ ننھے منے بچے

تو اس کی کمزوری تھی۔ یہ خواب تو اس کی آنکھوں میں برسوں سے سجا تھا۔

دوسرا سال بھی گزر گیا۔

کمال اسے حوصلہ دلاتا۔۔ تسلیاں دیتا۔

"خدا کو جب منظور ہو گا، بچے ہو جائیں گے۔ تم کیوں اتنی پریشان رہتی ہو۔ مرجھایا ہوا پھول لگتی ہو۔"

"کمال۔۔۔۔" وہ بے اختیار ہو کر رو دیتی۔

"خدا پر بھروسہ رکھو۔۔۔ اس کو منظور ہو گا تو بچے ہو جائیں گے۔ نہیں ہو گا تو نہ سہی۔"

"پھر ہم دونوں ہی تو نہیں۔۔۔ دنیا میں ہزاروں ایسے جوڑے ہوتے ہیں، جن کے اولاد نہیں ہوتی۔"

"ایسا نہ کہیں کمال، ایسا نہ کہیں۔۔۔" وہ روتے جاتی۔

"مجھے بچوں کا ارمان ہے۔۔۔ تمہاری اماں کو ان کی ضرورت ہے۔ وہ۔۔۔ وہ ہر صورت۔۔۔۔۔ میں بچہ۔۔۔۔۔۔"

"تم اس بات کو جان کا روگ نہ بنالو۔۔۔ ہر وہم دل سے نکال دو۔ اماں کی بات ادھر سنا کرو اور ادھر سے کانوں سے نکال دیا کرو۔۔۔ مجھ پر اعتماد کرو۔۔۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا۔۔۔ بچے نہ بھی ہوں گے تو کوئی بات نہیں۔"

"لیکن تمہاری اماں تو۔۔۔" وہ گھگھیا جاتی۔۔۔ اس نے ادھر ادھر سے اڑتی خبریں سن لی تھیں۔ اس کی ساس مایوسی کے عالم میں کہتی پھرتی تھی کہ "بچے نہ ہوئے تو وہ کمال

بچہ لے لیتے ہیں۔۔۔"

"نہیں۔" کمال نے آہنی سختی سے کہا۔

"کیوں۔" وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس نے رخ دوسری طرف موڑتے ہوئے کہا۔

"میں کرائے کے بچوں کا قائل نہیں۔"

"کیا۔" وہ اس کے سامنے آگئی۔

"بچہ اپنے گوشت پوست کا ہونا چاہئے۔" کمال نے اسی سختی سے کہا۔

"لیکن۔۔۔ایسا ہو نہیں سکتا۔۔۔اتنے سال گزر چکے ہیں۔"

"تب۔" کمال نے کمال بے رحمی سے کہا۔

"تم چاہو تو ہو بھی سکتا ہے۔"

"کیسے ؟" وہ کچھ نہ سمجھی۔

"جیسے اماں چاہتی ہیں۔۔۔" کمال نے کہا۔

صفو کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں۔اس کا رنگ فق ہو گیا، جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی۔۔۔

"تو۔۔۔تو۔۔۔تو۔۔۔۔۔۔۔" وہ کچھ کہہ نہ سکی۔

کمال نے بچی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔

"سوچ لو۔۔۔بچوں کی خواہش تمہیں بھی ہے۔مجھے بھی اور اماں کو بھی۔۔۔گھر کا آنگن سونا اور ویران ہے۔۔۔میرے بچے بھی تو تمہارے بچے ہی ہوں گے نا۔۔۔"

"کمال۔۔۔۔" اس کے لرزتے ہونٹوں سے اتنا نکلا۔

کمال بچی کو اٹھا کر باہر نکل گیا۔

اور وہ۔۔۔

دھم سے بستر پر گر گئی۔۔۔اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔اس کی آنکھوں سے ایک قطرہ پانی بھی نہیں ٹپک رہا تھا۔۔۔ہولے ہولے کانپتے ہوئے وہ جیسے کمال کی بات کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کمال سے اسے یہ امید تو نہ تھی۔وہ تو اب تک اس کے دلاسوں، اعتماد اور تسلیوں کے سہارے دن گزراتی چلی آئی تھی۔۔۔اماں کی لگی لپٹی باتوں سے دل دکھتا تو چند آنسو بہا کر وہ اپنا دھیان کمال کی باتوں کی طرف لگا لیا کرتی تھی۔۔۔

اب کمال نے یہ بات کہہ دی تھی۔دوسری کا احساس دلایا تھا۔بچوں کی خواہش اتنی شدت اختیار کر گئی تھی کہ وہ ساری قسمیں، سارے وعدے، ساری پیار کی باتیں بھلا بیٹھا تھا۔۔۔

وہ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔دوسری عورت گھر میں لانا چاہتا تھا۔۔۔اس کے پیار میں حصہ دار بنانا چاہتا تھا۔اس کی زندگی میں شریک کرنا چاہتا تھا۔

نہیں

نہیں

نہیں

اس نے تکیے پر سر پٹخ کر زور زور سے مکے مارتے ہوئے تکیے کو جیسے توڑ کر رکھ دیا۔

پھر

وہ بے اختیارانہ انداز میں سر اٹھا اٹھا کر تکیے پر پٹختی رہی۔

کتنی دیر وہ ایسی مجنونانہ حرکتیں کرتی رہی۔۔۔اس کا خیال تھا کہ اتنی بے رحم بات کر کے کمال کمرے سے نکل گیا ہے۔ ضرور اسے پچھتاوا آئے گا۔ وہ دوڑا چلا آئے گا۔ اپنی بات

کی معافی مانگے گا اور پھر سنہری روپہلی تسلیوں سے اس کا خالی دامن بھر دے گا۔

لیکن کتنے ہی طویل پل گزر گئے۔

وہ نہیں آیا۔۔۔

بلکہ اس دن تو وہ رات ڈھلے گھر واپس آیا۔ چند دوست اسے فلم پر گھسیٹ لیے گئے تھے اور وہ آخری شو دیکھنے ان کے ساتھ چلا گیا تھا۔۔۔

صفو کو سخت ذہنی دھچکا لگا تھا۔

لیکن کمال نے معذرت نہیں کی تھی۔ بلکہ اب تو وہ اکثر اسے قائل کرنے کی باتیں کرنے لگا تھا۔

ادھر اماں پھر سے اس کی دلہن تلاش کرنے کی مہم سر کرنے لگی تھیں۔ کئی لڑکیاں دیکھ چکی تھیں۔ سعدیہ تو انہیں پسند بھی آ گئی تھی۔۔۔

غریب گھرانے کی یہ قبول صورت لڑکی ہر لحاظ سے انہیں اچھی لگی تھی۔ اس کے ماں باپ بھی آمادہ ہو گئے تھے۔۔۔

ایک دو دفعہ دبی زبان سے ضرور کہا تھا کہ "پہلی بیوی کو طلاق دے دے تو ٹھیک ہے۔"

لیکن

اماں نے دو ٹوک فیصلہ سنا دیا تھا۔ "طلاق نہیں دے سکتے، خاندانی مراسم ہیں۔ لیکن راج تو آپ کی بیٹی کرے

گی۔

ادھر کمال صفو کو ذہنی طور پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دن صفو نے رو رو کر آنکھیں

سرخ کر لیں۔ تو اسے چمکارتے ہوئے بولا۔

"تم فکر مند کیوں ہوتی ہو صفو! تمہاری حیثیت یہی رہے گی۔ ہمیں تو صرف بچوں کی ضرورت ہے نا۔۔ ہماری زندگی روکھی پھیکی گزر رہی ہے۔۔۔ بچوں سے بہار آ جائے گی۔۔۔۔۔ کیا تم بچوں کی دیوانی نہیں ہو۔"

صفو کیا کہتی۔۔۔ آنسو ہی بہا سکتی تھی۔۔۔۔۔ کیسے اپنے مقدر پر سیاہی پھیر دیتی۔ اپنے ہاتھوں اسے ایسا کرنے کے لیے تو بہت بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے نا۔۔

اماں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔

ساتواں سال بھی گزر گیا۔۔۔ تو وہ کمال کے گرد ہو گئیں۔ "بیوی کی ناز برداریاں ہی کرتے رہو گے۔ وہ خود تھوڑا ہی کہہ دے گی، کر لو شادی۔۔۔ مرد بن کر دکھاؤ، سات سال گزر چکے ہیں۔۔۔ اب بھی کوئی امید باقی ہے۔۔۔۔"

"بس اماں صفو کو ذہنی طور پر آمادہ کر رہا ہوں۔ وہ حامی بھر لے تو شادی کر لوں گا۔"

"اور نہ بھرے تو۔۔۔"

وہ چپ ہو گیا۔

اماں نے بے نقط سنا ڈالیں۔۔۔ جھاڑ جھپٹ کا اثر اس پر ہو ہی گیا۔ اب وہ صفو سے بھی اسی لہجے میں بات کرنے لگا، جس پر اماں کرتی تھی۔

صفو تو گم صم رہنے لگی تھی۔۔۔ اس دن کمال اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اور وہ صرف ہوں ہاں کیے جا رہی تھی۔۔۔ موضوع بچہ ہی تھا۔

صفو نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ تو وہ بھڑک اٹھا۔۔۔۔۔ "تمھیں احساس ہونا چاہیے صفو۔۔۔ آٹھواں سال جا رہا ہے شادی کو۔۔۔ اب تو خالی خولی زندگی ہولناک ہو گئی ہے۔ میں بچوں کے لیے ترس رہا ہوں۔ میں ان کی چہکار سننا چاہتا ہوں۔ میرے بازو ننھے منے بچے

کو دبوچنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ تم میری راہ کی رکاوٹ بنی ہوئی ہو۔ یہ خود غرضی ہے۔۔۔ زیادتی ہے۔۔۔ شاید تمھیں یہ مان ہے کہ جب تک تم نہ کہو گی میں شادی نہیں کروں گا۔"

وہ بت بنے اسے تکے گئی۔

"اب مزید انتظار نہیں کیا جا سکتا۔ سمجھیں۔۔۔۔" وہ صوفے سے اٹھا۔ سگریٹ سلگایا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

"بولتی کیوں نہیں ہو۔" کمال نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے جھک کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"جب تم اپنی کرنی پہ آئے ہو، تو پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ کیوں آزار دیتے ہو۔۔۔ کیوں۔۔۔۔۔۔۔۔ کیوں؟" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ گرا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

کمال چند لمحے اسے تکتا رہا۔۔۔ پھر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ اسے صفو کے رونے پر دکھ ہونے کی بجائے غصہ آ رہا تھا۔

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ صحن میں اماں تخت پر بیٹھی تھی۔ وہ ان کے پاس بھی نہیں رکا۔۔۔ سکوٹر پکڑا اور باہر چلا گیا۔

صفو بلک کر روتی رہی۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔۔۔ سہانے سپنے اس نے اس لیے تو آنکھوں

میں نہیں سجائے تھے۔۔۔ کہ یوں ٹوٹ پھوٹ جائیں۔۔۔ بکھر جائیں۔۔۔ کرچی کرچی ہو جائیں۔

وہ اس دن اپنے بیڈ پر ہی پڑی رہی۔ کبھی سوچنے لگتی۔ کبھی نصیبوں کو رونے لگتی۔۔۔۔۔۔ کمال سے تو اسے امید نہ تھی۔۔۔۔۔ کتنا سنگ دل اور کٹھور ہو گیا تھا۔۔۔ اس نے تو رویے کے ساتھ آنکھیں بھی پھیر لی تھیں۔۔۔ نئی شادی کے ارمان دل میں لیے پھرتا تھا۔

وہ سوگوار سی پڑی تھی کہ نزہت بھابھی ملنے آ گئیں۔۔۔ حالات کے رخ کا اسے

تہ بھی تھا۔۔۔ لیکن صورت حال ایسی ہو گی، اسے اندازہ نہ تھا۔

"کیا ہوا صفو۔۔۔ کوئی نئی بات ہوئی ہے۔۔۔" اس نے اجڑی اجڑی، لٹی لٹی صفو کو گلے سے لگا کر پوچھا۔۔۔ تو صفو کے صبر کے بند ٹوٹ گئے۔ رو رو کر بے حال ہو گئی۔ نزہت بھابھی اس کا دکھ محسوس کر کے دکھی ہو گئی۔

"بھابھی! میں کیا کروں۔۔۔ اب تو نہ کمال صبر کر سکتے ہیں، نہ اماں۔ دوسری شادی۔۔"

"ہائے ہائے۔" بھابھی نے ہمدردی سے کہا۔

"ہاں بھابھی۔۔۔ اماں نے لڑکی بھی تلاش کر لی ہے۔ کمال بھی تیار ہیں۔ صرف میری ہاں کے انتظار میں ہیں۔"

"کتنا ظلم ہے۔"

"یہ ظلم نہیں کہ میرے بیٹے کا گھر سونا ہے۔" بھابھی کے پیچھے ساس بھی اندر آ گئی تھی۔ وہ جلدی سے بولی تو نزہت نے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"ہم کوئی اسے گھر سے نکال تو نہیں دیں گے۔" ساس نے نزہت سے کہا۔ پھر لہجے میں شفقت بھرتے ہوئے بولی۔ "بیٹی اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ اتنے سال انتظار کیا، اب تو حق ہے کہ کمال دوسری شادی کر لے۔

بچوں کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔۔۔"

وہ بہت کچھ کہتی رہی۔۔۔ نزہت کے سامنے اس کا رویہ بڑا نادم اور دل گداز تھا۔۔ اس کی ساری باتیں معقول تھیں۔ پھر بھی نزہت بولی۔ "اماں جی!۔۔۔ یہاں ایک گائنالوجسٹ ہے، ڈاکٹر شمسہ۔ اجازت دیں تو صفو کو اس کے پاس لے جاؤں۔ میں آج اسی لیے آئی ہوں۔"

"کوئی فائدہ نہیں بھابھی۔" صفو نے بھیگی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

نزہت نے منت سماجت کی۔ نرمی سے سمجھایا۔ صرف ایک بار ڈاکٹر شمسہ کو دکھانے کی خواہش کی۔

"ایک بار اسے بھی دکھا لیتے ہیں۔۔۔ اس نے بھی مایوسی ظاہر کی تو پھر۔۔۔ آپ۔۔۔۔"

آپ بے شک۔۔۔۔" وہ چپ ہو گئی۔ دوسری شادی کا ذکر کرتے ہوئے اسے کوفت ہو رہی تھی۔

صفو کے من میں بھی آس ایک بار پھر جاگ اٹھی۔ اس نے ملتجی نظروں سے ساس کی طرف دیکھا۔ ازدواجی زندگی کا عمل لرزہ براندام تو تھا ہی۔ اسے چند دن اور سہارا دیا جا سکتا تھا۔ آخری کوشش کرنے میں ہرج ہی کیا تھا۔ ہونا تو آپ نہ ہونے سے رہا۔ وہ جانتی تھی۔ ماں بیٹا ایک ڈگر پر چل رہے ہیں، جلد یا بدیر اسے خوفناک تجربے سے دوچار ہونا ہی ہے۔ پھر بھی نزہت بھابھی کی باتوں سے آس کے دیپ ایک بار پھر لو دینے لگے تھے۔ آندھیوں میں چراغ جلانے والی بات تو تھی۔۔۔۔ پھر بھی۔۔

اس نے ساس سے وعدہ کیا کہ اگر ڈاکٹر شمسہ نے بھی مایوسی ظاہر کی تو وہ بخوشی کمال کو دوسری شادی کی اجازت دے دے گی۔

کمال نے بھی اس سے یہی بات کہی۔

نزہت اسے رضا کلینک لے آئی۔ مسز شمسہ رضا کے متعلق اس نے بہت کچھ سنا تھا۔ جان پہچان بھی تھی۔ اس نے بڑے دکھ سے صفو کی روئیداد ڈاکٹر کو سناتے ہوئے کہا۔ "پلیز ڈاکٹر! اپنی پوری کوشش سے اسے کا علاج

کیجیے گا۔"

ڈاکٹر نے صفو پر نگاہ ڈالی۔ اسے افسوس بھی ہوا۔ محرومی کسی بات کی بھی ہو، دکھ دیتی ہے۔ وہ بڑی شفقت سے بولی۔ "بی بی علاج کرنا ہمارا کام ہے۔ شفا دینے والا خدا ہے، مایوس نہ ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ علاج سے ٹھیک ٹھاک ہو جائیں۔"

صفو کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔

ڈاکٹر اس سے ضروری ضروری باتیں پوچھنے لگی، جن کا جواب اس نے پوری تفصیل سے دیا۔

"ہوں۔" ڈاکٹر نے کاغذ پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔ پھر سکرین کے پیچھے پڑی بڑی ٹیبل کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "ادھر لیٹئے، میں آپ کو دیکھتی ہوں۔"

ڈاکٹر نے اس کا معائنہ کیا اور پھر اپنی کرسی پر آ بیٹھی۔

ڈاکٹر نے صفیہ کی طرف دیکھا، پھر آہستگی سے بولی۔ "آپ نے پہلے بھی کافی علاج کرایا ہو گا۔"

"ہوں۔" ڈاکٹر قلم اٹھا کر کاغذ پر کچھ لکھنے لگی۔ نزہت جلدی سے بولی۔ "یہ۔۔۔۔ یہ قابل علاج ہے نا۔۔۔"

ڈاکٹر نے سر اٹھایا۔ مسکرائی اور بولی۔ "ہاں۔"

نزہت نے اطمینان کا سانس لیا۔ صفو کی حالت دیدنی تھی۔

لکھنے کے بعد ڈاکٹر بولی۔ "یہ ٹیسٹ میں نے لکھ دیے ہیں۔ آپ میاں بیوی دونوں یہ ٹیسٹ کروا لیں۔ رپورٹ ملنے پر ہی علاج تجویز ہو گا۔"

نزہت پوری تفصیل جاننا چاہتی تھی۔ وہ ڈاکٹر پر الٹے سیدھے سوالوں کی بھرمار کرنے لگی۔ ڈاکٹر کو اور مریضوں کو بھی دیکھنا تھا۔ اس لیے بولی۔ "بی بی! آپ ان ٹیسٹوں کی رپورٹ لے آئیں۔ پھر علاج شروع کیا جائے گا۔ مایوس ہونے کی بات نہیں۔ اللہ کو منظور ہوا تو ان کی گود ہری ہو جائے گی۔۔۔۔ رپورٹ ملنے پر ہی

کچھ کہا جاسکے گا۔"

"شکریہ ڈاکٹر۔" نزہت نے پیار سے صفو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

راستے میں بھی وہ صفو کو تسلیاں دیتی رہی۔

لیکن ٹیسٹ کا مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ کمال نے سنا تو جیسے آتش زیر پا ہو گیا۔ "مجھے کیا ہے، اچھا بھلا تندرست آدمی ہوں۔"

اماں بھی بے یقینی سے بولیں۔ "ڈاکٹر نے ٹال دیا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ کوئی علاج کارگر نہیں ہوگا۔"

لیکن صفو نے منت سماجت کی۔ عاجزی وانکساری سے کہا۔ روئی دھوئی۔ آخری بار یہ کوشش کرنا تھی۔

بہ مشکل کمال رضامند ہوا تھا۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔

آج۔۔۔

آج وہ کلینک رپورٹ دکھانے جارہی تھی۔ لفافہ اس کے ہاتھ میں جتنی مضبوطی سے پکڑا تھا۔ اتنی ہی کمزوری اس کے اندر اتر رہی تھی۔

وہ رکشے میں دھم سے آبیٹھی۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا اور لفافہ بند مہر تقدیر کی طرح اس کے ہاتھ میں تھا۔

اس کے کانوں میں اپنے ہی الفاظ گونج رہے تھے۔ "کمال یہ آخری کوشش ہے، ڈاکٹر نے مایوسی ظاہر کی تو پھر بیشک تم دوسری شادی کر لینا۔ بے شک۔۔۔"

اس گونج سے اس کا دل بیٹھتا جارہا تھا۔

کلینک پر وہ رکشے سے اتری۔۔۔ پیسے دیئے اور اندر آگئی۔

تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکٹر کے سامنے کرسی میں مٹی کے ڈھیر کی طرح پڑی تھی۔

"آگئی رپورٹ۔" ڈاکٹر نے میز پر سے لفافہ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ جو صفو نے رکھ دیا تھا۔ صفو کا دل زور سے

اچھلا۔

ڈاکٹر نے لفافہ کھولا اور میڈیکل رپورٹ دیکھنے لگی۔ صفو اذیت کے جن لمحوں سے دوچار تھی، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔

ڈاکٹر نے رپورٹ پڑھ کر کاغذ میز پر ڈال دیا۔ صفو کی طرف دیکھا اور ہولے سے بولی، مجھے پہلے ہی خدشہ تھا۔

"جی۔" صفو بے تابی سے آگے جھک کر بولی۔

"بی بی!۔۔۔۔ آپ بالکل ٹھیک ہیں۔۔۔۔" ڈاکٹر نے کہا تو صفو کا دل اتنی تیزی سے پھڑپھڑایا کہ پریشان ہو کر اس نے ہاتھ دل پر رکھ لیا۔

"لیکن۔۔۔۔" ڈاکٹر کا گھمبیر لہجہ پریشان کن تھا۔

"جی۔۔۔۔ کیا۔" صفو نے پھر دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"مجھے افسوس ہے۔۔۔ آپ کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔۔۔" ڈاکٹر نے کہا تو صفو کو جانے کیا ہوا۔ ایک دم چیخ اٹھی۔ "کیوں۔۔۔ کیوں نہیں بن سکتی۔ آپ نے کہا ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ہاں بی بی!" وہ اس کے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے اسی انداز میں بولی۔ "آپ تو ٹھیک ہیں لیکن آپ کے شوہر۔۔۔۔ وہ کبھی باپ نہیں بن سکیں گے۔"

صفو بے جان سی، بے دم سی ہو کر کرسی میں گر گئی۔۔۔ ڈاکٹر اسے ماہرانہ انداز میں تسلیاں دیتے ہوئے سمجھانے لگی۔ رپورٹیں صاف بتارہی تھیں۔ چھپائی جانے والی بات تھوڑا ہی تھی۔ کافی باتیں کرنے کے بعد اس نے کہا۔

"افسوس تو بہت ہے کہ آپ کی آس ٹوٹ گئی۔ لیکن آپ کی پریشانی تو ختم ہو جائے گی۔ آپ کے شوہر اب دوسری شادی نہیں کریں گے۔"

صفو گھر آئی توماں بیٹا جیسے اس کے ہی انتظار میں بیٹھے تھے۔ صفو نے رپورٹ کا لفافہ کمال کی طرف اچھال دیا۔

"کیا ہے رپورٹ۔" وہ بیتابی سے بولا۔

"پڑھ لو۔" صفو نے کہا اور اک زوردار قہقہہ لگایا۔۔۔ پھر وہ قہقہے پر قہقہہ لگاتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔۔۔ ماں بیٹے پر کیا بیتی، اس نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔

ہاں!

جب اس کے قہقہے تھم گئے تو وہ اپنی خالی گود کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے دیپ ہمیشہ کے لیے بجھ گئے تھے۔

زہریلا سچ

اس نے جوگیا پھولوں والا آبنوسی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔ دوپٹا بیڈ پر پڑا تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھی۔ بال شانوں پر لہرا رہے تھے۔ بازو کرسی کے ہتھے پر ٹکے تھے۔ اور ہاتھ گود میں ایک دوسرے میں الجھے ہوئے تھے۔ ٹانگ پر ٹانگ تھی اور نرم نرم پاؤں چپل کی بندش میں تھے۔ پاؤں سانولے سلونے تھے، ناخنوں پر نیل پالش لگی تھی۔

وہ گردو پیش سے بے نیاز سی بیٹھی تھی۔ جانے خلا میں کس نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے تھی۔ بظاہر وہ بالکل نارمل لگ رہی تھی۔ لیکن نگاہوں کا جمود اور پتھریلا پن اس کے نارمل نہ ہونے کا ثبوت تھا۔

پھر بھی

مجھ سے رہا نہ گیا

اور

میں والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھنے کو دروازے سے اندر آئی۔ میرا ارادہ شاید رافیہ نے بھانپ لیا۔ اسی لیے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ کر آہستگی سے بولی۔ "نہیں اندر نہیں جانا۔"

"کیوں؟"

"وہ اس وقت قدرے پرسکون ہے۔"

"میں۔۔۔ میں اسے پیار کرنا چاہتی ہوں۔"

"ابھی نہیں۔۔۔ تم اس کو اپنی طرف متوجہ کرو گی تو وہ پریشان ہو جائے گی۔۔۔ وہ یقیناً تمہیں پہچان نہ پائے گی۔۔۔ اور۔۔۔ پھر۔ وہ ایک ہی سوال تم سے کرتی جائے گی۔"

"سوال؟"

"ہاں۔۔۔ وہ صرف یہی پوچھے جائے گی۔۔۔ میں کون ہوں، میں کون ہوں۔ اور پھر اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔" رافیہ کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ بے آواز سسکیاں اس کے لبوں پر مرتعش ہو گئیں۔

میں نے اندر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مڑتے ہوئے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دلاسہ دینے کو بولی۔

"صبر سے کام لو۔ اللہ تعالی بہتر کریگا۔ ہنی ٹھیک ہو جائے گی۔۔۔ ٹھیک ہو جائے گی انشااللہ۔"

رافیہ نے دوپٹے کے کونے سے آنکھوں کے گیلے کنارے پونچھے۔ ایک ٹھنڈی گہری سانس کھینچی اور دکھی انداز میں بولی۔ "اذیت و کرب کے جن مرحلوں سے اسے گزرنا پڑا ہے، اس کا مداوا کیسے ہو گا۔ ٹھیک ہو بھی گئی تو کیا ہو گا۔"

"خدا کرے گا۔ کچھ بہتری کی صورت نکل ہی آئے گی۔"

اس نے دروازہ بند کر کے لاک لگا دیا۔ میں اس کے ساتھ چلتی کوریڈور سے نکل کر لاؤنج میں آ گئی۔ رافیہ بے حد دکھی ہو رہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں میں سمٹ نہیں پا رہے تھے۔ وہ بار بار اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔

کھل کر رونے سے اس کا جی ہلکا ہو سکتا تھا۔اسی لیے میں نے اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر سینے سے لگا لیا۔
"تمہارے دکھ کا مجھے احساس ہے رافیہ۔لیکن کیا کیا جائے۔"
میں اسے تسلی دینا چاہتی تھی کہ وہ مجھ سے ایک لمبے عرصے کے بعد ملی ہے اور اس پر جو دکھ کی گھٹائیں ٹوٹی ہیں۔ان کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی دکھ سکھ کی ساتھی کے سامنے

وہ آنسوؤں کی برسات لگا دے۔اسی طرح سے اس کا من کچھ ہلکا ہو سکتا تھا۔
وہ مجھ سے لپٹ گئی اور میری توقع کے مطابق پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔وہ اتنا روئی کہ اس کی ہچکیاں تھمنے ہی میں نہ آ رہی تھیں۔آنسو میری آنکھوں سے بھی رواں تھے۔پھر بھی میں۔۔۔بھرائے بھرائے لہجے میں اسے چپ کرانے کو کچھ نہ کچھ کہہ رہی تھی۔
دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو وہ مجھ سے الگ ہوتے ہوئے اپنی بھیگی آنکھیں آنچل سے پونچھتے ہوئے بولی۔"بیٹھو صبا۔۔۔میں نے تمھیں پریشان ہی کر دیا۔۔۔"
میں صوفے پر بیٹھ گئی۔وہ بھی میرے برابر آ بیٹھی۔
ہنی کو دیکھنے جانے سے پہلے بھی ہم دونوں یہیں بیٹھی تھیں۔میں تقریباً چھ سال بعد پاکستان آئی تھی۔اور ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی رافیہ سے ملنے آئی تھی۔میرا سسرال اور میکہ لاہور میں تھا لیکن میں کبھی بھی رافیہ سے ملے بغیر واپس نہیں جاتی تھی۔تیسرے چوتھے سال وطن کا چکر لگا کرتا تھا۔مہینے دو کی چھٹی ہوتی تھی۔مصروفیات کے باوجود میں رافیہ سے ملنے کا وقت ضرور نکال لیتی تھی۔کبھی رافیہ مجھے ملنے آ جاتی لیکن اکثر ہی اس کے ہاں میں پنڈی چلی جاتی۔
ہم دونوں بچپن کی دوست تھیں۔ساتھ کھیلے،ساتھ پڑھے۔بی اے کے بعد میری شادی ہو گئی اور رافیہ کے ایم اے میں داخلہ لے لیا۔لیکن ایم اے پریویس میں ہی تھی کہ اس کی شادی بھی ہو گئی۔شادی کے بعد پنڈی

آ گئی کہ اس کے سسرال یہیں تھے۔اور اس کے میاں کا بزنس بھی یہیں تھا۔رافیہ کے سسرال والے امیر کبیر تھے۔بہت بڑی جائیداد تھی۔ہن کی دیوی ان پر بہت مہربان تھی۔رافیہ کی شادی ہوتے ہی اس کے شوہر سہیل کو بزنس میں لاکھوں کا فائدہ ہوا۔رافیہ کا قدم مبارک سمجھا گیا۔سہیل تو خیر اسے بے حد چاہتے تھے۔سسرال والے بھی اس سے خوش ہوئے۔اسے لکشمی کہا جانے لگا۔

وہ واقعی لکشمی ثابت ہو رہی تھی۔سہیل کے کاروبار میں برق رفتاری سے اضافہ ہونے لگا تھا۔مٹی میں ہاتھ ڈالتے تو سونا ہونے والی بات تھی۔دنوں میں وہ لوگ مالی اعتبار سے پہلے سے کہیں مستحکم ہو گئے۔پیسے کی ریل پیل تھی۔رافیہ کی ناز برداریاں ہوتی تھیں۔ساس نندیں صدقے واری جاتیں۔سہیل تو اس کا دیوانہ تھا۔
یوں رافیہ کی ازدواجی زندگی کا آغاز بڑا بھرپور اور سہانا ہوا۔۔۔وہ جب بھی لاہور آتی،مجھ سے ملتی تو اپنی خوش بختی پر نازاں ہوتی۔
"سہیل تو مجھ پر جان دیتے ہیں۔"
"ماں جی،رابعہ اور صبیحہ بہت اچھی ہیں۔کسی کام کو ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔بس چاہتی ہیں کہ میں سجی بنی بیٹھی رہوں۔"
"کسی فرمائش کے بغیر ہی سہیل اتنا کچھ لا دیتے ہیں کہ کیا بتاؤں۔۔۔"
وہ واقعی جب بھی آتی نئے لباس اور زیورات کی بھرمار ہوتی۔۔۔وہ واقعی بڑی خوش بخت تھی۔دولت کے ساتھ ساتھ پیار کی دولت سے بھی مالا مال تھی۔
لیکن
ہر انسان کیلئے خوشیوں کا بھی شاید ایک خاص کوٹہ مقرر ہوتا ہے۔اس سے زیادہ اسے نہیں ملتا۔یہ کوٹہ وہ پورے کا پورا سمیٹ لے،ایک ہی بار دامن بھر لے تو باقی کچھ نہیں بچتا۔رافیہ کے معاملے میں یہ بات صادق

آتی تھی۔اس نے اتنی خوشیاں ایک دم ہی پالی تھیں کہ لگتا تھا اپنا حصہ تقدیر سے وصول کر بیٹھی ہے۔

کیونکہ

شادی کے دوسرے سال ہی وہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اب تک اس نے جو کچھ پایا ہے۔وہ تو ان خوشیوں کا عشر عشیر بھی نہیں، جو اسے ملنا چاہئے تھیں۔میرا دوسرا بچہ ہونے والا تھا اور اس کی جھولی ابھی تک خالی تھی۔

دوسرا اور پھر تیسرا سال بھی گزر گیا۔رافیہ کا

دامن امید گل ہائے رنگین سے خالی رہا۔اب تو گھر والوں کو بھی فکر لگی۔علاج معالجہ شروع ہوا۔۔۔ تعویذ گنڈے، دم دلاسے، سب کچھ ہوا لیکن امید بر نہ آئی۔رافیہ جو اپنی خوش بختی پر نازاں ہوا کرتی تھی۔وہ وقت کے ساتھ ساتھ اپنے اندر ممتا کے جذبوں کا پھیلاؤ شدت سے محسوس کرنے لگی تھی۔اسے لگتا تھا، دنیا کی سب سے بڑی نعمت اولاد ہے اور وہ عورت خوش قسمت ترین ہے جس کی آغوش میں نرمی و گرمی ہے۔وہ مجھے اکثر کہتی۔"تم کتنی خوش نصیب ہو۔ایک نہیں دو تین بچے ہو گئے ہیں۔کتنی بھرپور زندگی ہے تمہاری۔تم بلاشبہ خوش بخت ہو۔"

میں اسے تسلی دیتی۔"فکر نہ کرو۔تمہارے بھی بچے ہو جائیں گے۔اکتا جاؤ گی ذمے داریوں سے۔"

"نہیں صبا۔قدرت یہ لازوال نعمت جسے دیتی ہے، وہ اکتاتا نہیں۔شکر گزار ہوتا ہے۔" وہ کہتی۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔بچے کے لیے اس کے جذبات واحساسات کچھ زیادہ ہی پھلتے پھولتے جا رہے تھے۔بچے کی خواہش شدید ہوتی جا رہی تھی۔شاید اسی لیے جب ڈاکٹر کی ایماء پر سہیل کا بھی چیک اپ کرایا گیا اور کئی ڈاکٹروں کی ٹیسٹ رپورٹس سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ سہیل باپ نہیں بن سکتا تو رافیہ پر کوہ گراں ٹوٹ پڑا۔وہ خاصی مینٹل ہو گئی اور اسے کئی دفعہ ہسپتال میں ایڈمٹ ہونا پڑا۔اس کی دیوانگی اور جنون بڑھتا ہی جا رہا تھا۔بچہ اسے نارمل کرنے کے لیے اشد ضروری تھا۔لیکن قدرت کے کام نرالے ہی ہوتے

ہیں۔بچے کی آمد کی توقع ہی بے معنی تھی۔سہیل خود بھی بے حد پریشان رہنے لگا تھا۔بے چارے کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ایک ہی چارہ تھا کہ بچہ گود لے لیا جائے۔

لیکن کہاں سے؟

یہ کوئی بکاؤ چیز تو تھی نہیں، جو وہ ہزاروں لاکھوں خرچ کر کے بازار سے خرید لاتا۔اور رافیہ کی جھولی میں ڈال کر کہتا۔"ایک، دو، تین، چار، جتنے بھی بچے چاہتی ہو، میں تمھیں خرید کر لا دیتا ہوں۔"

سہیل ہر ممکن طریقے سے رافیہ کی دلجوئی کرتا۔بہلانے کی کوشش کرتا۔دھیان بٹانے کے جتن کرتا۔لیکن سسکتے جذبوں کو تسکین نہ ملتی۔رافیہ بچے کی دیوانی تھی۔

تھک ہار کر ایک رات سہیل نے رافیہ سے کہا۔"میں شرمندہ ہوں رافیہ۔میری محرومی تم پر اس حد تک اثر انداز ہوتی ہے۔جی تو نہیں چاہتا یہ بات کہوں۔لیکن میں تمھیں اتنا دکھی بھی نہیں دیکھ سکتا۔"

"وہ چند لمحے رکا۔پھر پہلو میں لیٹی رافیہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے انتہائی دکھی اور غمزدہ لہجے میں بولا۔۔۔"تم ماں بننے کی اہل ہو۔۔۔۔۔بچہ تمہاری ضرورت ہے۔۔چاہو۔۔۔چاہو تو مجھ سے الگ ہو۔۔۔"

اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔رافیہ نے اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا تھا اور چیختے ہوئے کہا تھا۔

"میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتی سہیل۔۔۔تم نے ایسا کیوں سوچا۔کیوں سوچا ایسا۔تم میری زندگی ہو۔۔۔میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی سہیل۔جی نہیں پاؤں گی۔۔۔کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے۔۔۔۔"

"میری جان، میری زندگی۔"کانپتی لرزتی رافیہ کو سہیل نے بازوؤں میں بھر کر سینے میں سمو لینے کی کوشش کی اور گھگھیائی ہوئی آنسوؤں میں رندھی آواز میں بولا۔"ہم کوئی بچہ گود میں لے لیں گے رافیہ، کوئی بھی بچہ۔۔۔ہم اسے اتنا ہی پیار دیں گے، جتنا اگر اپنا بچہ ہوتا تو اسے دیتے۔"

"ہاں۔۔ہاں سہیل۔۔۔۔۔ میں اپنی ساری ممتا اس پر نچھاور کر دوں گی۔۔۔"اس کی چھاتی میں منہ چھپائے سسکتے ہوئے رافیہ نے کہا۔

اس رات کے بعد رافیہ نے اپنے آپ کو سنبھالا۔وہ کسی طور پر سہیل کو نادم اور خفیف بھی تو نہیں دیکھ سکتی تھی۔اس نے اپنی محرومی کے سارے دکھ اپنے اندر اتار لیے۔۔۔۔اور اپنی تمام تر توجہ اس بچے کی طرف مبذول کر دی۔جو اسے گود لینا تھا۔اور جس پر اپنی سسکتی ممتا لٹانا تھی۔

رافیہ کی ساس اور نندیں بھی اب تک ودو کر رہی تھیں کہ کوئی بچہ مل جائے۔جسے رافیہ اور سہیل گود لے لیں۔نندوں کے اپنے بچے تو تھے لیکن شوہروں اور سسرال والوں کی مرضی کے بغیر وہ انہیں بچہ نہ دے سکتی تھیں۔رابعہ تو خود بھی اس حق میں نہ تھی،اپنے جگر گوشے کو دوسرے کی گود میں ڈال دینے کی اس میں ہمت نہ تھی۔گود چاہے اپنے پیارے اور عزیز بھائی اور بھابھی ہی کی کیوں نہ تھی۔ہاں صبیحہ اپنی تیسری بچی انہیں دینے پر تیار ہو گئی تھی لیکن اس کا شوہر آمادہ نہ تھا۔نہ ہی اس کے سسرال والے رضامند تھے۔اس صورت میں بچہ کہیں باہر ہی سے لیا جا سکتا تھا۔دور پار کے عزیزوں میں بھی کوئی ایسا نہ تھا،جو ان کی خاطر اپنے بچے کی قربانی دے سکے۔

بچے کی تلاش ناکامیوں کے باوجود جاری رہی۔۔۔۔ ہسپتالوں سے رجوع کیا گیا۔یتیم خانوں میں درخواستیں دی گئیں۔نوزائیدہ کی تلاش تھی۔اس لیے مشکلات کا سامنا تھا۔مشکلیں کتنی سنگین اور کٹھن ہی کیوں نہ ہوں۔کبھی نہ کبھی تو آسان ہو ہی جاتی ہیں۔اور جب یہ آسان ہو جاتی ہیں،تو مشکلوں کا وجود تصوراتی سا ہو کر رہ جاتا ہے۔لگتا ہے یہ کبھی اپنی پوری کٹھنائیوں سے ٹوٹی ہی نہ تھیں۔یہی اچھا ہے کہ یہ حل ہو جاتی ہیں، آسان ہو جاتی ہیں۔ایسا نہ ہوتا تو زندگی اپنے آپ سے بیزار ہو جاتی۔اور جینا دوبھر ہو جاتا۔

رافیہ کی مشکل بھی آپوں آپ اور ایکا ایکی آسان ہو گئی۔اور حل نکل آیا۔
ان دنوں رافیہ کچھ دنوں کے لیے سہیل کے ساتھ ملتان گئی ہوئی تھی۔وہ اسے

تنہائی کا زہر پینے کو اکیلا بھی نہ چھوڑتا تھا۔بزنس ٹرپ ہوتا یا کوئی ذاتی کام،وہ ہر جگہ رافیہ کو ساتھ لے جاتا۔سارا دن سہیل اپنے کام نمٹاتا رہتا۔

اور

رافیہ گاڑی لیے شہر میں گھومتی رہتی۔شاپنگ کرتی۔تفریحی جگہوں پر جاتی۔اور اگر اس شہر میں کوئی واقف کار ہوتا تو اس سے ملنے چلی جاتی۔

اس دن بھی وہ ہوٹل سے نکل کر سڑک پر آئی تھی کہ ایک فقیرنی نے گاڑی کے قریب آتے ہوئے کہا۔"بی بی۔۔۔سائیں جیوے تیرا۔بچے پھلیں پھولیں۔اللہ کے نام پر کچھ دیتی جاؤ۔"

رافیہ نے کھڑکی میں سے دیکھا۔پرانے اور میلے چکٹ کپڑوں میں نیم برہنہ عورت دو بچوں کو ساتھ لگائے تیسرے سے چمٹائے ہاتھ پھیلا رہی تھی۔اس کا چہرہ مٹی اور دھول سے اٹا تھا۔بال لٹوں کی صورت بکھرے تھے۔عمر تو اس کی تیس بتیس برس بھی نہ ہو گی۔لیکن چالس سے بھی زیادہ لگ رہی تھی۔میل اور مٹی اس کے چہرے کے اصلی نقوش کو چھپائے ہوئے تھے۔وہ عورت سے زیادہ بھتنی نظر آ رہی تھی۔کہ رافیہ نے کراہیت سی محسوس کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"میرے بچے بھوک ہیں۔میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا۔۔۔۔سدا جیوے تیرا سہاگ بی بی۔۔۔اللہ کے نام پر کچھ تو دیتی جا۔"

رافیہ نے پرس میں سے ایک روپیہ نکال اس کی طرف بڑھایا۔"لو۔۔۔۔"

"جگ جگ جیو۔۔۔۔۔سائیں جیوے۔بچے جیئیں۔۔۔۔۔"فقیرنی بولی۔۔۔۔پھر ٹانگوں سے چمٹے بچوں کو

آگے دھکیلتے ہوئے بولی۔ "آگے بڑھو۔ مرن جوگے۔ چل بھی نہیں سکتے۔۔۔"

رافیہ نے جلدی سے کہا۔ "مائی کیوں بچوں کو گالیاں دے رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے تو ہیں بے چارے۔"

"جان کا روگ ہیں بی بی۔ مرتے بھی نہیں۔۔ کم بختی مارے۔" اس نے ایک بچے کو دھموکا لگایا۔

رافیہ نے بچوں پر نگاہ ڈالی۔ میلے کچیلے بگڑی صورتوں والے روتے بسورتے بچے ماں کی ٹانگوں سے لپٹے جا رہے تھے۔ اسے بچوں کی یہ حرکت دل میں اترتی لگی۔ بچے جیسے بھی ہوں، معصوم ہوتے ہیں۔ ان کی معصومیت پر رافیہ کو پیار آ گیا۔ اپنی محرومی شدت سے محسوس ہوئی۔ بچوں کو دیکھ کر محرومی تو ہمیشہ ہی شدت سے محسوس ہوتی تھی۔ لیکن آج دل کچھ زیادہ ہی مچل گیا۔

فقیرنی بچوں کو گھسیٹتے ہوئے آگے بڑھنے کو تھی کہ رافیہ نے پوچھا۔ "کتنے بچے ہیں تیرے؟"

"پانچ۔۔۔"

"پانچ۔"

"ہاں۔۔۔"

"یہ تو تین ہیں۔"

"ایک باپ کے پاس ہے۔"

"اور پانچواں؟"

"بیچ دیا۔۔۔"

"کیا۔۔۔۔؟"

"ہاں بی بی۔۔۔۔ بھک ننگ سے تو نمٹ سکتے ہم۔ پر باپ کے نشے کو کیسے پورا کرتے۔"

"ان کا باپ نشہ کرتا ہے؟"

"ہاں۔۔۔ جو کچھ دن بھر منگ مونگ کر گھر لے جاتے ہیں۔ وہ اس کے نشے کی نظر ہو جاتا ہے۔"

رافیہ کو فقیرنی کے حالات جاننے کی کرید لگی۔ اس لیے سوال پر سوال کیے گئی۔ فقیرنی نے اسے چند لفظوں میں اپنی بپتا کہہ سنائی۔ ایک بچہ جوان لوگوں نے بیچ دیا تھا، اس کے متعلق بتاتے ہوئے فقیرنی قدرے افسردہ بھی ہوئی۔ لیکن بولی۔ "یہ بچے جب بھوک سے بلکتے ہیں تو جی چاہتا ہے سب کو بیچ دوں۔ خریدنے والے انہیں دو وقت کی روٹی تو دے دیتے ہیں۔ چاہے مارتے ہیں، پیٹتے ہیں اور جانوروں کی طرح کام لیتے ہیں۔"

اچانک ہی رافیہ کے دل میں ایک امید کی کرن پھوٹی۔

بچہ، گود لینے کے لیے بچہ!

اس نے جلدی سے فقیرنی سے پوچھا۔۔۔ "یہ تیری گود والا بچہ۔۔۔۔۔۔؟"

بچی ہے موئی۔۔۔۔" وہ اس کا چہرہ کندھے سے ہٹا کر رافیہ کو دکھاتے ہوئے بولی۔

"یہ۔۔۔ یہ مجھے دے سکتی ہو۔۔؟"

"جی؟؟"

"ہاں۔۔۔ میں۔۔۔ تمھیں ڈھیر سارے پیسے دوں گی۔۔۔ اسے میں گود لوں گی۔۔۔ بیٹی بناؤں گی۔۔۔" فرط جذبات سے مغلوب بوجھل آواز میں رافیہ اتنا کچھ کہہ گئی۔ کہ فقیرنی حیرت زدہ سی اس کا منہ تکنے لگی۔

"تمہارے بچے نہیں ہیں؟" اس نے کہا۔

"نہیں۔۔۔"

"ہاہائے۔۔۔"

"بچے نہیں۔ لیکن پیسہ بہت ہے۔ تم یہ بچی مجھے دے دو، میں تمھیں کچھ دونگی۔"

"بیٹی کا کیا کرو گی۔۔۔ بیٹا لے لو۔ کچھ کام بھی کرے گا۔"

"نہیں۔۔۔ یہ بیٹی ٹھیک ہے۔ چھوٹی ہے نا۔ میں اسے اپنی بچی بنا کر پالوں گی۔"

فقیرنی کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ کچھ ممتا کے تقاضے بھی تھے، اس لیے وہ رافیہ کو ٹھیک سے جواب نہ دے پا رہی تھی۔

رافیہ متواتر بچی کے لیے ہاتھ پھیلاتی رہی۔

تو

وہ بولی۔ "تم یہیں رہتی ہو؟"

"ہاں چند دنوں کے لیے یہاں آئے ہوئے ہیں۔۔۔ بچی مجھے دے دو۔ اس کی زندگی سنور جائے گی۔ تمھیں بھی اتنا پیسہ دے دوں گی کہ باقی بچوں کو آرام سے پال سکو گی۔ بیشک سوچ لو۔ خاوند سے صلاح کر لو۔۔۔"

"وہ موا تو الٹا مجھے مارے پیٹے گا۔ کہ میں بچی کا سودا ابھی کیوں نہیں کر آئی۔۔۔"

رافیہ نے پھر بھی فقیرنی کو سوچنے کا موقع دیا۔ اور بولی کل آ کر مجھے اطلاع دے دینا۔ جو بھی صلاح کرو۔

"اچھا۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

رافیہ نے اسے اپنے کمرے کا نمبر بتایا۔۔۔ ایک بار پھر بچی لینے کی استدعا کی۔

فقیرنی ہامی بھر کر چلی گئی۔

رات رافیہ نے سہیل کو سارا واقعہ سنایا۔ سہیل نے خاموشی سے سنا۔ جب رافیہ نے پوچھا۔ "آپ تیار ہیں بچہ گود لینے کو۔"

تو اس نے ہولے سے کہا۔ "فقیرنی کا بچہ خرید و گی؟"

"بچہ بچہ ہی ہوتا ہے سہیل۔۔۔ ہم اسے اپنا ماحول دیں گے۔ اپنے طریقے سے پالیں گے۔۔۔ وہ ہماری بچی بنے گی۔۔۔" رافیہ نے چند باتوں ہی میں سہیل کو قائل کر لیا۔

"سہیل بچے بکتے نہیں۔ نہ ہی خریدے جاتے ہیں۔۔۔ یہ تو والدین کی ضرورت اور مجبوری بکتی ہے۔۔۔ ہم یہ ضرورت اور مجبوری اپنی ضرورت کے لیے خرید رہے ہیں۔"

"جیسے چاہے کر لو۔۔۔"

"ہم بچی ہمیشہ کے لیے لے لیں گے۔ ان لوگوں سے پھر کوئی رابطہ نہیں رکھیں گے۔"

"بہتر جناب۔۔۔ جو چاہے کیجئے۔۔۔"

سہیل نے اجازت دے دی۔

رافیہ اگلی صبح فقیرنی کے انتظار میں کئی گھنٹے بالکنی میں بیٹھی رہی۔

پھر

وہ آ ہی گئی۔

اس کے ساتھ اس کا چرسی شوہر بھی تھا۔ فقیرنی سے بھی کہیں لاغر، مریل اور خارش زدہ۔۔۔

سودا طے ہوا۔ رافیہ ہی نے بات کی۔ سہیل تو صرف رافیہ کی خاطر ساتھ بیٹھا رہا۔ ورنہ انہیں تو ان لوگوں سے خاصی کراہیت محسوس ہو رہی تھی۔

بہر حال بچی رافیہ کی گود میں ڈال دی گئی۔ آج فقیرنی اسے نہلا دھلا کر لائی تھی۔ بچی رافیہ کو دیتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو بھی جھلملا رہے تھے اور آخری بار بچی کو سینے سے بھینچ کر اس نے جس کرب سے جدا کیا تھا۔ وہ بھی متاثر کن تھا۔

رافیہ نے انہیں ان کی سوچ سے بھی زیادہ پیسہ دیا تھا۔ اس نے صرف ایک ہی شرط رکھی تھی۔ کہ یہ لوگ آئندہ بچی سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھیں گے۔

رافیہ خوش تھی۔ اسی دن وہ بازار سے بچی کے لیے ڈھیر سارے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں لے آئی۔ اس کی بلکتی سلگتی ممتا کی تسکین کا سامان ہو گیا تھا۔ سہیل

رافیہ کی خوشی میں خوش تھا۔

لیکن جب یہ لوگ بچی کو لے کر گھر لوٹے۔ اور اس کے متعلق سب کو بتایا۔ تو سب نے ناک منہ چڑھایا۔ ماں باپ، بہنیں، رشتے دار سب ہی نالاں ہوئے۔

"بچہ گود لینا ہی تھا تو حسب نسب تو دیکھا ہوتا۔"

"فقیرنی کی بچی اب ہماری اولاد کہلائے گی۔"

"ان لوگوں کا کیا دین ایمان۔۔۔ پتا نہیں بچی ان کی جائز اولاد بھی ہے یا نہیں۔"

"حرامی ہو گی۔ تبھی بیچ ڈالی۔"

جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔ ساس نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ بچی واپس کر دی جائے۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ کسی شریف گھرانے کا بچہ لیا تو لیں گے۔ گندہ خون شرفا کے خون سے میل نہیں کھاتا۔

رافیہ جو سب کی باتیں سن سن کر تنگ آ گئی تھی۔ تنک کر بولی۔ "لادیں مجھے شریف گھرانے کا بچہ۔ میں یہ بچی واپس کر دوں گی۔۔۔۔۔۔ مجھے بچہ چاہیے۔۔۔ میں بچے کے لیے اب اور انتظار نہیں کر سکتی۔ لادیں مجھے

ابھی۔ یتیم خانے میں بجھوا دوں گی۔"

خاصی تو تو میں میں ہوئی۔ پھر سہیل ہی نے ماں کو سمجھایا۔ کمزوری اور محرومی اس کی تھی۔ رافیہ کا کیا قصور۔ اس کی تو یہی عظمت کیا کم تھی کہ اس نے بچہ گود لے کر سہیل کی محرومی پر پردہ ڈال دیا تھا۔

دن گزرتے گئے۔ رافیہ بچی میں کھو گئی۔ دن کا چین اور راتوں کا آرام اس نے اس کے لیے تج دیا۔ وہ اتنی مصروف ہو گئی کہ اب اس پر نہ تو ڈپریشن کے دورے پڑتے، نہ ہی مایوسی کا عالم طاری ہوتا۔ وہ تو اپنی ننھی منی گڑیا پا کر بے حد خوش تھی۔ اس نے بچی کا نام حنا رکھا۔ لیکن پیار سے ہنی کہنے لگی۔

انہیں دنوں ہماری پوسٹنگ آ گئی۔ ہم لوگ لندن چلے گئے۔

اور چار سال بعد جب میں واپس آئی تو رافیہ سے ملنے گئی تو ہنی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ بہت پیاری بچی تھی۔ شہد ملی دودھیا رنگ تھی، جسے اگر سانولا رنگ کہا جاتا۔ تو نکھرا ہوا ضرور تھا۔ اس کے نقوش خاص کر آنکھیں بہت خوبصورت تھیں۔ گھونگھریالے بال نرم و ملائم تھے۔ اس نے پھولا پھولا سا فراک پہنا ہوا تھا۔ اس بچی میں جانے کیا کشش تھی کہ بے اختیار پیار کرنے کو جی مچل اٹھتا تھا۔ میں نے بھی اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ اور خوب پیار کیا۔۔۔ رافیہ کے چہرے پر خوشی کے رنگ لہرا لہرا گئے۔

پھر ہم دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ رافیہ کے گھر والوں نے اب ہنی کے وجود کو تسلیم کر لیا تھا۔ سہیل تو اب اس سے ایک باپ کی سی محبت کرتا تھا۔ ساس بھی بچی سے پیار کرتی تھی۔ سب اس سے مانوس ہو گئے تھے۔ اور اب وہ گھر کا فرد ہی سمجھی جانے لگی تھی۔ رافیہ کو اسے اس مقام تک لانے کے لیے جن جن راہوں سے گزرنا پڑا، وہ بڑی کٹھن اور دشوار تھیں۔ لیکن اب وہ مطمئن تھی۔ سہیل نے بچی کو قانونی طور پر اپنا کر رافیہ کے من کے سارے بوجھ ہلکے کر دیے تھے۔

رافیہ بہت خوش تھی۔ اپنی کوکھ سے جنے بچے سے بھی شاید اتنا پیار نہ ہوتا ہو گا۔ جتنا رافیہ کو ہنی سے تھا۔ جان

دیتی تھی اس پر۔

"میری ہنی بڑی بخت آور ہے۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"ہے تو۔۔۔" میں بولی۔ "کہاں پیدا ہوئی اور کہاں آن پہنچی۔"

میری بات سے رافیہ کو دکھ ہوا۔ جلدی سے بولی۔۔۔ "صبا یوں نہ کہو۔۔۔ وہ کون تھی۔ تم لوگ یہ بھلا کیوں نہیں دیتے۔ وہ کیا ہے، صرف یہ دیکھا کرو۔"

"سوری۔" میں اس کے رویے اور لہجے سے شرمندہ سی ہوئی۔ رافیہ نے ایک

سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ "صبا۔۔۔ میں ہنی کی طرف سے بہت مطمئن ہوں۔ لیکن اکثر مجھے ایسے لوگوں سے ڈر سا لگتا ہے۔ ہنی معصوم ہے۔"

"ہوں۔" میں نے کچھ نہیں کہا۔

"صبا برا نہیں ماننا۔" وہ خود ہی بولی۔ "تم نہیں اور لوگوں سے بھی مجھے خدشہ لگا رہتا ہے۔ کہ وہ ہنی کو یہ بتائے بغیر نہیں رہیں گے کہ وہ کون تھی۔ کہاں سے آئی۔ اس کے ماں باپ کون تھے؟"

میں نے یونہی سر ہلایا۔

"اسی لیے میں نے ابھی سے ہنی کو ذہن نشین کرانا شروع کر دیا ہے کہ میں نے اسے گود لیا ہے۔ وہ میری کوکھ سے پیدا نہیں ہوئی۔"

"رافیہ۔ تم نے بتا دیا ہنی کو۔۔۔۔۔"

"وہ ابھی ناسمجھ بچی ہے۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ سمجھ دار ہونے پر اسے کوئی صدمہ پہنچے۔ لوگ اسے بتائے بغیر نہیں رہیں گے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ وہ اس بات کے لیے ذہنی طور پر تیار رہے۔ اسے کوئی صدمہ نہ پہنچے۔ جو کچھ لوگ اسے شرپسندی کے طور پر بتانا چاہیں، وہ پہلے سے جانتی ہو۔۔۔۔۔۔"

"شاید۔ شاید تم ٹھیک سوچ رہی ہو۔ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن بچی کیا سمجھے گی؟"

"ہاں۔ ابھی تو وہ ٹھیک سے سمجھ نہیں پاتی۔ میں اسے یہی کہتی ہوں کہ ہسپتال میں بہت سے بچے پڑے تھے۔ تم ان سب میں سے مجھے بہت پیاری لگیں۔ اس لیے میں نے تمھیں گود لے لیا۔ بیٹی بنا لیا۔"

"وہ کوئی سوال کرتی ہے تم سے؟"

"ہاں۔"

"کیا؟"

"پوچھتی ہے مما میں سب سے خوبصورت، سب سے پیاری تھی؟"

"اچھا۔۔۔۔۔"

"میں اس کا اعتماد مضبوط کرتی رہتی ہوں۔ مجھے یقین ہے بڑی ہو کر جب اسے بتایا جائے گا کہ وہ میری لے پالک ہے تو اسے صدمہ نہیں ہوگا۔ میرے پیار اور اعتماد نے اسکے اندر کا ہر خلا بھر دیا ہوگا تب تک۔"

میں نے مسکرا کر رافیہ کو دیکھا اور موضوع کی سنجیدگی کو بدلنے کے لیے ہنس کر کہا۔

"تم عقلمند تو کبھی بھی نہ تھیں۔ ایسی عقلمندی کی باتیں کیسے کر رہی ہو؟"

میری بات پر وہ مسکرا دی تھی۔

میں پھر واپس لندن چلی گئی۔ یوں وقفوں کے بعد آتی تو رافیہ سے ملنا ہوتا۔ ہنی پل بڑھ رہی تھی۔ پیار اور اعتماد کے ماحول میں اس کی شخصیت نکھر رہی تھی۔

چھ سال پہلے جب میں وطن واپس آئی اور رافیہ کے ہاں گئی تو ہنی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ سولہ سترہ برس کی بڑی دلکش اور جاذب نظر دوشیزہ کا روپ دھار چکی تھی۔ اس کی آنکھیں بے انتہا خوبصورت تھیں۔ رنگت کھلتی ہوئی گندمی تھی۔ لیکن بلا کی کشش لیے تھی۔ جسم انتہائی سڈول تھا۔ وہ ایک امیر اور فیشن ایبل گھرانے

کی لڑکی نظر آئی تھی۔ان دنوں تھرڈ ائیر میں داخلہ لیا تھا۔پڑھنے کے علاوہ اور بھی سر گرمیاں تھیں۔وہ ٹیبل ٹینس کی بہت اچھی کھلاڑی تھی۔کئی کپ اور ٹرافیاں جیت چکی تھی۔گانے کا بھی شوق تھا۔

ٹی وی کے دو ایک پروگراموں میں بھی آچکی تھی۔۔۔کئی تقریری مقابلے بھی جیتے ہوئے تھے۔سہیلیاں اور دوست بھی اپنے طبقے کی مناسبت سے کافی تھے۔ان دنوں رافیہ کا سرکل بڑی بیگمات کا ساتھا۔تھی بہت سوشل۔۔۔۔لوگوں سے میل ملاپ رکھا ہوا تھا۔ہنی کا بھی دوستوں کا حلقہ اسی وجہ سے کافی بڑا تھا۔رافیہ اور سہیل کے دوستوں کے اکثر بچے اس کے حلقے میں شامل تھے۔

ہنی کو اچھے اور منفرد قسم کے لباسوں کا بھی بہت شوق تھا۔بالوں کو سنوارنے کے بھی کئی اسٹائل اپنا رکھے تھے۔۔۔شوق میں مانع کوئی چیز نہ تھی۔اس لیے شوق جلا پا رہے تھے۔میں نے اسے جینز اور بلاؤز پہنے بھی دیکھا۔تنگ پاجامہ اور حیدرآبادی کرتے میں بھی نظر آئی۔شلوار قمیص میں بھی ملبوس دیکھی۔گھاگھرا چولی بھی اس نے پہنا۔اس کے بہت سے پہناوے میں نے اس کی تصویری البم میں دیکھے۔بلاشبہ اس پر ہر لباس خوب جچتا تھا۔وہ خوش ذوق اور خوش مزاج تھی۔دو تین دن میں ان کے ہاں رہی۔وہ مجھ سے بہت مانوس ہو گی۔میں اس سے پیار بھی بہت کرتی تھی۔وہ تھی ہی ایسی کہ اس پر ٹوٹ کر پیار آتا تھا۔اس کی شخصیت بنانے اور نکھارنے میں رافیہ کی شب و روز کی محنت کا بہت دخل تھا۔

"ہنی۔"ایک دن میں نے اس سے کہا۔

"جی آنٹی۔"وہ بڑے پیار سے بولی۔

"بیٹا۔تمہارے ممی پاپا کتنی دفعہ میرے پاس لندن آچکے ہیں۔تمہارا جی نہیں چاہتا۔اپنی آنٹی کا گھر دیکھنے کو۔۔۔۔۔"

وہ میرے سامنے کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے چیونگ گم چبا رہی تھی۔جینز پر اس نے سرخ بلاؤز پہن رکھا

تھا۔وہ دھیرے سے مسکرائی اور شوخ نظروں سے اپنی مما کو دیکھ کر بولی۔"جواب ان سے مانگیں۔"

"کیوں؟"میں نے پوچھا۔

"بس۔"وہ اٹھی،میرے گلے میں بانہیں ڈالیں،میرے گال پر پیار کیا اور اترائے ہوئے انداز میں مسکرا کر وہاں سے چلی گئی۔

"کیا بات ہے؟"میں نے رافیہ سے پوچھا۔

"ہے ایک بات۔"اس نے مسکرا کر کہا۔پھر اس نے مجھے حسن رضا کے متعلق بتایا۔یہ

خوبرو اور لائق فائق لڑکا ان دنوں انگلینڈ میں ایم بی اے کر رہا تھا۔اس کا ارادہ وہیں سیٹل ہونے کا تھا۔حسن رضا اور ہنی بچپن کے دوست تھے۔یہ دوستی دل کے بندھن بن گئی تھی۔دونوں پیار کے ناتے جوڑے ہوئے تھے۔رافیہ اس کی صرف ماں ہی نہیں،دوست بھی تھی۔ہنی اپنی کوئی بات بھی اس سے چھپاتی نہیں تھی۔

"ہنی لندن جانے کی خواہش ہمیشہ کرتی ہے۔"رافیہ نے کہا۔

"تو۔۔۔۔؟"

"میں ہی اسے کہتی رہتی ہوں کہ شادی کے بعد ایک ہی بار لندن جانا۔پہلے جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"یہ بات ہے۔"

"ہاں۔حسن رضا بہت اچھا لڑکا ہے۔اگلے سال وہ اپنی تعلیم مکمل کر لے گا۔اس نے ہنی سے وعدہ کیا ہے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے والدین کو باقاعدہ رشتہ لینے کے لیے ہمارے گھر بھیجے گا۔"

"رشتے کی بات ابھی چلی نہیں؟"میں نے پوچھا۔

"نہیں بھئی۔۔ابھی تو ہنی نے بھی اپنی تعلیم مکمل کرنا ہے۔کم از کم بی اے تو کر لے۔جلدی بھی کا ہے کی

ہے۔"

"ہاں۔ ٹھیک ہے۔ ابھی تو ہنی سترہ سال ہی کی ہوئی ہے۔"

"ہاں اگلے ماہ ہو جائے گی۔"

"خدا تمھیں اس کی خوشیاں مبارک کرے۔"

"آمین۔۔۔۔"

حسن رضا رافیہ کو بھی بہت پسند تھا۔ وہ اسکی جتنی اور جس طرح تعریفیں کر رہی تھی۔ مجھے اندازہ کرتے دیر نہ لگی۔ کہ یہ رشتہ طے ہی ہے۔ میں نے اس رشتے کی کامیابی

ی دل سے دعا کی۔

لیکن

ہر دعا مستجاب ہونے لگے تو دنیا سے محرومی اور ناکامی کا وجود ہی اٹھ جائے۔ تقدیر بعض اوقات ہماری دعاؤں پر مسکراتی ہے۔ طنز کے تیر برساتی ہے۔ اور وہ ہونے نہیں دیتی، جس کے ہونے کی ہم تمنا کرتے ہیں۔

اس دفعہ میں چھ سال بعد وطن واپس آئی ہوں۔ حسب عادت چند دن لاہور میں گزار کر رافیہ سے ملنے چلی آئی۔

لیکن

یہاں آکر جو کچھ سنا اور دیکھا۔ دل ڈوب ڈوب گیا۔ چھ سال پہلے میں جو ہنستا بستا گھرانہ چھوڑ کر گئی تھی۔ وہ دکھوں کی صلیب پر لٹکا ہوا تھا۔ رافیہ اپنے وسیع وعریض گھر میں بولائی بولائی پھرتی تھی۔۔۔۔ شاندار کوٹھی۔ لاکھوں کروڑوں کا بزنس۔ لمبی چوڑی جائیداد، کوئی شے بھی تو اس کے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتی تھی۔۔۔۔۔ میں نے اس کی آنکھوں میں ہمیشہ مسرتوں اور خوشیوں کی چمک دیکھی تھی۔ نکھری ہوئی

سنہری روپہلی دھوپ کی سی چمک۔ لیکن اب اس کی آنکھیں سوگوار تھیں۔ متورم رہتی تھیں۔ اور ان میں ہمہ وقت ساون بھادوں کے پانی سے بوجھل بادلوں کا غبار رہتا تھا۔

مجھ سے مل کر وہ اتنی بے اختیاری سے روئی کہ میرے صبر کے بند بھی ٹوٹ گئے۔ زمانے اور تقدیر نے اسے جتنا کچھ دیا تھا۔ شاید اس سے بہت زیادہ چھین بھی لیا تھا۔

جب وہ ذرا سنبھلی تو اس نے بیتے دنوں کی پوری روداد مجھے سنائی۔

میرا دل دکھا اور دکھ آنسو بن کر میری آنکھوں سے بہتا رہا، میرے پاس تو الفاظ ہی

نہ رہے تھے جو اسے تسلی دلاسہ کے لیے کہتی۔۔۔۔ بار بار یہی کہتی رہی۔ "صبر کرو۔ اللہ بہتر کرے گا۔۔۔ ہنی ٹھیک ہو جائے گی۔"

ہنی پر جو ستم ٹوٹے تھے۔ انہوں نے تو اس کی شخصیت ہی توڑ پھوڑ کر رکھ دی تھی۔ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا تھا۔ ایک لمبا عرصہ مینٹل ہسپتال میں رہنے کے بعد اب اگرچہ وہ گھر آچکی تھی، تاہم ابھی وہ پوری طرح ٹھیک نہیں ہو پائی تھی۔ گم صم اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی۔ اس کمرے کا دروازہ اب بھی لاک رکھنا پڑتا تھا۔ خدشہ تھا کہ وہ عالم جنون میں کہیں باہر نہ نکل جائے۔ گو زیادہ تر وہ خاموش ہی رہتی تھی۔ لیکن خاموشی طوفانوں کا بھی تو پیش خیمہ ہوتی ہے۔

ہنی نے صدمے پہ صدمہ کھایا تھا۔ اس کی ذہنی استطاعت اتنی نہ تھی کہ ان صدموں سے نبرد آزما ہو جاتی۔

حسن رضا کے متعلق پچھلی دفعہ جب میں آئی تھی۔ تو رافیہ نے بتایا تھا اور جب میں واپس لندن گئی تو اسے ملنے بھی گئی تھی۔ اپنے ہاں بھی بلایا تھا۔ وہ بڑا خوبرو نوجوان تھا۔ تعلیم میں پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ اور ہنی کے لیے جو کچھ اس کے من میں تھا۔ وہ اس کی آنکھوں سے ہویدا تھا۔ یقیناً وہ ہنی کو بہت چاہتا تھا۔

وہ تعلیم مکمل کر کے واپس پاکستان آگیا۔ اس کی واپسی ہنی کی خوشیوں کی ضامن تھی۔ دونوں ایک دوسرے

کے انتظار میں وقت گزار رہے تھے۔ جب انتظار ٹوٹا تو من خوشیوں سے بھر گئے۔ رافیہ نے مجھے بتایا کہ ان دنوں ہنی ہلکی پھلکی نازک تتلیوں کی طرح جیسے ہواؤں کے دوش پر اڑتی پھرتی تھی۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے سرگوشیاں ماں کے کانوں میں اتارتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔ "مما آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں۔ میرے اور حسن رضا کے ملنے پر۔"

"نہیں بیٹے۔ حسن رضا مجھے پسند ہے۔ وہ اچھا لڑکا ہے۔"

رافیہ نے اسے اجازت دے دی تھی۔ لیکن دوستانہ بے تکلفی سے سمجھایا بھی تھا کہ محبتیں کتنی بھی راسخ ہوں۔ میل ملاپ میں اخلاقی حدود قائم رہنا چاہئیں۔ ہنی ماں کی بات سمجھ گئی تھی۔ سمجھدار وہ تھی بھی بہت۔۔۔ پھر اس کی محبت میں خلوص اور اعتماد تھا۔ کسی اوچھی چھچھوری حرکت کا ارتکاب وہ کر ہی نہیں سکتی۔ حسن رضا اور وہ بے تکلفی سے ملتے۔ کئی دفعہ وہ ہنی کے ساتھ ان کے گھر بھی آیا۔ سہیل کو بھی لڑکا پسند تھا۔

دونوں لمبی لمبی ڈرائیونگ پر نکل جاتے۔ لمبی سرمئی سڑکوں کے کنارے خاموشی سے ایستادہ گھنے پیڑوں تلے گاڑی روک کر زمانے بھر کی باتیں کرتے اور کبھی خاموشی میں ڈوب کر دلوں کی دھک دھک سنتے۔ خاموشی وہ کچھ کہہ گزرتی، جو زبان نہ کہہ پاتی۔ کبھی دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے آزاد پنچھیوں کی طرح درختوں کے گھیر دار تنوں اور خودرو پودوں کے ارد گرد گھومتے ہوئے۔ ہاتھ چھوٹ جاتے تو دوڑیں لگتیں۔ ایک بھاگتا۔ دوسرا پکڑنے کو لپکتا۔ قہقہے فضا میں رس گھولتے۔ خوشیوں کا پرتو چہروں پر دمکتا۔

یوں وقت گزرتا چلا گیا۔

"ہنی۔" ایک دن حسن رضا نے کہا۔

"ہوں۔" وہ ایک درخت کی موٹی سی شاخ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھی تھی۔

"اب، اب ہمیں کوئی فیصلہ کر لینا چاہئے۔" وہ پتے نوچتے ہوئے بولا۔

"کیسا فیصلہ۔۔۔؟" ہنی اچھل کر نیچے اتر آئی۔

"تو کیا تم سمجھتے ہو کہ ابھی فیصلہ ہونا باقی ہے۔"

"نہیں تم میری بات نہیں سمجھیں۔"

"تو سمجھاؤ۔۔۔۔۔"

"میں اپنی امی کو تمہارے ہاں بھیجنا چاہتا ہوں۔ باقاعدہ فیصلے کے لیے۔ اپنے فیصلے پر والدین کے فیصلے کی مہر لگانے کے لیے۔۔۔۔۔"

"اوہ۔۔۔" ہنی کے گال سرخ ہو گئے۔

"ہاں۔" حسن رضا نے شوخی سے اس کی حسین آنکھوں میں جھانکا۔

"تو۔۔۔۔" وہ اس کی طرف دیکھے بنا بولی۔

"تو یہ کہ۔۔۔ ابھی مابدولت کو جاب نہیں ملی۔ یہ نہ ہو تمہارے والدین اسی بنا پر میری امی کو چلتا کر دیں۔"

حسن رضا نے اتنے مسخرے پن سے کہا کہ ہنی ہنستے ہنستے بے حال ہو گئی۔

حسن رضا اسے اپنی آنکھوں میں جذب کرتے ہوئے بولا۔ "کیا جاب ملنے تک انتظار کیا جائے۔"

ہنی ننھے سے رومال سے اپنی آنکھوں کے گوشے صاف کرتے ہوئے بولی۔ "بات سوچنے کی ہے۔"

"تم تو اپنی مما سے بہت فری ہو۔"

"ہوں تو۔۔۔"

"ان سے پوچھ لو۔"

"کیا۔۔۔؟"

"میری امی ابھی آئیں یا جاب ملنے کا انتظار کریں۔"

وہ چند لمحے چپ رہی۔ پھر بولی۔ "تم یہ مشورہ اپنی امی سے کیوں نہیں کرتے ؟"

حسن رضا قدرے ہچکچایا۔ پھر بولا۔ "میں نے تو امی سے ابھی کوئی بات ہی نہیں کی۔"

"میرے متعلق انہیں کچھ نہیں بتایا۔۔۔"

حسن رضا نے نفی میں سر ہلایا۔ ہنی کو حیرت ہوئی۔

"سچ کہہ رہے ہو۔۔۔۔" ہنی نے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔۔۔ میرے جذبے ابھی مجھ ہی تک محدود ہیں ہنی۔ میں نے اپنی امی سے

تاحال کچھ نہیں کہا۔ ہاں میری دونوں بہنیں ضرور جانتی ہیں۔"

"میرے متعلق۔۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔۔۔۔ خاص طور پر نہیں۔۔۔۔۔ ہاں یہ جانتی ہیں کہ میں کسی لڑکی کی زلف گرہ گیر کا اسیر ضرور ہوں۔"

ہنی چند لمحے چپ رہی۔ ٹکر ٹکر اس کا منہ تکے گئے۔ پھر کندے اچکاتے ہوئے بولی۔

"حیرانگی کی بات ہے۔"

حسن رضا بھی چند ساعتیں کھویا رہا۔ پھر آہستگی سے بولا۔ "ہمارے ہاں مشرقیت کچھ زیادہ ہی اثر انداز ہے۔"

"حالانکہ تم یوکے رہ کے آئے ہو۔"

"اس سے میرے گھر والوں کو کوئی فرق نہیں پڑا۔"

"رضا۔۔"

"ہوں۔"

"کیا تم اپنی امی سے اپنے دل کی بات کہہ سکو گے ؟"

"ہاں ضرور کہہ سکوں گا۔۔۔"

"اور تمھیں یقین ہے کہ تمہاری امی کی پسند کا معیار وہی ہے جو تمہارا ہے ؟"

"ہنی۔۔۔۔۔" اس نے ہنی کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں بھر کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور وثوق اور تیقن سے بولا۔۔۔ "میری پسند اتنی اعلی وارفع ہے کہ اسے کوئی رد کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

ہنی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ پکڑ کر چہرے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "رضا مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"کس بات کا؟"

"پتا نہیں کس بات کا۔" ہنی نے آہستگی سے کہا اور پھر ایکا ایکی اس کا بازو سختی سے پکڑتے ہوئے سر اس کے کندھے پر رکھ کر بولی۔ "رضا۔۔۔۔۔۔ کسی نے ہمیں جدا کرنے کی کوشش کی۔۔۔۔ تو۔۔۔۔!"

"تو۔۔۔۔۔ ہم جی نہ پائیں گے ہنی۔۔۔" رضا نے اس کی بات پوری کر دی۔ پھر اس کے بالوں میں انگلیاں الجھاتے ہوئے پیار سے بولا۔۔۔ "ایسا نہیں ہوگا ہنی۔۔۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ تم جی تھوڑا نہ کرو۔ ہم ایک ہیں اور ہمیشہ ایک رہیں گے۔ کبھی جدا نہ ہوں گے ہنی، کبھی جدا نہ ہوں گے۔"

حسن رضا کی تسلیوں کے باوجود ہنی کے دل میں جیسے کوئی پھانس سی اتر گئی۔

ہنی کی افسردگی اور پریشانی رافیہ سے بھلا کیسے چھپ سکتی تھی۔ وہ تو ہنی کی آنکھوں میں سارے احوال پڑھ سکتی تھی۔

"ہنی۔" اس نے دو تین دن ہنی کو کھوئے کھوئے دیکھا تو پوچھ ہی لیا۔

"کیا مما۔۔۔"

"جان۔۔کیا بات ہے۔کچھ پریشان لگتی ہو۔"

"نہیں تو۔۔۔۔۔۔۔"

"اس نہیں کے چکر میں مجھے مت الجھاؤ۔ میں تمہاری ماں ہوں جانی۔۔ کوئی بات ضرور ہے۔ رضا سے کوئی لڑائی جھگڑا تو نہیں ہوا۔۔۔۔"

"نہیں مما۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

مما نے اصرار سے پوچھا تو ہنی نے ساری بات بتادی۔ رافیہ ہنس پڑی۔

پھر اسے گلے لگاتے ہوئے بولی۔"اتنی سی بات کے لیے میری جانو پریشان اور اداس ہے۔"

"ہاں مما۔"ہنی نے سر ماں کے سینے میں گھسانا چاہا۔۔۔ رافیہ اسے پیار کرتی رہی۔

مکارتی رہی۔ تسلی دیتی رہی پھر بولی۔"رضا سے کہو امی کو ہمارے یہاں بھیج دے۔ جاب بھی مل ہی جائے گی۔ آخر کو ایم بی اے کی ڈگری اس کے پاس ہے۔ ہم لوگ رشتہ طے کرنے کے لیے جاب کا جواز نہیں ڈھونڈیں گے۔"

"سچ مما۔"

"ہاں۔"

ہنی ماں سے لپٹ گئی۔۔۔ پھر اس نے اسی دن یہ نوید رضا کو سنادی۔۔"تم بے دھڑک اپنی امی کو ہمارے ہاں بھیج دو۔۔۔"

"سچ۔"

"ہاں۔ میری مما نے کہا ہے۔ جاب بھی مل ہی جائے گی۔ تم فکر نہ کرو۔"

"بس ٹھیک ہے۔"

"کیا ٹھیک ہے جناب۔"ہنی بے حد خوش تھی، اترا کر بولی۔

حسن رضا نے اس کی فسوں خیز آنکھوں میں ڈوبتے ہوئے کہا۔"سب ٹھیک ہے۔ میں اپنی امی سے بات کروں گا۔ بہت جلد انہیں تمہارے ہاں بھیجوں گا۔۔۔۔ تاکہ تمھیں پابہ زنجیر ہمارے حضور پیش کرنے کی بات کر سکیں۔"

"بڑے آئے۔"وہ نگاہ غلط انداز اس پر ڈالتے ہوئے بولی۔

حسن رضا حسن کی یہ ادا دیکھ کر وارفتہ سا ہو گیا۔ اس پر جھپٹا لیکن وہ پھسلتی مچھلی کی طرح گرفت میں آنے سے پہلے ہی نکل گئی۔

دونوں اس دن بہت خوش تھے۔

حسن رضا نے حسب وعدہ اپنی امی اور دونوں بہنوں کو ہنی کے ہاں بھیج دیا۔ اس نے پہلے اپنی بہنوں سے بات کی۔ پھر اس کی وساطت سے دل کی بات ماں تک پہنچائی۔ سہیل ملک کو وہ خود تو نہ جانتی تھیں۔ لیکن حسن رضا اور بیٹیوں نے اس گھرانے کے متعلق انھیں

تایا تو وہ کوئی اعتراض نہ کر سکیں۔ اونچا اور مالدار گھرانہ تھا۔ رشتے کی بات رد کرنے کا سوال ہی کب پیدا ہوتا تھا۔ پھر لڑکی بیٹے کو پسند تھی۔۔۔ اس کا رشتہ کہیں نہ کہیں تو کرنا ہی تھا۔ پسند کی جگہ ہو جاتا، تو حرج بھی کیا تھا۔

رافیہ نے اپنے سوالی مہمانوں کی بہت آؤ بھگت کی۔ بڑے تپاک سے ملی اور بڑے والہانہ انداز میں سواگت کیا۔ ہنی حسن رضا کی امی اور بہنوں کو بھی بہت اچھی لگی۔

دوسری دفعہ باقاعدہ رشتہ لے کر آنے کا کہہ کر مہمان اٹھ گئے۔ رافیہ اور ہنی نے انہیں بڑے پیار اور عزت سے رخصت کیا۔

لیکن وہ دوسری دفعہ آئی نہیں۔

ایک، دو، دن نہیں، ہفتے گزر گئے۔ اس دوران ہنی بھی حسن رضا سے نہ مل سکی۔ کہ وہ اپنی جاب کے انٹریو کے لیے کراچی گیا ہوا تھا۔ جب انٹرویو کی تاریخ کو بھی کئی دن گزر گئے تو ہنی نے خود ہی اسے فون کیا۔

وہ کئی دنوں سے یہیں تھا۔

"تم نے فون کیا، نہ ملنے آئے۔" ہنی نے شکوہ کیا تو وہ گمبھیر آواز میں بولا۔۔۔۔۔ "بات ایسی ہی تھی۔"

"کیوں کیسی تھی بات؟"

"میں خود تمھیں بتاؤں گا۔"

اس نے فون پر جگہ کا تعین کیا اور ہنی کو آنے کا وقت دے دیا۔ ہنی نے رافیہ وبتایا اور پھر وقت مقررہ پر اس سے ملنے چل دی۔ آج گلہ شکوہ کرنے کے لیے وہ بری طرح مچل رہی تھی۔ حسن رضا سے ناراض ہونے کا پروگرام بھی پکا تھا۔ منہ بنائے اور پھلائے وہ وہاں پہنچ گئی، جہاں حسن رضا نے آنا تھا۔

یہ ان دونوں کی پسندیدہ جگہ تھی۔ لمبی سڑک کے کنارے جھک آئے درختوں تلے۔ جہاں چھوٹے بڑے کائی زدہ پتھر پڑے ہوئے تھے۔ اور درختوں کی موٹی شاخیں سوکھے تنوں پر گری پڑی تھیں۔

حسن رضا وہاں پہلے سے موجود تھا۔ ہنی نے ایک نگاہ اس پر ڈالی۔ شکوؤں بھری نگاہ۔ لیکن وہ نگاہ الجھ کر رہ گئی۔ حسن رضا خاصا مضطرب اور پریشان تھا۔ ہنی گلے شکوے بھول کر اس کی طرف بڑھی۔

"ہیلو۔۔" اس نے بے تابی سے کہا۔

"ہیلو۔۔۔" حسن رضا کی آواز جذبوں سے عاری تھی۔

"کیا بات ہے حسن رضا۔ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔" وہ درخت کے تنے سے لگ کر بولی۔

"کچھ نہیں، بہت پریشان ہوں۔" وہ الجھ کر بولا۔

"خیریت۔۔۔؟" ہنی حیران ہوئی۔

"ہنی۔۔۔" حسن رضا کا چہرہ تنا ہوا تھا۔

"ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ بولی۔

"تم۔۔۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔۔۔۔" وہ غصیلی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو۔" ہنی نے چند لمحے اس کی طرف دیکھنے کے بعد پوچھا۔

"وہ جو تمھیں کہہ دینا چاہئے تھا۔۔۔" وہ جیسے ایک دم ہی پھٹ پڑا۔

ہنی کچھ نہ سمجھی۔ اس کے سامنے آتے ہوئے حیران و پریشان نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے کیا کہہ دینا چاہئے تھا۔۔۔"

"یہی کہ تم سہیل ملک کی بیٹی نہیں ہو۔۔۔" وہ غرایا۔

ایک لمحے کو تو وہ کچھ نہ سمجھی۔ اس کے منہ سے نکل گیا۔ "تو اور کس کی بیٹی ہوں۔"

"ایک فقیرنی کی۔ بھک منگوں کی اولاد ہو۔"

"کیا۔۔۔" ایک لمبی حیرت زدہ چیخ نما آواز ہنی کے منہ سے نکلی۔ حسن رضا اس کی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے غصے سے بولا۔ "مجھے صرف اس وجہ سے اپنی ماں اور بہنوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑا۔ تم نے مجھ سے کیوں چھپایا۔ کیوں نہ سچ سچ کہہ دیا۔۔۔ مجھے اعتماد میں لیا ہوتا تو میں کچھ نہ کچھ جواب بنا لیتا۔ لیکن تم نے جان بوجھ کر یہ بات چھپائی اور میری بہنیں سچ ہی کہتی ہیں کہ جو لڑکی اتنی بڑی بات مجھ سے چھپا سکتی ہے۔ کل کو اور کیا نہیں کر سکتی۔۔۔۔ اعتماد۔۔۔۔"

"رضا۔۔۔" ہنی چیخی۔۔۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور موٹی شاخ پر بیٹھ گئی۔ کئی لمحے وہ کچھ نہ

کہہ سکی۔

"میری ماں کو کسی نے تمہارے متعلق آکر سب کچھ بتادیا ہے۔"

"کیا بتادیا ہے۔۔۔۔؟" وہ پاگلوں کی طرح چیخی۔

"کہ تم سہیل ملک کی بیٹی نہیں ہو۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔ نہیں ہوں۔ لیکن انہوں نے مجھے قانونی طور پر اپنایا ہوا ہے۔ بیٹی بنا کر پالا پوسا ہے۔ گود لیا ہوا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ مجھے پتا ہے۔ مما اور پاپا نے یہ بات مجھ سے چھپائی نہیں۔"

"تم نے مجھ سے کیوں چھپائی۔"

"یہ تمہارے پوچھنے اور مجھے بتانے کی نوبت ہی نہیں آئی رضا۔۔۔ ٹھیک ہے میرے والدین نے مجھے گود لیا ہے۔" وہ بات پوری نہیں کر سکی۔۔۔ اس کی آنکھوں سے

آنسو بہنے لگے، آواز گھٹ گئی۔

"ایک فقیرنی کی گود سے۔ بھک منگوں سے خریدا ہے تمہیں۔" حسن رضا اس کے آنسوؤں سے متاثر ہوئے بغیر بولا۔ ماں اور بہنوں نے اس کی ایسی برین واشنگ کی تھی کہ وہ اپنے برسوں کے پیار کو بھی بھلائے جا رہا تھا۔

یہ انکشاف ہنی کے لیے بالکل نیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح حسن رضا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ کس نے کہا تم سے۔ مما نے تو مجھے ہسپتال کے کئی بچوں میں سے منتخب کر کے لائی تھیں۔"

"میری ماں کو یہی بتایا گیا ہے۔ بڑے معتبر آدمی نے یہ معلومات فراہم کی ہیں۔۔۔ اور۔۔۔ اور وہ۔۔۔ اب کسی صورت میرا رشتہ۔۔۔"

"مجھ سے نہیں کرنا چاہتیں۔۔۔۔۔" وہ غرائی۔

"وہ اپنی بات پر اڑی ہیں ہنی۔۔۔ میں نے بہت سمجھایا۔ بہت کچھ کہا۔ لیکن وہ کسی طور پر مانتی ہی نہیں۔ ایک فقیرنی کی بیٹی انہیں قبول نہیں۔۔۔ کاش تم نے سب کچھ مجھے پہلے بتایا ہوتا۔۔۔ کچھ نہ چھپایا ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔" حسن رضا کا لہجہ تاسف سے بھرا تھا اور وہ بے چینی سے ہاتھ ملے جا رہا تھا۔

ہنی کی ذہنی حالت بگڑ رہی تھی۔ وہ کسی طور پر یقین نہ کر پا رہی تھی کہ وہ کسی فقیرنی کی یا بھک منگوں کی اولاد ہے۔

اور اگر

ایسا ہے

تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس کے آگے اسے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔۔۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ کبھی بے تحاشا آنسو بہنے لگتے۔ کبھی چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا۔ کبھی سارا وجود ٹھنڈا ہو جاتا اور کبھی انگ انگ سے چنگاریاں پھوٹنے لگتیں۔ وہ عالم اضطراب میں کبھی شاخ کے گرد چکر کاٹنے لگتی۔ کبھی دم سے بیٹھ جاتی۔

حسن رضا پریشانی کے عالم میں اسے تکے جا رہا تھا۔ لیکن کچھ کہہ نہ پا رہا تھا۔

"حسن رضا۔" ہنی بمشکل اپنے دل و دماغ کو قابو کرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "یہ میں ہوں، میں۔ جس نے تمہارے ساتھ خلوص، اعتماد اور پیار کے ناتے جوڑے تھے۔ میں۔ وہی میں ہوں۔۔۔۔ اس میں کو اگر تم کسی گندے اور ذلیل پس منظر سے ملا کر رد کر رہے ہو۔ تو تمہاری مرضی۔۔۔۔۔"

"ہنی۔۔۔۔" وہ جلدی سے آگے بڑھا۔

"مت آؤ میری طرف۔" ہنی کے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

"ہنی پلیز۔۔۔۔"

"اب بھی کچھ کہنا باقی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"تم شاید نہیں جانتیں۔ تم سے چھپایا گیا ہے۔ تم اپنے مما پاپا سے پوچھ سکتی ہو۔"

"کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ کون ہوں۔۔۔۔؟"

حسن رضا کچھ نہیں بولا۔

"میں۔۔۔۔۔۔۔ میں ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سمجھے۔۔۔۔۔۔"

حسن رضا صرف اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"بہت بلند بانگ دعوے تھے تمھارے۔ بھر بھری مٹی کی طرح بیٹھ گئے۔" وہ بھیانک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہنی۔۔۔۔ مجھے غلط مت سمجھو۔۔ میں۔۔۔۔۔ میری ماں۔ اور بہنیں۔۔۔۔"

ہنی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔۔۔ "ان کی آڑ مت لو۔ کہہ دو۔۔ کہ تمھیں بھی ایک فقیرنی کی کوکھ سے جنم لینے والی لڑکی سے۔۔۔۔"

اس کی آواز گھٹ گئی۔ پھر وہ بے آواز ہچکیوں کو سینے میں ضبط کرتے ہوئے بے ربط لہجے میں بولی۔ "میں۔ میں ۔ نہیں جانتی۔۔ کہ کیا کہوں۔۔۔ کیا کروں۔۔۔ چلے جاؤ میری نظروں کے سامنے سے۔"

"ہنی۔۔" حسن رضا اب بے حد پریشان تھا۔۔۔ وہ کچھ آگے بڑھا۔ ہنی کے بے سہارا ڈولتے وجود کو بانہوں کا سہارا دینا چاہا۔

لیکن

وہ کئی قدم پیچھے ہٹتے ہوئے غرّائی۔ "میرے قریب مت آنا۔۔ تم جھوٹے ہو دغا باز ہو۔۔ فریبی ہو۔۔۔ تم نے مجھے چھوڑنے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ ماں اور بہنوں کی آڑلی ہے۔ دفع ہو جاؤ۔ میں تمھاری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔"

ہنی کے یوں منع کرنے کے باوجود وہ آگے بڑھا۔ گھبرا کر بولا۔ "ہم کچھ سوچیں گے ہنی۔۔۔ کچھ سوچیں گے۔ اتنی پریشان نہ ہو۔۔۔ کوئی راہ نکل آئے گی۔۔۔"

"راہ نکل آئے گی؟"

"ہاں۔ ہاں۔۔۔"

"نکل آئے گی۔" ہنی نے لہراتے ہوئے ہاتھ اٹھایا اور تڑاخ سے اس کا تھپڑ حسن رضا کے منہ پر پڑا۔

وہ بھنّا گیا۔

دوسرے لمحے ہنی اپنی گاڑی کی طرف بھاگی جا رہی تھی اس کی مخدوش حالت کے پیش نظر حسن رضا تھپڑ کی اذیت و ذلت بھول کر اس کے پیچھے لپکا۔

لیکن

وہ مجنونانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر چکی تھی۔

"ہنی۔۔۔۔۔۔" وہ زور سے چیخا۔

لیکن

ہنی گاڑی نکال کر لے جا چکی تھی۔

پتا نہیں راستہ کیسے کٹا اور وہ کیسے گھر پہنچ گئی۔۔۔ وہ گاڑی کھلی چھوڑ کر ہی اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔۔۔ اور دھڑ سے دروازہ بند کر کے بیڈ پر اوندھے منہ گر گئی۔

رافیہ کو نوکر نے بتایا کہ چھوٹی بی بی گاڑی کھلی چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف حواس باختہ سی بھاگی جا رہی تھیں۔
رافیہ کا دل بیٹھ سا گیا۔۔۔ وہ تیزی سے اس کے کمرے کی طرف لپکی' دروازہ بند تھا لیکن لاک نہیں تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں دروازہ کھول کر اندر آگئی۔
"ہنی۔۔۔۔۔ ہنی بیٹی۔۔۔۔" اس نے بیڈ پر آڑی پڑی ہنی کا کندھا ہلایا۔۔۔ پھر ایک دوبار نہیں کئی بار ہلایا۔
"ہنی۔ جان۔۔۔۔۔۔ کیا ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کچھ بتاؤ نا۔۔۔۔۔ اٹھو۔۔۔۔۔ میری طرف دیکھو۔۔۔۔"
وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔۔۔ اس کے بال بکھرے تھے۔ آنکھیں سرخ انگارہ تھیں۔ جیکٹ کے بٹن کھلے تھے' وہ اس وقت زرد بلاؤز میں براؤن کوٹی پہنے ہوئے تھی۔ ٹراؤزر بھی براؤن تھے۔
"ہنی۔۔۔۔ کیا ہوا۔ میری جان۔" رافیہ نے اس کے بال چہرے سے ہٹائے اور پیار سے پوچھا۔ کوئی انتہائی سنجیدہ بات ہو چکی تھی۔ یہ وہ ہنی کو دیکھ کر جان گئی تھی۔ لیکن کیا بات؟
یہ ہنی ہی اسے بتا سکتی تھی۔

رافیہ نے جب پھر پیار اور ممتا بھرے لہجے میں پوچھا۔ "ہنی جانی کیا ہوا۔۔۔۔"
تو
ہنی نے
رافیہ کا گریبان پکڑ کر دیوانہ وار جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔
"میں کون ہوں۔۔۔۔؟ میں کون ہوں۔۔۔۔۔ مما بتاؤ میں کون ہوں؟"
"ہنی۔۔۔۔۔ کیا ہو گیا ہے تمھیں۔۔۔۔" رافیہ نے اسے ساتھ لگانے کی کوشش کی۔
"میں کون ہوں۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے بتائیں میں کون ہوں۔۔۔۔۔ بتائیں۔۔۔۔۔" اس نے وحشت کے عالم

میں رافیہ کو جھنجوڑ ڈالا۔ اور اس کی سنے بغیر چیخ گئی۔
"میری جان ہو۔ میری بیٹی ہو ہنی۔۔۔ کیا ہوا کچھ بتاؤ بھی۔ کیا ہو گیا ہے۔"
رافیہ نے رندھی سی آواز میں کہا تو ہنی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ رافیہ کے سنبھالنے کے باوجود ہاتھوں سے نکل چلی گئی۔
رافیہ نے اسے بیڈ پر ڈال دیا۔ وہ تقریباً" تقریباً" بے ہوش ہو چکی تھی۔
بھاگم بھاگ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ سہیل دوڑا آیا۔ نوکر چاکر اکٹھے ہو گئے۔ سارے گھر میں افراتفری اور بے چینی پھیل گئی۔
ہنی کی بے ہوشی کسی ذہنی صدمے کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ سکون آور انجیکشن دیئے اور ضروری ہدایات دے کر چلا گیا۔
ہنی کو اس انکشاف کا دکھ بھگتنا پڑا۔ جب ہوش میں آئی تو اس کے لبوں پر وہی سوال تھا۔ "میں کون ہوں۔"
اور جب پیار دلار اور ممتا لٹا کر رافیہ نے اس سے ساری بات پوچھی تو اس کا دل بھی دھک سے رہ گیا۔ لیکن اب اس سے یہ بات چھپانا ممکن ہی نہ تھی۔۔۔ رافیہ نے اس کا سر گود میں رکھ کر پیار کیا۔ سہیل نے بھی اسے سینے سے لگا لیا۔۔۔ ہر ممکن طریقے

سے دونوں اس کی دلجوئی کرتے رہے۔
لیکن
اس کا یہی سوال تھا۔
"میں کون ہوں؟"
دونوں کو حقیقت کے رخ سے پردہ ہٹانا پڑا۔۔۔ انھوں نے ساری کتھا اسے سنا ڈالی۔۔۔۔۔۔ ان کا

خیال تھا حقیقت جان کر وہ پر سکون ہو جائے گی لیکن ایسا نہ ہوا۔ وہ کئی دن تفکراّت کے سمندر میں ڈوبتی ابھرتی رہی۔۔۔ رافیہ کی ممتا کا حصار نہ ہوتا تو شاید وہ محروم اور ناکام ہو کر خود کشی بھی کر لیتی۔ اس کی حالت مخدوش رہی کوکھ سے جنم دینے والی ان دیکھی ماں کے لیے کبھی اس کا دل تڑپ اٹھتا اور کبھی گود لے کر پالنے والی ماں پر پیار آ جاتا۔ کبھی فقیرنی ماں کے لیے اس کے دل میں رحم و کرم جوش مارنے لگتا۔ کبھی نفرت بھر جاتی۔ وہ دل ہی دل میں اسے کوسنے لگتی کہ پالنے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تو جنا ہی کیوں؟ ایسے میں اس کا جی چاہتا ملتان جائے اور سارے بھک منگوں کو اکھٹا کر کے اس عورت کو تلاش کرے جس نے چند سکّوں کے عوض جگر کے ٹکڑے کو بیچ ڈالا تھا۔ پھر اس عورت کا منہ نوچ لے۔ اس کا گلا دبا دے۔ اور جب وہ اس کی مار پھٹکار کھا کر دم توڑنے لگے تو اس کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ماں ماں پکارنے لگے۔

ہنی کا رشتوں پر سے اعتبار ہی اٹھ گیا۔ رافیہ کے پیار اور محبت کی وہ قائل تھی۔ لیکن یہ بھی دکھاوہ لگتا تھا۔ رافیہ نے ایک غریب بچی کو اس لیے تو سہارا نہیں دیا تھا کہ اسے غربت کی ہولناکیوں سے بچا سکے۔ اس نے تو اپنی تسکین، اپنی تڑپتی ممتا کو سکون دینے کے لیے اسے حاصل کیا تھا۔ اپنے شوہر کی محرومی پر بچے کی چھاپ لگا کر اسے مطمئن کرنے کے لیے ایسا کیا تھا۔

وہ کئی دن اپنی ہی من بھلیوں میں بھٹکتی رہی۔ صرف یہی صدمہ ہوتا تو شاید جلدی حواس میں لوٹ آتی۔

لیکن اس نے تو اس حوالے سے حسن رضا کو کھویا تھا۔

حسن رضا۔۔

جو اس کی محبت تھا، پیار تھا، یقین تھا۔ بھروسا تھا۔ اعتماد تھا۔

رشتوں پر سے اس کا اعتماد کیسے نہ اٹھتا۔

کئی ماہ ہنی کے اس چوٹ کو سہلانے میں لگے۔ یہ بھی قدرت کا کرشمہ ہی ہے کہ زخم مندمل ہو جاتے ہیں ورنہ

چوٹ لگتی ہے، زخم بنتا ہے، خون بہتا ہے۔ اور اگر زخم کو بار بار نہ کھرچا جائے۔ تو زخم کے منہ سے بہنے والا لہو۔ خود ہی جم کر زخم کا منہ بند کر کے کھرنڈ بنا دیتا ہے۔ لہو رک جاتا ہے، درد کی اذیت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ بات بھی ہے کہ کھرنڈ اترنے پر جو داغ پڑ جاتا ہے، یہ زخم کے ہونے کا ہمیشہ ہمیشہ احساس دلاتا رہتا ہے۔ ہنی کا زخم بھی وقت اور پیار کے مرہم سے بھر گیا تھا۔ وہ اذیت نہ رہی تھی، درد تھم گیا تھا۔ وہ زندگی کی طرف بھرپور طریقے سے نہ سہی۔ پھر بھی لوٹ آئی تھی۔

لیکن

زخم کا داغ اپنی جگہ موجود تھا اور ہنی کو اس اذیت کا مسلسل احساس دلاتا رہتا تھا۔ جس سے وہ گزری تھی۔ اسی لیے اس کی طبیعت میں جو شوخی اور چلبلا پن تھا، وہ ختم ہو گیا تھا۔ نہ شوخی، نہ شرارتیں، نہ مستانہ روی، نہ زیادہ بول چال۔۔۔ بس جی رہی تھی۔۔۔ کہ سانس آتے رہیں تو جینا پڑتا ہے۔

اس نے زیادہ توجہ پڑھائی کی طرف دینا شروع کر دی۔ ساری سرگرمیاں بھول کر وہ پڑھنے میں کھو گئی۔۔۔ کھوئے بنا چارہ بھی تو نہیں تھا۔ حسن رضا کو بھلانے کے لیے اپنا آپ بھلانا تھا۔ اس کا اپنا حسن رضا ہی تو تھا۔

ھر

برس پر برس بیت گئے۔

ہنی نے ایم اے کر لیا۔۔۔ اب وہ بظاہر مطمئن نظر آتی تھی۔ سہیل اور رافیہ سے رویہ بھی سعادتمند بیٹی کا سا تھا۔۔۔

ہنی کے لیے کئی رشتے آ رہے تھے۔ رافیہ چاہتی تھی۔ کسی اچھی اور بھروسے کی جگہ اس کا رشتہ طے کر دے۔۔۔ ہنی سے اس نے کئی بار پوچھا۔ کئی بار سمجھایا۔ وہ لاتعلق سی رہی۔

"مماجو مناسب سمجھیں کریں۔مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ کہتی۔

"پھر بھی جانی۔۔۔اب تم سمجھدار ہو۔کچھ تو کہہ سکتی ہو۔"

"کہنے کو کچھ بھی نہیں ہے مما۔۔۔۔آپ جو کچھ بھی کریں گی،میری اچھائی اور بہتری ہی کے لیے کریں گی نا۔"

ہنی کا جی بھی شاید ماحول کی یکسانیت سے اوبھ گیا تھا۔تبدیلی بہر حال خوشگوار ہوتی ہے۔اس نے شادی سے انکار نہیں کیا۔

ہاں اپنی پسند کا کچھ نہیں بتایا۔

پسند کا بتاتی بھی کیا۔

پسند بار بار بدلی تو نہیں جاتی۔دل نے جسے پسند کیا تھا۔۔وہی ساتھ چھوڑ گیا تھا۔اب اس لفظ کی اہمیت ہی کہاں رہ گئی تھی۔

رافیہ اور سہیل کو آنے والے رشتوں میں سے قمر درانی کا رشتہ موزوں اور مناسب لگا۔قمر درانی انجینئر تھا۔اور ایک مشہور انجینئرنگ کمپنی میں معقول مشاہرے پر کام کر رہا تھا۔شکل و صورت اچھی تھی،قد کاٹھ کا اچھا تھا۔خاندان امیر کبیر نہیں تھا،پھر بھی خوشحال تھا۔دو بہنیں اور تین بھائی شادی شدہ تھے۔باپ فوت ہو چکا تھا،ماں زندہ تھی۔رکھ رکھاؤ

والے لوگ تھے۔ساکھ اچھی تھی۔

قمر کی ماں بہنوں اور بھائیوں نے ہنی کو پسند کیا تھا۔قمر نے بھی اسے دیکھا۔ہنی بے جان جذبوں سے ان سب سے ملی۔اسے لڑکی کی شرم و حیا پر محمول کیا گیا تھا۔

رشتہ طے ہوا۔

اور

پچھلے سال کے آخری مہینوں میں شادی طے ہو گئی۔

رافی خوشی خوشی تیاریوں میں لگ گئی۔سسرال والے بھی مصروف ہو گئے۔

پھر

شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی۔ہنی دلہن بن کر میکے کی دہلیز پار کر کے سسرالی گھر میں آ گئی۔اس کا سواگت شایان شان طریقے سے کیا گیا۔۔سر تا پا سونے اور ہیرے موتی میں لدی دلہن بھلا کس کے من کو نہ بھاتی۔وہ جہیز بھی تو اتنا لائی تھی کہ گھر میں رکھنے کی جگہ نہ رہی۔جہیز تو معمولی چیز تھی۔۔۔سہیل ملک اور رافیہ کا جو کچھ تھا،ہنی ہی کا تو تھا۔رافیہ نے ان لوگوں کو بتا دیا تھا۔بچی لے پالک ہے لیکن قانونی طور پر اپنائی گئی ہے۔

ہنی حجلہ عروسی میں پھولوں سے لدے بیڈ پر بیٹھی تھی۔سرخ کامدانی ٹشو کا لباس زیب تن تھا۔زیوارت سے لدی تھی،خوشبوں میں نہائی تھی۔۔۔پاؤں میں بھی سونے کی جھانجھریں پہنے تھی۔دلہن بن کر اس سیج پر اترنا اگرا سے اچھا نہیں،تو برا بھی نہیں لگا تھا۔زندگی تبدیلی کی خواہاں تھی،سو وہ آ گئی تھی۔اب اسے ماضی کو بھول کر حال کو اپنانا تھا،جس نے اس کا ہاتھ عمر بھر کے لیے تھاما تھا،اس سے پورے خلوص اور چاہت سے پیش آنا تھا۔حسن رضا اس کا نہیں بن سکتا تھا۔اب قمر درانی کو اپنا بنانا تھا،پوری سچائی سے اس رشتے کی لاج رکھنا تھی۔

اور یہ سچائی اور خلوص

اس بات کے متقاضی تھے کہ وہ آج کی پہلی ملاقات ہی میں قمر کو اپنے متعلق سب کچھ بتا دے۔وہ جانتی تھی کہ مما اور پاپا نے ان لوگوں کو بتا دیا ہے کہ وہ ان کی گود لی ہوئی بیٹی ہے،جو قانوناً ان کے ورثے کی اکلوتی مالک

ہے۔

لیکن

وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مما اور پاپا نے ان لوگوں کو ہرگز نہیں بتایا ہوگا کہ وہ ہے کون اور آئی کہاں سے تھی۔۔

ہنی نے عزم کر لیا تھا کہ وہ قمر درانی سے کچھ نہیں چھپائے گی۔ سب کچھ بتا دے گی۔ تاکہ آئندہ زندگی کی اساس سچائی اور خلوص پر اٹھے۔ کوئی پردہ نہ رہے، کوئی راز نہ رہے۔

راز اور پردے داریاں دل دہلاتے رہتے ہیں۔ ہنی اس خوف کو ہمیشہ کے لیے دامن گیر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

اب وہ قمر دارنی کی ہو کر باقی زندگی سکون سے گزارنے کی طلب رکھتی تھی۔

قمر درانی کمرے میں آیا تو ہنی کا دل بے اختیاری سے دھڑک اٹھا۔ لیکن کسی جذباتی دھارے پر بہہ جانے سے پہلے اس نے مناسب سمجھا کہ سچائی کا ڈھکا چہرہ بے نقاب کر دیا جائے۔

چنانچہ

جب

قمر درانی نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے اسے گمبھیر آواز میں پکارا۔

تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔۔۔ چہرہ قدرے اونچا کرتے ہوئے اس نے قمر درانی کو دیکھا اور آہستگی سے بولی۔

"قمر صاحب آپ کے علم میں ہے۔۔۔ کہ میں۔۔ سہیل ملک کی۔۔۔"

"بیٹی نہیں ہیں۔ بلکہ انہوں نے آپ کو گود لیا ہوا ہے۔" قمر نے اس کی بات ہلکی سے مسکراہٹ سے پوری کر دی۔

"کہاں سے لیا ہوا ہے؟۔۔ یہ بھی بتایا تھا انہوں نے۔۔۔" وہ رک رک کر بولی۔

"کہاں سے لیا ہوا ہے؟۔۔۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ اسی انداز میں سر جھکائے جھجکے لہجے میں بولی۔

"تم سہیل صاحب کی لے پالک ہو۔۔۔۔۔۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں۔۔۔" وہ کچھ پریشان سا ہو رہا تھا۔

"ہاں وہ بے اولاد تھے۔۔۔ اس لیے بچہ ان کی ضرورت تھی۔۔۔" وہ سر گھٹنوں پر رکھتے ہوئے مدھم آواز میں بولی۔

"ہاں تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

قمر درانی اب کچھ زیادہ ہی سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ انہوں نے جلدی سے کہا۔ "آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"میں سچائی سے اپنی اصلیت کا اقرار کرنا چاہتی ہوں تاکہ ازدواجی زندگی کا بندھن خلوص کے دھاگوں سے باندھا جا سکے۔" اس نے آہستہ لیکن بے دھڑک لہجے میں کہا۔

"مطلب کیا ہے آپ کا۔۔۔ پلیز صاف صاف بتائیے۔" وہ جلدی سے بولا۔

ہنی نے صاف صاف ہی بتا دیا۔ اپنے اصلی والدین کے بارے میں، جنھوں نے اسے سہل ملک اور رافیہ کے ہاتھوں بیچا تھا۔

"فقیرنی کی بیٹی۔۔۔ بھک منگوں کی اولاد۔۔۔" قمر درانی نے ہنی کی طرف دیکھ کر بے اعتباری سے کہا

تو

ہ صداقت اور سچائی کی طاقت پر پورا یقین رکھتے ہوئے دھیرے سے سر ہلاتے ہوئے ہولے سے مسکرا دی۔

قمر درانی نے کئی بار بے یقینی سے اسے دیکھا۔

ہر بار اس نے تسلیمی انداز میں سر ہلا دیا۔

تو

وہ اک جھٹکے سے اٹھا۔۔۔ "یہ بات تمہارے والدین نے مجھے پہلے کیوں نہ بتائی۔ تم اب بتا رہی ہو۔ سمجھتی ہو

کہ شکار پھانس لیا ہے۔اس لیے اب بتانے سے کچھ نہیں بگڑے گا۔۔۔میری ماں نے میری پسند کا رشتہ اس لیے نہ کیا تھا کہ عمرانہ کا حسب نسب انہیں پسند نہ تھا۔لیکن تم۔۔۔تم۔۔۔فقیرنی کی بیٹی۔۔۔بھک منگوں کی اولاد۔۔۔کون جانے کی باپ کا رشتہ تھا بھی یا نہیں۔۔۔اس طبقے میں شرافت اور پاکیزگی۔۔۔اونہہ۔۔۔"وہ غصے میں پھنکارتے ہوئے بہت کچھ کہتا رہا۔"عمرانہ، عمرانہ۔"کی پکار اس کے ہر جملے میں تھی۔

پھر وہ جھنجلا کر چھپر کھٹ سے ہٹا۔دھچکے سے بیڈ زور سے ہلا۔اور جگمگاتی اصلی اور مصنوعی پھولوں کی کئی لڑیاں ٹوٹ گریں۔

وہ بھناتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

ہنی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔جب کمرا قمر کے ساتھ آنے والی ماں بہنوں اور رشتے داروں سے بھر گیا تو ہنی کو کوئی چہرہ صاف نظر نہ آیا۔۔اس کے کانوں میں بھنبھناہٹیں اتر رہی تھیں، جن میں قمر کی آواز قدرے واضح تھی۔کہ وہ شاید کہہ رہا تھا۔

"دیکھ لیا اچھی طرح حسب نسب۔۔کر لو اپنے شریف خون میں حرامی خون کی ملاوٹ۔۔۔۔عمرانہ پسند نہ آئی تھی۔کہ اس کی ذات اونچی نہ تھی۔دیکھ لو اب۔"

وہ پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہا تھا۔۔۔باقی لوگ جانے کیا کہہ رہے تھے۔ہنی تو

اندھیروں میں اترتی جا رہی تھی۔سچ کا زہر اس کی حیات کی رگوں میں اتر رہا تھا اور یہ زہریلا سچ اس کی زندگی کی ہر خوشی اور طمانیت کو موت کی نیند سلا رہا تھا۔

صبح

جب نکھرے ہوئے چمکدار سویرے نے جنم لیا

ہنی کی دنیا اندھیروں کی لپیٹ میں آچکی تھی۔

قمر درانی نے

اسے

طلاق دے دی تھی۔

حق

وہ سب ہسپتال کے ٹھنڈے یخ بستہ برآمدے میں آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑے تھے۔نازیہ کا اسٹریچر ابھی یہاں سے گزر کر اندر گیا تھا۔وہ بے حد نڈھال ہو رہی تھی۔اس کے پھولے ہوئے پیٹ پر ہسپتال کا کمبل تھا۔اس کے تراشیدہ بال باندھنے کے باوجود بکھرے ہوئے تھے۔ہونٹ خشک تھے اور سرمگیں آنکھوں میں تشنج کا سا کرب تھا۔اس کی ماں نے اس کی پیشانی چوم کر تسلی دی تھی۔

"حوصلہ رکھو بیٹی! خدا تمھیں اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"ماں کی آواز بھرا گئی تھی۔

اور وہ جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کمر موڑ کر ستون کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی تھیں۔ان کے آنسو آنکھوں سے گالوں پر لڑھک آئے تھے اور انہوں نے ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف نمناک آنکھوں سے دیکھتے ہوئے دعا کی تھی۔

"میرے مولا۔میری بچی کا تو ہی حافظ و ناصر ہے۔۔۔"اور پھر وہ زیر لب قرآنی آیات پڑھتے ہوئے بیٹی کو تصور میں لا کر اس پر پھونکنے لگی تھیں۔

نازیہ کی ساس قدرے پرے ہٹ کر پتھر کے بینچ پر بیٹھی تھیں۔انہوں نے سفید گرم شال کی بکل مار رکھی

تھی۔ پریشانی ان کے چہرے سے بھی ہویدا تھی۔ لیکن یہ پریشانی نازیہ کی صحت اور زندگی سے متعلق کم اور اس بچے کے متعلق زیادہ تھی، جو نازیہ کے بطن سے بزریعہ آپریشن اس دنیا میں وارد ہونے والا تھا۔ بینچ کی پشت پر کھڑی اس کی رشتے

کی بہن اسے بار بار تسلیاں دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"حوصلہ رکھو آپا! اس طرح پریشان ہونا تھا تو گھر پر ہی رہ جاتیں۔ میں تو یہ کہتی ہوں۔ اب بھی چلی جائیں گھر۔۔۔ ابھی تو نازیہ کو لے کر گئے ہیں۔ آپریشن ہوتے بھی دیر لگے گی۔"

"نہیں حسنہ۔ میں یہاں ہی ٹھیک ہوں۔ بس دعا کرو۔ اس بار تو خوش خبری سننے کو ملے۔"

"خوش خبری ہی ملے گی۔ اس دفعہ آثار بتاتے ہیں کہ نازیہ کے بیٹا ہی ہوگا۔"

"ہوگا جب ناں۔"

"اب تھوڑا ہی وقت رہ گیا ہے۔ دعا گو رہیں۔ نازیہ کی بھی خیر ہو۔ اور بچے کی بھی۔"

دونوں باتیں کر رہی تھیں۔ گاہے گاہے چونک جاتیں۔ نرسیں ادھر ادھر بھاگم بھاگ آجا رہی تھیں۔ نازیہ سے پہلے جو عورت اندر لے جائی گئی تھی۔ اس کا بھی کیس سیریس تھا۔ اس کے ساتھ آنے والے بھی برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ کچھ سامنے لان میں ٹھنڈی بینچوں پر جا بیٹھے تھے۔ ہر برآمد ہونے والی نرس کی طرف وہ لوگ اس طرح لپکتے، جیسے لوہا مقناطیس کی طرف لپکتا ہے۔ نرسیں کبھی مسکرا کر، کبھی سخت سی نگاہ ڈال کر اور کبھی۔ "پلیز انتظار کریں۔" کہہ کر آگے بڑھ جاتیں۔ مشہور گائناکالوجسٹ ڈاکٹر مسز ارشاد احمد اندر تھی اور اس کی مدد کے لیے ڈاکٹر افتخار بھی اندر موجود تھا۔

سہیل رضا بھی آپریشن تھیٹر کے باہر ستون کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ وہ کبھی لان میں اتر جاتا اور کبھی برآمدے کے ٹھنڈے ستون سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس نے بے تحاشا سگریٹ پھونک ڈالے تھے۔ اس کے اندر

اضطراب تھا، جسے وہ بڑی کوشش سے باہر آنے سے روک رہا تھا۔ ابھی ابھی جب نازیہ کو اندر لے جایا گیا تو وہ اس پر جھکتے ہوئے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر بولا تھا۔

"نازیہ فکر مند نہیں ہونا۔۔۔ جو کچھ ہوگا، اللہ کی رضا سے ہوگا۔ تم ساری ٹینشن ذہن سے نکال دو۔"

نازیہ کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تھے۔ اور آنسو اس کی کنپٹیوں سے ہوتے ہوئے بالوں میں رس گئے تھے۔ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دباتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اسٹریچر نرسیں کھینچ کر لے گئی تھیں۔ رضا ہولے ہولے سر ہلاتے ہوئے۔۔۔ اسے اشاروں سے اس وقت تک تسلی دیتا رہا، جس وقت تک اسٹریچر پر پڑی نازیہ نظر آتی رہی تھی۔ اور جالی دار دروازوں کے پیچھے گم نہیں ہو گئی تھی۔

سہیل رضا کی بے چینی اور اضطراب دیدنی تھا۔ لیکن وہ بڑی ہمت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس نے نازیہ کی امی سے کہا تھا۔

"آنٹی۔ آپ بیٹھ جائیے۔ میرے خیال میں تو سب لوگ اندر چلے جائیں۔ یہاں کافی ٹھنڈ ہے۔ شام اترنے والی ہے۔۔۔ اندر ویٹنگ روم میں ہیٹر جل رہے ہیں اور فضا خوشگوار حد تک گرم ہے۔"

نازیہ کی امی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔۔۔ "نہیں بیٹے میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

وہ اپنی ماں کو بھی یہی کہہ رہا تھا۔ لیکن وہ بھی پتھر کے بینچ پر بیٹھی رہیں۔ نہ ہی حسنہ خالہ وہاں سے ہلیں۔ رضا خود بھی اندر نہیں گیا۔ وہیں سگریٹ پھونکتا اور بار بار سر اٹھا کر جالی دار دروازے کو تکتا رہا۔

سہیل رضا ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جہاں آرا بیگم جوانی ہی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ ان کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا۔ مرنے والے نے پندرہ مربع اراضی، گاؤں کی بڑی حویلی اور شہر کی کوٹھی کے علاوہ کافی بینک بیلنس اور سونا موتی چھوڑا تھا۔ بچے کی صحیح تعلیم و تربیت

کے لیے جہاں آرا بیگم گاؤں سے شہر آگئی تھیں۔ زمینوں کی دیکھ بھال اور انتظام کے لیے کارندے موجود تھے۔ جدی پشتی نوکر بھی تھے اور دور پار کے غریب رشتے دار بھی۔ معاملہ خوبی سے طے ہوا تھا اور خوبی سے چل رہا تھا۔ جہاں آرا کو زمینوں سے اتنا کچھ مل جاتا کہ ضرورتوں سے کہیں زیادہ ہوتا۔ زندگی شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے گزر ہو رہی تھی۔

سہیل رضا تعلیم میں واجبی سا تھا۔ پھر بھی اس نے لاء کر لیا۔ یہ ڈگری کام سے زیادہ اعزاز کے لیے تھی۔ کبھی کبھی وہ کیس لے لیا کرتا تھا۔ زیادہ وقت دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح، شکار اور دیگر مصروفیات میں گزرتا۔ زمین کی دیکھ بھال بھی اب اسکے ذمے تھی۔

سہیل رضا تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا۔ نوجوانی کی دل چھینک قسم کی شوخیاں بھی کر لی تھیں۔ بیشتر اس کے کہ یہ شوخیاں شرارتیں سنجیدگی کا رنگ اختیار کرتیں، جہاں آرا نے اس کی شادی کرنا مناسب سمجھا۔ گو وہ ابھی اس مستقل بندھن میں بندھنے کو تیار نہ تھا۔ لیکن جہاں آرا اب ذہنی طور پر تیار تھیں۔

"اتنی جلدی بھی کیا ہے امی!" وہ اکثر ماں سے کہتا۔

"جلدی ہے۔" ماں جواب دیتیں۔

"کیوں؟"

"یہی عمر ہوتی ہے گھر بسانے کی بیٹا!"

"چھوڑیں امی۔ دو چار سال اور سکھ کا سانس لینے دیں۔"

"تجھے؟"

"مجھے بھی اور خود بھی سکھ کا سانس لیں۔ بہو آگئی تو زندگی اس طرح آسودگی سے تھوڑا ہی گزرے گی آپ

کی۔"

"چل ہٹ بڑا آیا۔ میں بہو ہی ایسی لاؤں گی۔ جو تیری تابعداری سے زیادہ میری تابعداری کرے گی۔"

"مارے گئے۔"

"ڈھونڈ رہی ہوں کوئی ایسی ہی لڑکی۔"

"دبو قسم کی۔"

"یہی سمجھ لے۔"

"حد ہو گئی امی!"

"کیوں؟"

"لوگ لڑکی تلاش کرتے ہیں۔ صورت دیکھتے ہیں۔ خاندان دیکھتے ہیں۔ اور آپ۔۔"

"بہت باتیں نہیں بنا۔"

"چلئے ٹھیک ہے۔ جو آپ کی مرضی، وہ ہماری۔۔۔۔"

"آگیا نا راہ پر۔"

"وہ تو سدا سے ہی آیا ہوا ہوں۔ اپنی پیاری پیاری امی کا کہا ٹالنے کی کہاں مجال ہے۔"

رضا کو واقعی امی کا کہا ٹالنے کی مجال نہ تھی۔ "برخورداری۔" قسم کے جراثیم اس میں ضرورت سے زیادہ ہی تھے۔ شاید یہ جہاں آرا کی تربیت کا اثر تھا۔ یا اکلوتے ہونے کا۔ باپ کو اس نے دیکھا نہیں تھا۔ ماں ہی نظر آتی تھی۔ جو پیار کی پھواریں نہیں، آبشاریں اس پر بہاتی تھی۔ اس لیے وہ ماں کے بہت ہی قریب تھا۔

۔۔۔ عدولی حکمی تو کرنا جانتا ہی نہ تھا۔ اپنے فیصلوں میں بھی وہ بااختیار نہ تھا۔ ان میں بھی دل امی کو دخیل پاتا تھا۔ اور امی کا دخیل ہونا اس کی پسند ناپسند سے ماورا تھا۔ یہ بات اسے بری کبھی نہ لگی تھی۔ بلکہ وہ کافی حد تک

اس کا عادی وہ ہو چکا تھا۔

اسی لیے جب جہاں آرا اس کی شادی کے متعلق سنجیدہ ہوئیں اور لڑکی تلاش کرنے کا کام

زوروں سے شروع ہوا تو باوجود چاہنے کے وہ امی سے اپنی پسند کا نہ کہہ سکا۔ اور نہ ہی اصرار کر سکا کہ وہ شادی چند سال کے بعد کرے گا۔

امی راضی، تو وہ بھی راضی۔

نازیہ کو جہاں آرا نے ایک سہیلی کے بیٹے کی شادی میں دیکھا تھا۔ اب تک وہ درجن بھر لڑکیاں انتخاب کی کسوٹی پر پرکھ چکی تھیں۔ اچھے خاندانوں کی اچھی اچھی لڑکیاں۔ اعلی تعلیم یافتہ، کم تعلیم یافتہ اور بڑے بڑے جہیز لے کر آنے والی اسمارٹ لڑکیاں۔ جن کے والدین کے سوشل کونٹیکٹ بھی قابل ذکر تھے۔

لیکن جہاں آرا بیگم ان میں سے کسی کے حق میں بھی حتمی فیصلہ نہ دے سکی تھیں۔ کسی کی کوئی بات اچھی نہ لگی۔ کسی کی کوئی۔ کسی کا بے دھڑک ہنسنا بولنا پسند نہ آیا۔ کسی کی نظریں تیز لگیں۔ کوئی زیادہ ہی خود اعتماد دکھائی دی۔ کسی میں خاندانی اکڑ کا شائبہ گزرا۔

نازیہ کو دیکھا تو فیصلہ آپوں آپ ہو گیا۔ یہ کم گو اور صورت شکل کی اچھی تھی۔ اس میں نہ تو اکڑ محسوس ہوئی، نہ ہی بے جا خود اعتمادی کا احساس ہوا۔ کچھ دبی دبی قسم کی لڑکی محسوس ہوئی۔ ان کے دل نے کہا، اسی کی تلاش تھی۔

چنانچہ انہوں نے پاس بیٹھی نصرت ذکا سے، جن کو چند لمحے پہلے نازیہ نے آکر کسی خاتون کا پیغام دیا تھا۔ پوچھا۔

"یہ بچی کس کی ہے؟"

"کون؟" بیگم نصرت ذکا نے پوچھا۔

"وہ جو ابھی آپ کے پاس آئی تھیں۔"

"میری بھتیجی ہے۔"

"بہت پیاری ہے۔۔۔۔۔"

"جی۔۔۔۔ بہت پیاری اور سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔"

جہاں آرا نازیہ کے متعلق جس انداز میں سوال کر رہی تھیں، اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ جہاں آرا کا منشا کیا ہے۔ اسی لیے نصرت نے نازیہ کی ضرورت سے زیادہ ہی تعریفیں کر ڈالیں۔

"ہماری بھابھی بہت اچھی خاتون ہیں۔ تینوں بیٹیوں کی تربیت انہوں نے اسی طور پر کی ہے۔ بڑی دونوں شادی شدہ ہیں۔ ان کے سسرال والوں سے پوچھیں، کتنی اچھی طرح گزر کر رہی ہیں۔ دونوں ساس سسر کی تابعدار ہیں۔ سر سے طوفان گزر جائیں، اف نہیں کرتیں۔ بڑی والی نے تو جس طرح سسرال میں گزارا کیا ہے، مثال نہیں ملتی۔ اس کے سسرال والے اجڈ سے لوگ ہیں۔ ساس تو خاصی لڑاکا ہیں، میاں بھی اکھڑ قسم کا ہے۔ اور کوئی ہوتی تو کب کی علیحدہ ہو چکی ہوتی۔ لیکن آفرین ہے اس پر، سہے جا رہی ہے۔ اف نہیں کرتی۔ جب ملے گی۔ کوئی گلہ شکوہ نہیں اسے۔۔۔۔"

جہاں آرا بیگم نصرت ذکاء کی باتیں سنتے ہوئے نازیہ کو اپنے سانچے میں ڈھلتے دیکھ رہی تھیں۔ اسے ایسی لڑکی ہی تو چاہیے تھی۔۔۔ جو نباہ کر سکے۔ جو اتنی تیز و طرار نہ ہو کہ اس کے بیٹے ہی کو ہتھیا لے جائے۔ جو رضا سے زیادہ اس کا کہا مانے۔ جو ساس کے دبدبے میں ساری عمر جکڑی رہے۔

جہاں آرا بیگم نازیہ کی امی سے بھی ملیں۔ ان کی متاثر کن شخصیت سے وہ خاصی مرعوب ہوئیں۔ چہرہ انسان کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس تصنع اور وضع داری کے لبادوں میں نہ چھپایا جائے تو صاف ستھرا اور سچا عکس

دکھاتا ہے۔نازیہ کی امی کو دیکھ کر جہاں آرا کو اس سچائی کا بخوبی اندازہ ہوا تھا۔نصرت ذکا نے اس کی جھوٹی تعریفیں نہیں کی تھیں۔

نازیہ کو اس نے رضا کے لیے پسند کر لیا۔پھر بھی اپنے طور پر ان لوگوں کا پتا کروایا۔رپورٹیں حوصلہ افزا ملیں۔نازیہ کے والد بڑے شریف اور منکسر المزاج آدمی تھے، تھوڑی بہت زمین تھی۔جسے بیچ کر یہاں ایک چھوٹی سی فیکٹری لگالی تھی۔ گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔بچوں کی تعلیم اور تربیت کا بہت خیال رکھا تھا۔دونوں بیٹے بھی پڑھ لکھ کر برسر روزگار ہو گئے تھے۔دو بیٹیاں بی اے کرنے کے بعد بیاہ دی تھیں۔نازیہ باقی تھی۔ اس کے لیے بھی رشتے آرہے تھے۔وہ ان دنوں بی اے فائنل میں تھی۔کالج کی مقبول ترین لڑکی تھی۔بڑی صلح جو اور امن پسند طبیعت تھی اس کی۔فائن آرٹ میں دلچسپی تھی۔موسیقی سے لگاؤ تھا۔مصوری، شاعری سبھی میں دلچسپی لیتی تھی۔یہ اس کے ہنسنے کھیلنے کے دن تھے۔لیکن وہ عام چھچھوری لڑکیوں کی طرح نہیں تھی۔طبیعت میں سلجھاؤ تھا۔حالات سے نمٹنے کی صلاحیت تھی۔ایسی لچکیلی لڑکیاں کسی بھی ماحول میں اپنے آپ کو جذب کر لیتی ہیں۔یہ سوکھی مکئی کے دانوں کی طرح ہوتی ہیں، جو بھٹی کی آنچ سے تپتی ریت پر لوٹتے ہیں۔تو کھل کھلا کر پھول بن جاتے ہیں۔جلتے ہیں، نہ جھلس جاتے ہیں۔

جہاں آرا مطمئن ہو گئی تو باقاعدہ رشتہ لے کر ان کے ہاں جا پہنچیں۔گو یہ لوگ مالی لحاظ سے ان کے ہم پلہ نہیں تھے۔پھر بھی سفید پوشی کا بھرم بڑے سلیقے سے نباہ رہے تھے۔جہاں آرا نے دست سوال پھیلایا۔ جو لوٹایا نہیں گیا۔چند دنوں کی مہلت ضروری مانگی گئی۔پھر اپنی تسلی ہو جانے پر نازیہ کو ان سوالیوں کو سونپ دیا گیا۔

شادی دھوم دھام سے ہوئی۔

سہیل رضا نے جب گھونگھٹ الٹا تو امی کی پسند اور انتخاب کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔تیکھے نقوش، سرمگیں

آنکھوں والی نازک سی نازیہ دل میں اتر گئی۔اس نے بہت لڑکیاں دیکھی تھیں۔کچھ سے قربتیں بھی مہکائی تھیں۔کچھ سے فلرٹ کیا تھا۔کچھ کو تو دور

دور ہی صرف نامہ و پیام کی حد تک دیکھا تھا۔

لیکن

جو کشش اس سلونی سی نازیہ میں محسوس ہوئی، وہ ایک نیا تجربہ تھی۔اسے لگ رہا تھا۔محبت اس کے من میں ابھی تک بند بیج کی طرح تھی۔جو مٹی میں ہلائے جلائے بنا پڑا رہے تو چٹکتا ہے، نہ کھلتا ہے۔بس پڑا رہتا ہے اور اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔پر اب اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ بیج اچانک ہی پھوٹ نکلا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی جڑیں دھرتی کے اندر پوری قوت سی پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔جکڑے جا رہی ہیں۔

رضا بھی نازیہ کو اچھا لگا۔چوڑا چکلا، گورا چٹا نوجوان۔۔۔۔۔جو بڑے دھیمے لہجے میں باتیں کرتے ہوئے اس کے کانوں میں رس اتار رہا تھا۔۔زندگی شاید اس کا سراغ پانے کو بے تاب تھی۔اس کی متمنی تھی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا تھا۔

اور

دونوں ہی کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

"میں کتنا خوش قسمت ہوں نازیہ۔"وہ سرشار لہجے میں کہتا۔

"میں آپ سے زیادہ خوش نصیب ہوں۔جو آپ جیسا شوہر اور امی جیسی ساس ملی۔"وہ کہتی۔

"اچھا جی۔۔۔۔۔"وہ اس کو بازوؤں میں بھر لیتا۔"مجھ پر تو قبضہ کیا ہی تھا۔میری امی کو بھی ہتھیا لیا مجھ سے۔"

"ہم زندگی کی تکون میں رضا۔"

"جو ایک دوسرے کی جڑ ہیں۔"

"بالکل۔"

"امی کو جیسی لڑکی چاہئے تھی۔ انہوں نے ڈھونڈ نکالی۔"

"آپ کی پسند امی جیسی نہیں تھی؟"

"اوں ہوں۔" وہ جان بوجھ کر منہ بنا کر کہتا۔

نازیہ من ہی من میں گدگدی محسوس کرتے ہوئے اٹھلا کر پوچھتی۔ "آپ کی پسند کیسی تھی جناب۔۔۔۔؟"

"اور طرح کی۔۔۔"

"کس طرح کی؟"

"بس اور طرح کی۔"

"یعنی آپ کو ایسی لڑکی چاہئے تھی۔ جو صرف آپ کی ہوتی اور آپ کی امی کو نظر انداز۔۔۔"

"نہ نہ۔۔۔۔۔۔۔نہ۔۔۔۔۔۔" وہ اسے ساتھ چمٹا کر بات کاٹ دیتا۔ "مجھے اپنی امی کی پسند پسند ہے۔ ان کی پسند پر فخر ہے۔۔۔۔۔۔نازیہ۔۔۔۔۔۔ ہم زندگی کی تکون ہیں، تکون ہی رہیں گے۔۔۔۔۔ میری امی بہت اچھی ہیں۔ تم جتنا ان سے پیار کرو گی، اس سے کئی گنا وہ لوٹائیں گی۔"

"شکریہ۔" وہ ہنس کر اس کی چھاتی میں منہ چھپا لیتی۔ "میں جانتی ہوں۔۔۔۔۔ آپ سے بہت زیادہ جانتی ہوں۔ بے فکر رہیے امی یا آپ کو کبھی شکایت نہ ہو گی مجھ سے۔"

"او۔ جیو۔۔" وہ اسے بھینچ لیتا۔ اتنی زور سے، ایسے جذبات کی شدت سے کہ نازیہ کی ہڈیاں تڑخنے

لگتیں۔۔۔۔۔ وہ پیار کی ان انتہاؤں سے مسحور ہو جاتی۔

زندگی جذباتی دھاروں پر بہہ رہی تھی۔ گنگناتی بل کھاتی رنگینوں کو دامنوں میں بھرتے سمیٹتے وقت گزرنے لگا تھا۔ ہنی مون کو مہینہ مختلف جگہوں پر گھومتے پھرتے گزرا۔

واپس آ کر دونوں گاؤں چلے گئے۔ زمینوں کے سینے پر لہلہاتی سر اٹھاتی فصلیں دیکھ کر دونوں محفوظ ہوئے۔ یہ سونا اگلتی دھرتی اپنی نئی مالکن کو ہنس ہنس کر خوش آمدید کہہ رہی تھی۔۔۔۔ نازیہ بہت خوش تھی۔

وقت خوشیوں کے سنگ اڑے تو اس کی طوالتیں بھی مختصر لگتی ہیں۔ شادی کو چار ماہ گزر گئے۔ اور پتہ بھی نہ چلا۔ دونوں کو ایک دوسرے کے سوا شاید گرد و پیش کا ہوش ہی نہ تھا۔

ہاں جہاں آرا بیگم وقت پل پل گن کر گزار رہی تھیں۔ بیٹے کی شادی بڑے چاؤ اور ارمانوں سے کر کے سمجھی تھیں کہ فرض پورا کر کے فارغ ہو گئیں۔ لیکن اب انہیں محسوس ہوا کہ سینے میں تو ابھی امنگوں کا ہجوم ہے۔ ایک ننھے منے وجود کی کمی ہے۔ یہ وجود بھرپور خوشیوں کا ضامن ہے۔

پہلے بہو کی آرزو تھی۔ گھر اکیلا اور سونا لگتا تھا۔ بہو آئی تو پوتے کی خواہش نے شدت اختیار کر لی۔ وہ تو پہلے مہینے ہی سے کسی خوش خبری کی منتظر تھیں۔ اشاروں کنایوں میں نازیہ سے پوچھا تھا۔ وہ شرما لجا گئی تھی۔ دوسرے ماہ جب وہ ہنی مون سے لوٹی تھی تو جہاں آرا نے سرگوشی میں پہلا سوال ہی یہی پوچھا۔ تیسرے اور چوتھے ماہ بھی کوئی خبر نہ ملی تو جہان آرا کا دل دھک سے رہ گیا۔

دلہن کہیں بانجھ ہی نہ ہو، کہیں یہ دونوں فیملی پلاننگ تو نہیں کر رہے؟ وہ پریشانی سے سوچتیں۔ اور وہ ان کے متعلق نازیہ سے پوچھنے کا ارادہ کرنے لگیں۔

لیکن پانچویں مہینے انہیں وہ خوش خبری مل گئی، جس کا انہیں شدت سے انتظار تھا۔

نازیہ کا جی متلایا۔اس نے ناشتا کرنے کے بعد عجیب سی کیفیت محسوس کی اور میز سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف دوڑی۔ سارا ناشتا الٹ دیا۔ پھر بھی جی متلاتا ہی رہا۔

جہاں آرا نے ابکائیوں کی آواز سنی تو لپک کر نازیہ کے پیچھے گئیں۔

"کیا بات ہے نازیہ؟"

"پتا نہیں جی متلا رہا ہے۔"

"اوہ۔۔۔۔اچھا۔۔۔۔"

"ہاں امی۔۔طبیعت سخت خراب ہو رہی ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔" جہاں آرا نے مسکرا کر کہا۔ "پانچ مہینے گزر گئے۔اب خراب ہوئی ہے طبیعت۔"

"جی۔۔۔"

"گھبراؤ نہیں نازیہ۔۔۔ایسا ہوتا ہے۔"

انہوں نے نازیہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور باتھ روم سے نکال کر بیڈ تک لے آئیں۔نازیہ نڈھال سی ہو رہی تھی۔ جہاں آرا نے ہولے ہولے مسکراتے مسکراتے اس سے کچھ پوچھا۔

نازیہ نے شرماتے شرماتے ان کی باتوں کا جواب دیا تو جہاں آرا نے اس کی پیشانی چوم لی۔ "مبارک ہو۔" نازیہ کے اندر ایک انجانی سی خوشی پھیل گئی،اس نے کھلی کھلی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

جہاں آرا نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر بولیں۔ "ابھی کسی سے کہنا نہیں۔ تیار ہو جاؤ۔ میں تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔۔۔ویسے ہے خوش خبری۔"

پھر وہ انگلیوں پر دن اور مہینے گنتے ہوئے بولیں۔۔۔ "آٹھ ماہ اور نو دن بعد میرا پوتا میری گود میں ہو گا۔"

"ہائے امی۔" نازیہ شرما گئی۔

ڈاکٹری رپورٹ مثبت تھی۔ نازیہ کا پاؤں بھاری تھا۔اس کے اندر خالق نے تخلیق

کا عمل شروع کر دیا تھا۔۔۔رضا کو پتا چلا۔۔۔خوش تو وہ بھی ہوا۔ لیکن بولا۔ "اتنی جلدی ان پابندیوں میں جکڑے گئے ہم لوگ۔"

جہاں آرا بیگم سے بھی شاید اس نے یہی کہا تھا تو وہ اس کے پیچھے پڑ گئیں۔اتنا ڈانٹا کہ رضا کو کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کرتے ہوئے ماں سے معافی مانگنا پڑی۔

نازیہ کو بڑا لطف آیا۔۔۔۔۔وہ کئی دن رضا کو اس حوالے سے چھیڑتی رہی۔ "چھوٹے بچوں کی طرح امی سے ڈانٹ کھاتے ہیں۔ پہلے ہی سوچ سمجھ کر بات کیا کیجئے۔ جب آپ جانتے ہیں کہ آپ امی کی کسی بات کو رد نہیں کر سکتے،ان کے سامنے انکی مرضی کے خلاف کوئی بات نہیں کر سکتے تو پھر ایسا کرنے کی کوشش ہی کیوں کرتے ہیں۔" وہ جواباً ہنس دیا۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ جہاں آرا نازیہ کا بہت زیادہ خیال رکھتیں۔ڈاکٹر کے دیئے گئے ٹانک وغیرہ پابندی سے کھلاتیں۔ خوراک کا تو بہت ہی خیال رکھتیں۔ پھل اور دودھ بکثرت کھلاتیں۔ آرام بھی کرنے کو کہتیں۔

صبح اٹھ کر ان کا پہلا سوال ہوتا۔ "رات کو ٹھیک سے نیند آئی۔ بے آرامی تو نہیں ہوئی۔ سکون کی نیند تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ رات کو دیر تک نہیں جاگا کرو۔"

نازیہ مسکرا دیتی۔ "امی آپ یونہی پریشان نہ ہوا کریں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی تکلیف نہیں۔"

ساس اس طرح دیکھ بھال رکھتی تھیں اور اتنا خیال رکھتی تھیں۔ نازیہ جب بھی میکے جاتی، بڑے فخر سے سب کو بتاتی۔

"بڑے نصیبوں والی ہے میری بچی۔" ماں کا دل باغ باغ ہو جاتا۔

"اپنی اپنی قسمت ہی ہے نا۔ ورنہ ساس اور اس طرح جان دے۔" بہن کہتی۔

"بھئی ان کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس حوالے سے بہو کی عیش ہے۔"

"یہ بات نہیں۔ اکثر تو یہی دیکھا ہے کہ جن کا ایک بیٹا ہوتا ہے۔ وہ بہو سے زیادہ جلتی ہیں۔ دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ حسد محسوس کرتی ہیں۔"

"نازیہ بھاگوں والی لگتی ہے۔"

"ہاں بالکل۔"

"خدا نصیب اور بلند کرے۔"

"آمین۔"

نازیہ کا ہر ماہ باقاعدگی سے ڈاکٹر کے پاس چیک اپ ہو رہا تھا۔ بچہ اپنے وقت کے مطابق پل بڑھ رہا تھا۔ نازیہ کی صحت بھی اچھی تھی۔ ساس اور شوہر کی محبتوں کا بھی اثر تھا۔ اور اچھی خوراک اور ٹانکوں کا بھی۔ رضا اسے دیکھتا تو مسحور سا نظر آتا۔ اس کے بڑھتے پھولتے پیٹ پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا۔ "نازیہ! تمھارا یہ روپ کتنا پیارا ہے۔"

وہ اترا کر کہتی۔ "چھوڑیے جی۔ شکل سے بد شکل ہو رہی ہوں۔ اور آپ کہتے ہیں پیارا روپ ہے۔"

"سچ کہتا ہوں۔۔۔" وہ کہتا۔۔۔ "بہت اچھی لگتی ہو۔ ممتا کے نور نے تو ابھی سے تمہارے گرد ہالہ بنا دیا ہے۔"

اس دن بھی وہ اس کے پاس لیٹا ایسی ہی باتیں کر رہا تھا۔ ننھے منے پیارے سے بچے کی آمد کا وہ بھی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔۔۔ "کتنے دن باقی ہیں ابھی۔۔۔"

"ایک مہینہ دو دن۔۔۔" نازیہ نے کہا۔ "ڈاکٹر نے اگلے ماہ کی انیس تاریخ بتائی ہے۔ ایک دو دن اوپر تلے بھی ہو سکتے ہیں۔"

"ایک مہینے بعد ہم اس گھر کے چار فرد ہو جائیں گے۔" وہ شوق سے بولا۔

"چار۔"

"ہاں چار۔۔۔ امی میں تم اور ہمارا منا۔۔۔۔"

نازیہ مسکرا کر بولی۔ "منا ضروری تو نہیں۔ منی بھی ہو سکتی ہے۔"

"نہیں بیٹا ہی ہو گا۔"

"امی بھی یہی کہتی رہتی ہیں۔"

"ظاہر ہے سب کو بیٹے کی خواہش ہوتی ہے۔"

"جو بیٹا نہ ہوا تو۔۔۔"

"بیٹی سہی۔ ویسے پہلے بیٹا ہونا چاہئے۔ دوسری بیٹی۔ تیسرا بیٹا۔ چوتھی بیٹی۔ پانچواں بیٹا چھٹی۔۔۔"

"اللہ۔۔۔ بس بھی کیجئے۔۔۔" نازیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ پوری ٹیم بنانے کے ارادے ہیں جناب کے۔۔۔ بچے دو ہی اچھے۔"

"اوں ہوں۔۔۔ دو نہیں کم از کم چار تو ہوں۔ دو بیٹے، دو بیٹیاں۔"

"ابھی تو پہلے مرحلے سے گزر لوں۔ پھر دیکھا جائے گا۔ ویسے رضا کسی کسی وقت تو مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"کس بات سے؟"

"بچے کو جنم دیتے وقت کہیں میں مر گئی تو۔۔۔۔"

"اللہ نہ کرے۔۔۔۔" رضا نے اسے بازوؤں مس بھر کریوں ساتھ لگا لیا۔ جیسے سارے حوادثات سے

محفوظ کر لینا چاہتا ہو۔ نازیہ کو انتہائی سکون ملا۔ اسے اپنا خوف تحلیل ہوتا محسوس ہوا۔ رضا کے ہوتے ہوئے اسے کسی بات سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ رضا اس کی گود کے ارد گرد اٹھا حصار ہے۔ اس میں نقب نہیں لگ سکتی۔ اس میں دراڑ نہیں پڑ سکتی۔ کوئی حادثہ کوئی مصیبت اس حصار کو توڑ کر اس تک نہیں پہنچ سکتی۔ کتنا سکون بخشتا تھا یہ احساس۔

تناتومند تھا محفوظ ہونے کا تصور۔

نازیہ مسحور و سرشار تھی۔

پھر ایک دن جب دونوں بچے ہی کے خیال اور باتوں سے محفوظ ہو رہے تھے۔ رضا بولا۔ "بچے کا نام کیا رکھیں گے؟"

"جب تشریف لائے گا۔ رکھ لیں گے۔" نازیہ مسکرائی۔

"نہیں پہلے سوچ لینا چاہئے۔ میرا جی چاہتا ہے پہلی بار ہی میں اسے اس کا نام لے کر پکاروں۔"

"تو پھر بتایئے کوئی نام۔۔۔۔۔۔"

رضا نے دو چار خوبصورت سے لڑکوں کے نام بتائے۔

"پھر وہی؟"

"کیا؟"

"صرف لڑکوں کے نام۔ جناب والا۔ لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ لڑکے کے نام تم بتاؤ۔۔۔"

"جی نہیں۔۔۔۔۔"

"کیوں؟"

"نام امی رکھیں گی۔ پہلا حق ان کا ہے۔"

"نازیہ تم کتنی اچھی ہو۔ میری امی کی اتنی عزت افزائی۔"

"میں نے کہا نا یہ ان کا حق ہے۔ وہی نام رکھیں گی اور ہم بچے کو انہی کے دیے ہوئے نام سے پکارا کریں گے۔"

رضا ممنون ہوا۔

جہاں آرا بیگم واقعی ان دنوں نام جمع کر رہی تھیں۔۔۔۔ خوبصورت پیارے اور بامعنی نام۔ تاریخی نام۔ جیالے اور بہادر ہیروں کے نام۔۔۔۔ انہوں نے ایک فہرست مرتب کر رکھی تھی۔ رضا نے ایک دن یونہی پوچھا۔ "امی آپ نے کوئی نام سوچا؟"

تو وہ اپنی لمبی چوڑی فہرست نکال لائیں۔ آبنوسی میز پر رکھتے ہوئے صوفے پر بڑی شان سے بیٹھتے ہوئے بولیں۔ "یہ نام میں نے اکٹھے کیے ہیں۔ جو نام سب سے زیادہ پسند ہیں، ان کے نیچے لکیر لگا دی ہے۔ ان میں سے انتخاب کرنا ہے۔ یہ انتخاب بعد میں کرونگی۔۔۔"

"کب؟"

"بچے کی صورت دیکھ کر۔"

رضا جھکے جھکے فہرست دیکھنے لگا۔ نازیہ بھی ادھر ہی آ گئی۔ اس نے ایک ہی نظر میں فہرست دیکھ ڈالی۔ امی نے سارے نام لڑکوں ہی کے لکھے تھے۔ وہ ہنسنے مسکرانے کے بجائے کچھ خوفزدہ سی ہو گئی۔

جہاں آرا نے تو جیسے فرض ہی کر لیا تھا کہ لڑکا ہی ہو گا۔

لیکن

جو لڑکی ہو گئی۔

تو؟

تو کیا جہاں آرا اسے ذہنی طور پر قبول کر سکیں گی۔

نازیہ سوچوں میں ڈوب گئی۔۔اسکے کچھ کہنے سے پہلے ہی رضا بول اٹھا۔

"امی آپ نے تو سارے لڑکوں ہی کے نام لکھے ہیں۔"

"لڑکا ہی ہو گا۔۔۔۔"

"لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔"

جہاں آرا نے بیزار سی نگاہ اس پر ڈالی۔۔۔اور بولیں۔"کوئی اچھی بات بھی منہ سے نکالا کرو۔ تو ایک اکیلا ہے۔ بیٹا بازو ہوا کرتا ہے۔اس لیے بیٹا ہی ہونا چاہیئے۔"

جہاں آرا نے ایک نگاہ نازیہ پر بھی ڈالی اور مصنوعی تبسم سے کہا۔"کیوں بہو بیٹا ہو گا نا۔ تم تو میری بڑی فرمانبردار بہو ہو۔ تم نے کبھی مجھے فراموش نہیں کیا۔اب کے گستاخی نہ ہو۔۔۔۔"

نازیہ اندر ہی اندر سہم گئی۔آج اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کی ساس کی گرفت کتنی سخت ہے۔بہو کیا، وہ بیٹے سے بھی کوئی ایسی بات نہیں سنتیں جو انہیں ناپسند ہو۔

وہ کچھ نہیں بولی۔

بیٹے کی افادیت پر جہاں آرا نے خاصا لمبا لیکچر دے ڈالا، جسے رضا نے تو ہنس ہنس کر سنا۔ لیکن نازیہ نے اندر ہی اندر آنسو بہاتے ہوئے سہا۔

رضا نے ہنس کر ماں کے کندھے سے لگ کر بولا۔"چلیئے بیٹا ہی ہو گا۔ لیکن ایک نام اپنی اور نازی کی جنس کا بھی چن لیجئے۔"

"چن لیا ہے۔اگر خدانخواستہ بیٹی ہو گئی تو حنا نام رکھوں گی۔"

"چلو آپ نے نازیہ کے لیے گنجائش تو چھوڑی۔۔۔۔"

ماں بیٹے دونوں ہنس پڑے۔

لیکن

نازیہ مسکرا بھی نہ سکی۔اسے جہاں آرا پر دل ہی دل میں غصہ آ رہا تھا۔ کتنی مغرور عورت تھیں وہ، کتنے دھڑلے سے کہہ رہی تھیں کہ بیٹا ہونا چاہیئے۔خدا کے کاموں میں کون دخیل ہو سکتا ہے۔وہ جو کچھ بھی کرتا ہے۔اپنی رضا سے کرتا ہے۔بندے کی اسی میں بہتری ہوتی ہے۔بعض اوقات بندہ اس بہتری کے آثار نہیں پاتا۔بظاہر یہ بہتری نہیں

ہوتی۔ لیکن کیا پتہ جو اسے بہتری نظر نہیں آتی، وہ مالک کل اور ہر بات کے جاننے والے کو بہتری لگتی ہو۔

اس دن سے نازیہ خاصی فکر مند رہنے لگی۔دل ہی دل میں خدا سے دعائیں کرتی کہ پہلا بیٹا ہی ہو۔ پھر چاہے کتنی بھی بیٹیاں ہو جائیں۔کم از کم پہلی بار بیٹا ضرور ہو۔

دن قریب آ رہے تھے۔اور وہ اندر سے سہمی ہوئی تھی۔اس کی رنگت بھی پھیکی پڑتی جا رہی تھی اور کمزوری بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

"نازیہ! تمھیں کیا ہوتا جا رہا ہے؟" جہاں آرا بیگم کہتیں۔"ہشاش بشاش رہا کرو۔دوائیاں کھا رہی ہو۔ خوراک پوری لیا کرو۔روٹی کم اور پھل زیادہ، دودھ زیادہ کھایا پیا کرو۔بچے کی صحت پر اس طرح برا اثر نہیں پڑے گا۔بچہ صحت مند ہونا چاہیئے۔پھل اور دودھ سے بچہ گورا چٹا ہو گا۔"

نازیہ حسب عادت مؤدبانہ انداز میں کہتی۔"امی آپ فکر کیوں کرتی ہیں۔میں اپنا پورا خیال رکھتی ہوں۔تاکہ صحت ٹھیک رہے۔"

"صحت ٹھیک ہو گی تو بچہ گل گوتھنا ہو گا۔ مجھے تنومند اور خوبصورت پوتا چاہئے۔"

نازیہ چپ ہو گئی۔ دل بجھ سا گیا۔ اسے جہاں آرا بیگم انتہائی خود غرض اور ذات کے اندر گھومنے والی عورت لگیں۔ انہیں نازیہ کی نہیں، بچے کی صحت کا خیال تھا۔ اب تک وہ نازیہ کی دیکھ بھال اور ناز برداریاں بھی اسی لیے کرتی آ رہی تھیں کہ اس کی کوکھ سے اس خاندان کے وارث کے پیدا ہونے کی توقع تھی۔

ماں بیٹا دونوں ہی بیٹے کو خواہشمند تھے۔ لیکن رضا کی خواہش میں اتنی شدت نہیں تھی۔ نہ ہی جبر تھا۔ بالکل فطری سی خواہش تھی۔ جبکہ جہاں آرا تو اتنے یقین سے بات کرتی تھیں۔ اتنی سختی سے حکم صادر کرتی تھیں کہ نازیہ اندر سے ٹوٹ جاتی۔

شاید اسی تفکر اور ذہنی انتشار و پریشانی کا نتیجہ تھا کہ بچے کی ولادت نارمل نہ ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے آپریشن کرنا تھا۔ ڈاکٹروں کی تسلی و تشفی کے باوجود نازیہ بے طرح گھبرا رہی تھی۔

رضا بھی پریشان تھا لیکن اس کی محبتوں کے سہارے بڑے مضبوط تھے۔ نازیہ کی دلجوئی کرتا رہتا۔

وقت مقررہ پر نازیہ شہر کے ایک صاف ستھرے اور اچھے ہسپتال میں داخل ہوئی۔ مشہور گائناکالوجسٹ نے یہ کیس لیا تھا۔۔۔ سیزرین کیسز میں وہ ماہر تھی۔ وہ نازیہ کی تسلی کے لیے اسے بالکل معمولی سا آپریشن کہہ رہی تھی۔

"پتا بھی نہیں چلے گا۔ اور گود بھی بھر جائے گی۔۔۔ بچے کی صورت دیکھتے ہی ساری کوفت دور ہو جائے گی۔" وہ اسے پیار سے دلاسہ دیتی رہی۔ بڑی ہنس مکھ اور خوش خلق ڈاکٹر تھی۔ اس نے واقعی نازیہ کو بڑا اخلاقی سہارا دیا تھا۔

اس دن بھی ہسپتال کے برآمدے میں رشتہ داروں کا جمگھٹا تھا۔ جالی دار دروازے کے اندر جاتی اور باہر نکلتی۔ چاق و چوبند نرسوں سے نازیہ کے متعلق پوچھنے کو ہر کوئی لپکتا تھا۔ دل حلق میں اٹکے تھے۔ نازیہ کی امی

اور بہنیں تو بہت ہی پریشان تھیں۔ رضا بھی نروس ہو رہا تھا اور جہاں آرا بیگم بھی زچہ بچہ کی صحت و سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

آپریشن ہو گیا۔ نرس نے دروازے میں کھڑے کھڑے گھر والوں کو کامیاب آپریشن کا مژدہ سنایا۔

"کیا ہوا ہے؟" سب سے پہلے جہاں آرا نے بے تابی سے پوچھا۔

"بیٹی۔۔۔ مبارک ہو۔" نرس کہہ کر لوٹ گئی۔

نازیہ کی امی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "شکر ہے خدایا تیرا۔۔۔ میری بیٹی خیریت سے فارغ ہوئی۔"

"بیٹی!" جہاں آرا کو تو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا، انہوں نے رضا کا کندھا پکڑ لیا اور بولیں۔ "نرس نے کیا کہا ہے؟"

"بیٹی ہوئی ہے امی۔" رضا نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔

"اللہ کی دین ہے۔" نازیہ کی امی نے کہا۔ ان کے ذہن سے فکر و سوچ کے بادل چھٹ چکے تھے۔ وہ پر سکون تھیں۔۔۔ لیکن جہاں آرا کے چہرے پر خوشی کا پرتو نہ تھا۔ وہ تو سخت ڈپریشن کا شکار ہو گئی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو بچی اور بہو کو دیکھے بنا ہی وہاں سے چل دیتیں۔

ساڑھے سات پاؤنڈ کی بچی بڑی خوبصورت تھی۔ ناک نقشہ ماں باپ کا ملا جلا تھا۔ رضا کو پہلی نظر ہی میں بچی پر ٹوٹ کر پیار آیا۔ اس نے نازیہ کو پیار کیا۔ ہوش میں آنے کے بعد اس نے پہلا سوال یہی پوچھا تھا کہ بیٹی ہوئی ہے یا بیٹا۔ جب پتا چلا تو نازیہ نے نقاہت کے باوجود اس سے امی کے رویے کا پوچھا۔ "انہیں تو دکھ ہوا ہو گا۔۔۔ بیٹا جو نہیں ہوا۔"

"تم فکر نہ کرو۔ وقتی طور پر انہیں ڈپریشن ہوئی تھی۔ لیکن اب ٹھیک ہیں۔ بچی کو گود میں لیے بیٹھی ہیں۔۔۔۔ نام بھی حنا ہی رکھا ہے۔"

"مجھے دیکھنے نہیں آئیں۔۔۔؟"

"آئی تھیں۔تب تم ہوش میں نہ تھیں۔سب آئے تھے باری باری۔ابھی تم کو آرام کی ضرورت ہے۔ڈاکٹر سے بے مشکل اجازت لے کر میں چند گھڑیوں کے لیے اندر آیا ہوں۔تم ابھی آرام کرو۔۔۔شام سب دیکھنے آئیں گے۔"

"میری بیٹی۔۔۔؟"

"ابھی نرس لائے گی۔تم پوری طرح ہوش میں آجاؤ۔بہت پیاری اور گول مٹول ہے۔"

"آپ کو اچھی لگی۔۔۔۔۔۔؟"

رضا ہنس پڑا۔بولا۔"تم سے بھی زیادہ پیاری لگی۔"

ونے چاہئیں۔جو کبھی اور بچے کی خواہش کی تو موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوگا۔۔۔ڈاکٹروں نے رضا اور جہاں آرا کو بھی صورت حال سے مطلع کر کے تاکید کی کہ آئندہ بچے کی ولادت نازیہ کی موت پر منتج ہو سکتی ہے۔دو بچے سیزیرین ہوئے ہوں تو تیسرے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہئے۔خاص کر نازیہ کو، جس کے دو آپریشنوں سے پیٹ کی حالت تیسرے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

دوسری بچی کی آمد سے رضا کو بھی مایوسی ہوئی۔اب ان ڈاکٹروں کی تاکید نے تو مضمحل کر دیا۔وہ جانتا تھا کہ امی جائیداد کا وارث چاہتی ہیں۔بیٹا ان کی ضرورت ہے۔اور اب جبکہ نازیہ یہ بار اٹھانے کے قابل نہیں۔ان کا رویہ یقیناً ظالمانہ ہو جائے گا۔وہ بیٹے کی خاطر کچھ کر گزریں گی۔دبے دبے لفظوں میں تو ہما کے پیدا ہونے سے پہلے ہی وہ کہہ چکی تھیں کہ اگر بیٹیاں ہی ہوتی گئیں تو مجبوراً دوسرا قدم اٹھانا پڑے گا۔نازیہ پر تکیہ کیے رہنا فضول ہے۔

اور

اب

اب تو جہاں آرا رضا کی دوسری شادی کا سنجیدگی سے سوچنے لگی تھیں۔پندرہ مربع اراضی، حویلی، کوٹھی اور لاکھوں روپے کا وارث ضروری تھا۔بیٹیوں میں بٹ کر جائیداد کے ٹکڑے کرنا ان کی سوچ سے بعید تھا۔انہوں نے نئی بہو کی تلاش بھی شروع کر دی۔۔۔نازیہ بے چاری سمجھ نہ پائی تھی کہ کیا کرے۔چین و سکون سب غارت ہو گیا تھا۔بچیوں کو گلے لگا کر روتی رہتی۔رضا بھی گم صم رہنے لگا تھا۔نازیہ اس کی چھاتی پر سر رکھ کر آنسوؤں کے سیلاب بہاتی۔وہ صرف اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے یہی کہتا۔

"میں کیا کروں۔امی کو کیسے سمجھاؤں۔وہ انکار سننے کی عادی ہی نہیں ہیں۔جو

جی میں آتا ہے، کر گزرتی ہیں۔"

"آپ نے اب تک ان کی ہر بات مانی ہے۔میں نے اعتراض نہیں کیا۔لیکن رضا۔۔۔"

وہ روتے ہوئے کہتی۔"اب صرف میں ہی نہیں۔آپ کی دو بچیاں بھی ہیں۔۔۔کیوں ہم سب کو جہنم میں جھونکنا چاہتے ہیں۔"

وہ تڑپ کر کہتا۔"میں کب چاہتا ہوں میری جان۔"

"تو پھر آپ امی کو منع نہیں کر سکتے۔وہ نئی بہو لانے کی تیاریاں کر رہی ہیں۔بھلا بتائیے تو، بیٹا نہیں ہوا تو اس میں میرا کیا قصور۔کیا مجھے بیٹے کی خواہش نہیں۔میرا جی نہیں چاہتا کہ جائیداد کا اور خاندان کا وارث میری گود میں کھیلتا؟ان سے کہیں زیادہ شدید میری خواہش تھی۔"

رضا کوئی جواب نہ دے سکتا۔

اور

جب جہاں آرا نے بر ملائی بہولانے کو کہنا شروع کیا تو نازیہ نے رورو برا حال کر لیا۔ اور جہاں آرا سے استدعا کی۔

"میں نے کیا قصور کیا ہے۔ کیوں اتنی کڑی سزا مجھے دے رہی ہیں۔ میری بچیاں ہیں۔ ہم سب کہاں جائیں گے؟"

وہ کمال بے رخی سے بولیں۔ "جاؤ گی کہاں۔۔ یہیں رہو گی۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ تمھیں یہاں سے کوئی نکالے گا تھوڑا ہی۔ تمہاری قسمت کہ تمہارا بیٹا نہ ہو سکا۔ مستزاد یہ کہ دوسرے سے تیسرا بچہ تم پیدا نہیں کر سکتیں۔ قسمت ہی کہہ سکتے ہیں نا کہ دو۔۔ سیزیرین ہو چکے۔۔۔۔ یہ نہ ہوتے تو چار چھ بچے اور ہو جاتے۔ کبھی تو لڑکا آ ہی جاتا۔ اب جبکہ تمہارا بچہ ہونا ہی نہیں۔ وقت کیوں ضائع کیا جائے۔ باقی تم تسلی رکھو۔ تمہارے حق پر آنچ نہیں آئے گی۔ تمہارے حیثیت بڑی بہو کی ہے، وہی رہے گی۔ اللہ کا فضل ہے، رضا دو

چھوڑ، چار بیویوں کا بھی کفیل ہو سکتا ہے۔۔۔۔۔ ہمارے یہاں کس چیز کی کمی ہے۔ دو بچیاں کیا پل نہیں سکیں گی؟ میں تمھیں بار بار کہہ رہی ہوں کہ اس خاندان کو وارث کی ضرورت ہے۔"

"لیکن خدا کی مرضی۔۔۔۔۔ بیٹا نہیں ہو سکا۔" وہ روہانسی ہو رہی تھی۔

"اور تمہارے ہاں ہو بھی نہیں سکتا۔ ڈاکٹروں کی متفقہ رائے ہے کہ دو سیزیرین ہو چکے ہیں۔ اس لیے تیسرا بچہ نہیں ہونا چاہئے۔" جہاں آرا نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔

"تیسرا بچہ! تیسرا بچہ۔۔۔۔" نازیہ نے سوچا۔۔ "جو نہیں ہو سکتا۔۔۔۔ دو سیزیرین دو بچوں کے بعد تیسرا سیزیرین بچہ۔" لیکن نازیہ نے فیصلہ کر لیا کہ تیسرا بچہ ہو گا۔ وہ ایک بار پھر آزمائش سے گزرے گی۔ کیا خبر خدا اس دفعہ اس کی آس پوری کر دے۔ اس کا بھرا پرا گھر آباد رہے۔ اور رضا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا رہے۔

اس نے اپنے فیصلے سے رضا کو آگاہ کیا تو وہ حیرت زدہ سا اس کا منہ تکنے لگا۔ پھر بولا۔

"نہیں نازیہ۔۔ کیوں جان پر کھیلنا چاہتی ہو۔ تمہاری زندگی کو خطرہ ہو گا۔ ڈاکٹروں نے سختی سے منع کیا ہے۔۔۔۔"

"میں جانتی ہوں۔"

"پھر بھی یہ خطرہ مول لینے کی ضد ہے۔"

"تو کیا کروں۔ سوتن لے آؤں۔ اپنے آشیانے کو پھونک دوں۔ آگ لگے اور میں تماشا دیکھوں۔" وہ شاید رضا کے سامنے اس طرح گرجی، اس کا یہ رخ رضا کے لیے بالکل نیا تھا۔

"میں تمھیں شیئر نہیں کر سکتی رضا۔۔۔ نہیں کر سکتی۔۔۔ تمھیں کھو کر میں زندہ نہیں رہ سکتی۔" وہ رو دی۔

رضا اسے چپ کرانے لگا۔

"حوصلہ نہیں ہارو نازی۔ میں امی کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔"

"وہ کبھی نہیں سمجھیں گی۔ انہیں بیٹا چاہئے۔ میں تمہارے من میں بھی بیٹے کی ڈھکی چھپی

خواہش محسوس کرتی ہوں۔۔۔ اس لیے۔۔۔۔۔ اس لیے۔۔۔۔۔۔"

"نہیں۔۔۔۔۔ نازیہ۔۔۔۔۔ نہیں۔۔۔"

"میں تیسری بار بھی اس مرحلے سے گزروں گی۔"

نازیہ نے بہت ضد کی تو رضا ہولے سے بولا۔ "بہتر ہے تم اپنے ڈاکٹر سے مشورہ کر لو۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔"

"خودکشی کرنے والی بات ہے یہ۔۔۔۔۔۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ شاید۔۔۔ اس دفعہ آس پوری ہو جائے۔"

"تم کیوں اس انداز سے سوچتی ہو نازی؟"

"اس لیے کہ امی اور آپ۔۔۔اس انداز سے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

رضا کچھ شرمندہ سا ہوا۔ پھر بولا۔ "امی اپنی خواہش سے مجبور ہیں۔"

"اور آپ امی کے کہے کو ٹال نہیں سکتے۔ آپ ان کی بات پوری کرنے کے لیے بیوی بچوں کو پس پشت ڈال سکتے ہیں۔"

"نازیہ! یہ میری کمزوری ہے۔ میری جگہ تم ان سے اپنے حق کے لیے لڑو، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"میں حق کی بات کروں تو وہ کہتی ہیں۔ میرا حق محفوظ ہے، وہ حق دھن دولت کو سمجھتی ہیں۔ عورت ہو کر نہیں جانتیں کہ عورت کی سب سے بڑی دولت اس کا شوہر ہوتا ہے۔"

نازیہ کافی دیر بولتی رہی۔ دل کا غبار نکالتی رہی۔ رضا سر نہواڑے سنتا رہا۔ بیٹے کی ضرورت وہ بے شک محسوس کرتا تھا۔ لیکن ماں کی طرح شدت سے خواہاں بھی نہیں تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ اس میں نازیہ کو کوئی قصور نہیں۔ اور دوسری شادی کا ذکر بھی جب امی لے بیٹھتیں تو وہ دلچسپی کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اپنی بیٹیاں اسے بہت

پیاری تھیں۔ نازیہ سے بھی وہ بہت پیار کرتا تھا۔ پر سکون گھر کی بربادی بھی مطلوب نہ تھی۔

لیکن

ان سب باتوں کے باوجود وہ ماں کی گرفت میں اس طرح تھا کہ ان کے سامنے کسی بات کو ٹالنے یا انکار کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ نازیہ کو اکسانے لگا کہ وہ اپنے حق کے لیے خود لڑے۔ امی کو اپنے ارادے سے باز رکھے۔ بات مضحکہ خیز تھی۔ لیکن وہ اسی پر مصر تھا۔ اور یقین رکھتا تھا کہ اگر نازیہ اپنے حق کے لیے امی کے سامنے ڈٹ جائے تو وہ یقینا اپنا ارادہ بدل دیں گی۔

نازی نے بھی ایسا سوچا تھا۔ لیکن چند برسوں کی رفاقت میں وہ یہ جان گئی تھی کہ جہاں آرا جس مٹی میں بنی

ہیں۔ اسے موڑنا توڑنا آسان نہیں۔ اسی لیے وہ تیسری بار آزمائشی مرحلے سے گزرنے پر تیار ہو گئی تھی۔

وہ بالآخر تیسری بار امید سے ہو ہی گئی۔ اس دفعہ اس نے دواؤں کا نہیں، دعاؤں کا سہارا لیا۔ جہاں جہاں کسی نے بتایا، دعا کرانے گئی۔ کئی مزاروں پر چڑھاوے اور منتیں مانیں۔ دم کیے ہوئے پانی پیے۔ چینی پھانکی۔ تعویذ بھی بازو پر باندھے۔ نو مہینے وہ جتن کرتی رہی۔۔۔۔بیٹے کے لیے جتن

اور آج وہ تیسری بار آپریشن تھیٹر میں لے جائی جا رہی تھی۔ اس دفعہ ڈاکٹرز نازیہ کی حماقت پر جھنجلائے ہوئے تھے۔ پچھلی بار پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان کو سامنے رکھتے ہوئے اس دفعہ کیس خاصا مشکل اور احتیاط طلب تھا۔ نازیہ کو خود بھی پتا تھا۔ اسی لیے ہسپتال آنے سے پہلے اپنی معصوم بچیوں کو گلے لگا کر بے اختیاری سے روئی تھی۔ روتی تو وہ روز ہی تھی۔ بے یقینی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ نازیہ سارے جتنوں کے باوجود

بے یقینی کا بھی شکار تھی۔ اس لیے کبھی سوتی بچیوں کی پیشانیوں کو چوم چوم کر روتی۔ کبھی سینے سے لگا لگا کر۔ لیکن

آج تو وہ جس بے اختیاری سے روئی تھی۔ پتھر بھی پانی ہو رہے تھے۔ رضا نے اسے بازوؤں میں بھر کر پیار کرتے ہوئے روہانسی آواز میں کہا تھا۔

"خدا کے لیے روؤ نہیں نازیہ! تم بخیریت واپس آؤ گی۔ تمھیں کچھ نہیں ہوگا۔۔۔۔"

وہ رندھی ہوئی اور ٹوٹتی آواز میں بولی تھی۔ "اگر مجھے کچھ ہو گیا۔ تو ان معصوم بچیوں کا خیال رکھنا۔ یہ صرف میری نہیں، تمھاری بھی اولاد ہیں۔ ماں کی شفقتوں سے اگر محروم ہو گئیں تو باپ کے پیار سے محروم نہ کرنا انہیں۔"

رضا کا دل کٹ کٹ گیا تھا۔ اسے افسوس اور پچھتاوا ہو رہا تھا کہ اس نے کیوں نازیہ کو سختی سے تیسری بار آزمائش سے گزرنے سے نہیں روکا۔۔۔۔

نازیہ آپریشن تھیٹر میں جا چکی تھی۔اس کی اپنی ماں ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ بار بار جھولی پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جہاں آرا بیگم بھی گم صم تھیں۔ان کا اضطراب نازیہ کی امی کا سا تو نہیں تھا۔ پھر بھی بے چین ضرور تھیں۔ نازی کا دامن اس بار گل امید سے بھر جائے۔ وہ بھی دل سے دعا کر رہی تھیں۔

رضا کی بے کلی اور بے چینی دیدنی تھی۔ کبھی لان میں اتر جاتا۔ کبھی برآمدے میں چلا آتا۔ دل کبھی بے اختیارانہ دھک دھک کرنے لگتا۔ اور کبھی محسوس ہوتا۔ نبضیں ڈوب رہی ہیں۔ازدواجی زندگی کے پانچ چھ سال جو اس نے نازیہ کے سنگ بتائے تھے، متحرک فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا رہے تھے۔ نازیہ کا ایک ایک روپ آنکھوں میں اتر رہا تھا۔اس کی بہکی بہکی خوشیاں، اس کے ننھے منے غم۔اس کی آسودگیاں، اس کی

پریشانیاں، سبھی کے عکس لہرا رہے تھے۔ وہ کتنی اچھی، کیسی فرمانبردار اور کتنی خدمت گزار بیوی تھی۔ وہ جانتا تھا۔۔۔ وہ صرف اچھی اور فرض شناس بیوی ہی نہ تھی۔ بہو بھی تھی۔۔۔۔ جہاں آرا جیسی سخت حکمران ساس کے ساتھ اس نے کتنی خوبصورتی سے نباہ کیا تھا۔ وہ ایک اچھی ماں بھی تو تھی۔ بچیوں کی پرورش کس قدر جانفشانی سے کر رہی تھی۔ کتنا پیار کرتی تھی ان سے۔ جان نچھاور کرتی تھی۔

اور اب

اب

اسے کچھ ہو گیا تو رضا۔۔۔۔!

رضا کیا کرے گا۔ کیونکر اپنے آپ کو معاف کرے گا۔

وہ یہی سوچ سوچ کر باؤلا ہو رہا تھا۔ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتے ہوئے وہ ایسی ہی الٹی سیدھی سوچوں سے دو

چار تھا۔۔۔ یہ سوچیں کسی کسی وقت اس خیال سے بہل بھی ضرور رہی تھیں کہ شاید اس دفعہ نازیہ کے ہاں بیٹا ہو جائے اور وہ بخیر وعافیت آپریشن کے مرحلے سے گزر جائے۔

وقت تو اپنی متعین رفتار سے گزر رہا تھا۔ لیکن سب کو یوں لگ رہا تھا وقت کا دل بھی تھم تھم گیا ہے۔ وہ رک رک کر، ٹھہر ٹھہر کر گزر رہا ہے۔

سب کی نظریں جالی دار دروازے پر لگی تھیں۔ جب بھی کوئی نرس عجلت میں ٹرے اٹھائے باہر آتی یا اندر جاتی، سب اس کی طرف لپکتے۔ وہ کہتی۔ "دعا کریں، آپریشن ہو رہا ہے۔"

آپریشن ہو گیا۔

اور نرس ڈاکٹروں کے کہنے پر خبر دینے باہر آئی۔

اس نے دروازے میں کھڑے کھڑے کہا۔ "بیگم صاحبہ ابھی بے ہوش ہیں، بیٹی پیدا ہوئی ہے۔"

وہ تو اتنا کہہ کر واپس پلٹ گئی۔

لیکن برآمدے میں سراپا انتظار کھڑے لواحقین پر یہ خبر مختلف انداز سے گزر گئی۔ نازیہ کی امی کا دل دھک سے رہ گیا۔ لیکن منہ سے دعائیہ کلمے نکلے۔ "خدایا! میری بچی کو محفوظ رکھنا۔"

رضا بھی ڈول سا گیا۔ بچی کی خبر سن کر اندر ہی اندر دھما کا سا ہوا۔

اور

جہاں آرا بیگم پر تو یہ خبر بم کی طرح پھٹی۔ انہوں نے پیچھے کھڑی حسنہ سے کہا۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا، بیٹی ہو گی۔"

"حوصلہ رکھو آپا۔" حسنہ نے ان کا کندھا تھپتھپایا۔ "نازیہ کی خیر مانگو۔ خدا اسے بخیر رکھے۔"

جہاں آرا کی مایوسی انتہا کو چھو رہی تھی۔ جانے کس طرح اپنے آپ کو قابو میں رکھے وہ تھوڑی دیر اور وہیں

بیٹھی رہیں۔اور جب نازیہ کو آپریشن تھیٹر سے انتہائی نگہداشت یونٹ میں منتقل کیا گیا تو وہاں سے اٹھ کر گاڑی کی طرف آگئیں۔نازیہ کی امی وہیں رکی رہیں۔۔۔رضا بھی کھڑا رہا۔

تیسری بچی کو قبول کرنا جہاں آرا کے بس میں نہ تھا۔۔اس کا نام بھی انہوں نے تجویز نہیں کیا۔حنا اور ہما سے ملتا جلتا نام حرا تھا۔رضا نے خود ہی یہ نام بچی سے منسوب کر دیا۔

نازیہ کی حالت تین دن تک نازک رہی۔چوتھے دن وہ خطرے کی حدوں سے باہر ہوئی۔وہ خاصی کمزور ہو گئی تھی۔اس لیے اسے کئی دن ہسپتال میں رکھا گیا۔ڈاکٹروں نے پوری احتیاط اور توجہ سے اس کو دیکھا بھالا۔اور دو ہفتے بعد جب اسے ڈسچارج کیا گیا، تب بھی دواؤں کی لمبی فہرست اسے دی گئی۔ہدایات بھی دی گئیں۔ احتیاط بہت ضروری تھی۔

نازیہ بے انتہا مایوس تھی۔تیسری بچی کو دیکھا تک نہیں تھا۔۔۔وہ نوکرانی کے رحم و کرم پر ہی تھی۔حرا اپنی دونوں بہنوں سے زیادہ پیاری تھی۔چند دن رضا بھی اس سے بیگانہ رہا تھا۔لیکن پھر اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔اس نے نازیہ سے بھی کہا تھا۔

"حرا اپنی بہنوں سے زیادہ پیاری اور خوبصورت ہے۔"

"میں کیا کروں۔"نازیہ نے دکھ اور کرب سے کہا۔

"گود میں لو اور اسے پیار کرو۔بچی ہے ہماری۔"رضا نے اس کی گود میں حرا کو ڈال دیا۔

نازیہ ٹکر ٹکر اسے تکتی رہی۔پھر ممتا نے جوش مارا اسے سینے سے لگا لیا۔"بدنصیب ماں کی بدنصیب بچی۔" کہتے ہوئے وہ اتنی تڑپ سے روئی کہ رضا کا جی ہول گیا۔

"نازیہ۔نازیہ!"اس نے اپنا بازو اس کے گرد لے جاتے ہوئے ماں بیٹی کو ساتھ لگا لیا۔"ہوش میں آؤ نازیہ۔۔۔کیوں ہلکان ہو رہی ہو۔حوصلہ رکھو۔میں تمہارے ساتھ ہوں۔۔۔۔"

نازیہ اس دن اتنا روئی، اتنا روئی کہ آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو گیا۔

شاید نوکرانی نے اس کے اس طرح رونے کا ذکر جہاں آرا سے کر دیا تھا۔اس لیے کئی دن جہاں آرا بھی خاموش خاموش سی رہیں۔یہ خاموشی کئی مہینوں پر محیط رہی۔گھر کی فضا مکدر تھی۔نازیہ مایوسی کے دباؤ سے اب تک نہ نکل پائی تھی۔وہ سوچوں میں گم رہتی۔۔۔۔کبھی تقدیر سے گلہ ہوتا۔کبھی خدا سے مایوسی کی انتہاؤں میں وہ ناممکنات کو ممکن بنانے کا خیال کرتی۔۔۔اکثر اپنے آپ سے کہتی۔

"شاید تینوں بیٹیوں میں سے کسی کی جنس تبدیل ہو جائے، وہ لڑکی سے لڑکا بن جائے۔۔۔"

لیکن یہ خیال محض خیال ہی ہوتا۔سچائی اور حقیقت سے اس کا دور کا واسطہ بھی نہ ہوتا۔وہ الٹ پلٹ باتیں سوچتی رہتی۔

جہاں آرا بیگم پر ایک بار پھر بیٹا حاصل کرنے کا بھوت سوار ہو گیا۔رضا نے کئی بار

انہیں سمجھایا۔"امی اب تو معاف کر دیں۔میری تین بیٹیاں ہیں۔اور آپ جانتی ہیں کہ نازیہ جان پر کھیل کر تیسری کوشش کر رہی ہے۔خدا کو منظور ہوتا تو بیٹا ہو جاتا۔۔۔"

جہاں آرا بیگم نے رضا کو غصیلی نظروں سے دیکھا۔اور بولیں۔"نازیہ نے جو کرنا تھا، کر چکی۔اب تو اس کے کچھ کرنے کا امکان ہی نہیں۔وہ چوتھی بار خطرہ مول نہیں لے سکتی۔لینا بھی نہیں چاہئے، تین بیٹیوں کو پالنا پوسنا ہے اسے۔"

"پھر۔۔۔۔؟"

"پھر۔۔۔جو میں چاہوں، کروں گی۔تم بے شک نازیہ کو تسلیاں دو۔مطمئن کرو۔جائیداد کا کچھ حصہ اس کے نام لکھ دو، نقدی بھی اس کے اور بچیوں کے نام بینک میں رکھ دو۔اسے کسی قسم کی مالی پریشانی نہیں ہو گی۔ لیکن یاد رکھو۔اب میں تمہاری دوسری شادی کرنے سے باز نہیں رہوں گی۔مجھے خاندان اور نسل آگے

بڑھتے دیکھنا ہے۔ جائیداد کی وارث یہ بچیاں نہیں ہیں۔ یہ جائیداد صدیوں کا ورثہ ہے۔ اب اسے یوں منقسم نہیں ہونے دوں گی۔ لڑکیاں اپنی نہیں ہوتیں، غیروں کی ہوتی ہیں۔ جوان ہوئیں اور گئیں۔ بیٹا اپنا ہوتا ہے۔ اپنا رہتا ہے۔۔۔۔ مجھے تمہارے بیٹے اور خاندان کے وارث کی ضرورت ہے۔۔۔ سمجھے۔۔۔۔"

رضا سے جتنی حد تک ممکن تھا۔ اس نے ماں کو روکنے کی کوشش کی۔

لیکن ماں تو اب من مانی کرنے پر تل گئی تھیں۔ انہوں نے مختلف لوگوں سے کہہ بھی دیا تھا کہ کوئی اچھی سی لڑکی رضا کے لیے تلاش کریں۔ خاندان میں بھی رشتے داروں کو ٹٹولنا شروع کر دیا تھا۔ تین بیٹوں کے باپ سے جبکہ اس کی بیوی حیات تھی، کسی کا ناتہ جوڑنا آسان کام نہیں تھا۔ وہی اس ترغیب میں آسکتا تھا، جسے دھن دولت اور زمین کا لالچ ہوتا۔ اپنے ہم پلہ اور امیر کبیر گھرانوں سے رشتہ ملنے کی توقع نہیں تھی۔ اس لیے اب جہاں آرا

نے متوسط طبقے کی لڑکیاں دیکھنا شروع کر دی تھیں۔ نچلے متوسط طبقے کی کوئی خوبصورت لڑکی مل جاتی تو مضائقہ نہیں تھا۔

نازیہ خاموش تماشائی کی طرح سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے لگتا تھا وہ بارود کے ڈھیر پر ٹکی ہے۔ فیتہ جہاں آرا کے ہاتھ میں ہے، جس وقت بھی انہوں نے آنچ دکھائی، ڈھیر بھک سے اڑ جائے گا۔ اور وہ جیتے جی پرخچوں میں تبدیل ہو جائے گی۔ انگ انگ الگ ہو جائے گا۔ اس کی پہچان اور شناخت ختم ہو جائے گی۔

لیکن کیوں؟

اس کے دل و دماغ میں طوفان سے اٹھتے۔ وہ اپنے آپ کو ٹٹولتی۔ اس کا قصور کیا تھا۔ وہ سمجھ نہ پاتی۔

کیا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بیٹا ہو؟

اس بیٹے کو حاصل کرنے کے لیے اس نے جان کا خطرہ مول نہیں لیا تھا؟

رضا کو ہمیشہ کے لیے اپنا دیکھنے کی تمنا میں اس نے کتنی خطرناک صورت حال کا سامنا کیا تھا۔

اپنے گھر ہنستا بستا رکھنے کے لیے اس نے رو رو کر دعائیں نہیں کی تھیں؟

پھر

پھر بھی

جہاں آرا نہیں مان رہی تھیں۔ من مانی کرنے پر تلی تھیں۔ اس کے حق پر ڈاکہ ڈلوانے کی ترکیبیں سوچ رہی تھیں۔

اس سے رضا کو چھین کر دوسری عورت کی جھولی میں ڈالنے کے منصوبے بنا رہی تھیں۔

اس کا گھر برباد کر کے دوسری عورت کو آباد کرنا چاہتی تھیں۔

اس کی معصوم بچیوں کو سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر ڈالنا چاہتی تھیں۔ باپ کی

محبتوں سے محروم کرنے پر تلی تھیں۔

وہ سوچ سوچ کر باؤلی ہوتی رہتی۔ اس کی دماغی صلاحتیں بعض اوقات مفلوج ہو جاتیں۔ اور بڑے بھیانک بھیانک خیال اس کے ذہن میں ناگوں کی طرح پھن پھیلا دیتے۔

اور

ایک دن یہ بھیانک پھن پھیلانے والے ناگ اپنا سارا زہر اس کے ذہن میں نچوڑ گئے۔ نازیہ نے بدلے اور انتقام کا سارا زہر اپنے وجود میں اتار لیا۔ ساری منفی و مثبت سوچوں سے اس نے اپنا دامن چھڑا لیا۔

اب

اب اس نے رونے دھونے سے ہٹ کر مایوسی اور نامرادی کو جھٹک کر لائحہ عمل تیار کیا۔ اپنا حق جو اسے ملنا چاہیے تھا۔ جہاں آرا کے ہاتھوں چھنتا دیکھ کر اس نے یہ حق زبردستی وصول کرنے کا منصوبہ تیار کیا۔

وہ رضا کو شئیر نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اسے ہر گز شئیر نہیں کرے گی۔

وہ اپنا بھرا پرا گھر ابر باد نہیں ہونے دے گی۔

وہ باقی ساری عمر روتے دھوتے نہیں گزارے گی۔

یہ فیصلہ اٹل تھا۔

نازیہ کو اس سے بڑی تقویت ملی۔ اب تک اسے لگتا تھا وہ سیلی نرم نرم مٹی میں کھڑا ایسا درخت ہے، جس کی جڑیں نرم اور سیلی مٹی کی وجہ سے اکھڑ رہی ہیں۔ وہ زمین کے سینے میں پیوست نہیں۔ صرف رکھی ہوئی ہیں۔ اور کسی بھی لمحے تیز و تند ہوا کا ریلا اسے زمین سے اکھاڑ کر پھینک سکتا ہے۔

لیکن

اب

وہ اپنے آپ کو ایسا تناور درخت محسوس کر رہی تھی، جس کی جڑیں رگیں بن کر زمین کے سینے میں دور تک اترتی چلی جاتی ہیں۔ یہ جڑیں، یہ رگیں ہی ہوتی ہیں جو درخت کی تناوری قائم رکھتی ہیں۔ تیز و تند جھکڑ چلیں۔ آندھیاں آئیں۔ طوفان اٹھیں۔ یہ تناور درخت جھولتے جھومتے کھڑا رہتا ہے۔ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ یہ مضبوط اور قائم ہوتا ہے۔

وہ تناور اور مضبوط درخت ہی تھی۔ مضبوط ارادے اور مستحکم فیصلے نے اسے ایسا بنا دیا تھا۔ اب اسے کوئی خوف دامن گیر نہیں تھا۔ وہ کسی گہری دھند میں گھری نہیں تھی۔ اس کے ارد گرد ہولے ہولے اٹھنے والے جھکڑ بھی تھم گئے تھے۔

اس دن

جب جہاں آرا بیگم کو کسی ثمینہ نامی لڑکی کے متعلق رشتے کروانے والی عورت بتا رہی تھی اور وہ اس رشتے کو

منظوری کا لیبل لگا کر اس کے ہاتھ میں کچھ لال لال نوٹ پکڑا کر رخصت کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ رشتہ طے کر دو۔

تو

نازیہ آندھی کے ایک جھونکے کی طرح کمرے میں داخل ہو گئی۔

"کون تھی یہ عورت؟" اس نے تیز نگاہیں جہاں آرا پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"رشتے کروانے والی زینب۔۔۔" جہاں آرا نے اس کے تیکھے تیور نظرانداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تو آپ رضا کا رشتہ طے کر رہی ہیں؟"

"ہاں۔ یہ بات میں نے تم سے چھپائی تو نہیں۔"

"لیکن میری ہر استدعا ٹھکرائی تو ہے۔"

"مجبوری ہے۔"

"کس بات کی؟"

"کس لہجے میں بات کر رہی ہو؟"

"جس کی شاید آپ کو عادت نہیں۔"

"لڑنے آئی ہو۔۔ تو بھی یاد رکھو۔ میں مرعوب نہیں ہوں گی۔ بگاڑو گی تو کچھ اپنا ہی، میرا نہیں۔"

"تو آپ نے مجھے برباد کرنے کا پکا فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں اور میری بچیاں ساری عمر روتی رہیں۔۔۔ اپنی بربادی پر آنسو بہاتی رہیں۔"

"یہ میں نہیں چاہتی۔ تم آنسو بہانے کی شوقین ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ مجھے کیا کہتی ہو۔ قسمت کو روؤ۔"

"قسمت کو روؤں؟"

"اور کیا۔"

"اکیلی میں روؤں؟"

نازیہ خونخوار شیرنی کی طرح دھاڑی تو جہاں آرا نے چونک کر اسے دیکھا۔

اور پھر وہ اسے دیکھتی رہ گئیں۔

نازیہ کے ہاتھ میں پستول تھا۔۔ جسے اس نے ہوا میں اچھال کر دوبارہ پکڑتے ہوئے جہاں آرا کی طرف دیکھا۔ جہاں آرا کی گھبراہٹ دیدنی تھی۔

"تم۔۔۔۔ تم۔۔۔ یہ پستول۔۔۔؟" وہ ہکلائیں۔

"آپ ڈریں نہیں۔ آپ پر نہیں داغوں گی اسے۔۔۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لیں۔ اگر آپ رضا کی دوسری شادی کرنے سے باز نہ آئیں تو پھر۔۔۔۔"

وہ چند لمحے چپ ہوئی۔

پھر

مستحکم لہجے میں بولی۔ "جس دن رضا شادی کرے گا۔ میں اس پستول کی ساری گولیاں اس کے سینے میں اتار دوں گی۔"

"نا۔۔۔ زیہ۔۔۔" جہاں آرا کے منہ سے چیخ سی نکلی۔

"ہاں۔۔۔۔۔۔ میں اپنی بچیوں کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں رضا کو مار ڈالوں گی۔"

"نازیہ۔۔۔ پاگل نہ ہو۔۔۔۔"

"میں نے جو کچھ کہا ہے، وہ کر کے بھی دکھاؤں گی۔۔۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں عمر بھر روتی رہوں۔۔۔۔ میں نے رونا ہے تو آپ بھی کیوں نہ میرے ساتھ روئیں۔۔۔۔۔"

"نازیہ۔۔۔۔۔۔۔۔" جہاں آرا کی رنگت سپید پڑ گئی۔

"میں رونے کی شوقین نہیں۔ کوئی بھی اپنی خوشی سے نہیں روتا۔۔۔۔ مجھے رلانے کی آپ ذمے دار ہیں۔ جب آپ مجھے رلا سکتی ہیں تو میں بھی آپ کے پہلو میں۔۔۔۔ نشتر چبھو کر آپ کو سدا آنسو بہانے کی کھلی چھٹی دے سکتی ہوں۔ رضا میرے لیے نہیں رہے تو آپ کے لیے بھی کیوں رہے۔"

نازیہ نے ایک بار پھر پستول ہوا میں اچھال کر پکڑا۔۔۔۔ جہاں آرا کی طرف دیکھا۔ اور غرائی۔ "بیٹے کی زندگی چاہتی ہیں تو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا۔۔۔ ورنہ۔۔۔۔ ہم دونوں۔۔۔ مل کر روئیں گے۔۔۔ ساری عمر۔۔۔" اس نے ایک زوردار لیکن انتہائی خوفناک قہقہہ لگایا۔

پھر کمرے میں جس طوفانی انداز میں آئی تھی، اسی طرح نکل گئی۔

جہاں آرا بیگم اپنی جگہ یوں گڑی کی گڑی رہ گئیں جیسے وہ پتھر کی بن گئی ہوں۔ ان کا ذہن منجمند ہو گیا تھا اور سوچیں یخ بستہ ہو گئی تھیں۔ انہیں کچھ سنائی نہیں دے

رہا تھا۔ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

اور

اس رات جب رضا ماں کے کمرے سے ہو کر اپنے بیڈروم میں آیا تو نازیہ ڈریسنگ کے سامنے بڑے پرسکون انداز میں بیٹھی ناخنوں سے نیل پالش اتار رہی تھی۔ اس نے ڈھیلا ڈھالا شب خوابی کا خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ بالوں میں برش کیا ہوا تھا۔ اور بڑے سے آئینے میں اس کا عکس پڑ رہا تھا۔

رضا چند لمحے دروازے کے قریب کھڑا اسے تکتا رہا۔ اس کی پشت پر نگاہ ڈالی، پھر آئینے میں منعکس اس کے پرسکون سراپا پر۔

وہ بے آواز چلتا اس کی پشت پر آن کھڑا ہوا۔ اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے پکارا۔ "نازیہ۔"

نازیہ نے ایک دم گردن موڑی، کندھے کے اوپر سے اسے دیکھا۔ "آپ آ گئے؟"

"جی ہاں۔" وہ گھوم کر اس کے سامنے آ گیا۔ اور زیر لب تبسم سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "یہ امی کو کیا کہہ دیا تم نے۔ ڈرا دیا انہیں۔"

نازیہ نے اک نگاہ اس پر ڈالی۔ پھر ہاتھ میں پکڑی روئی ڈبیا میں رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ رضا کی طرف پشت کرتے ہوئے بولی۔ "میں نے جو کچھ کہا۔۔۔ بالکل سنجیدگی سے کہا اور جو کچھ کہا، اس کا وہی مطلب بھی ہے۔"

"یعنی۔۔۔" وہ قدم بڑھا کر اس کی پشت سے لگتے ہوئے بولا۔ "یعنی تم نے مجھے مار ڈالنے۔۔۔۔۔۔"

وہ برق کی سی تیزی سے پلٹی اور غرائی۔ "جس دن تم دوسری شادی کرو گے، میرے لیے مر جاؤ گے۔"

"اچھا۔۔۔" رضا نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں۔۔۔ اور جب تم میرے لیے نہ رہو، تو ماں اور دوسری عورت کے لیے کیوں رہو۔ رضا میں جیتے جی تو کیا مر کر بھی تمھیں شیئر نہیں کر سکتی۔۔۔ سمجھے۔۔۔۔۔" وہ غرائی۔

"شاباش۔" رضا نے اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ "میں تو یہی چاہتا تھا میری جان کہ تم اپنا حق چھین لو۔ میں امی کے سامنے بولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ فطری کمزوری تھی۔ تم تو بول سکتی تھیں۔ آج تم نے یہ قدم اٹھا ہی لیا۔ تم نے واقعی بڑی جرأت کی۔ میں خوش ہوں۔ جان۔ بہت خوش ہوں۔ امی تو اتنی خوف زدہ ہیں کہ اب میری شادی کا خیال بھی ذہن میں نہ لا سکیں گی۔۔۔ وہ مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔ بہت چاہتی ہیں۔ میری زندگی انہیں بہت عزیز ہے۔"

"اور مجھے۔۔۔" بازوؤں میں جکڑے جکڑے نازیہ نے سر اٹھا کر رضا کی آنکھوں میں دیکھا۔ "آپ مجھے عزیز نہیں۔۔۔؟"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے مار ڈالنے پر تلی ہو۔ کیا جانوں تمھیں میں عزیز ہوں یا نہیں۔۔۔۔"

"یہ میرے پیار کی انتہا ہے رضا کہ جب تم مجھے چھوڑ کر دوسری عورت کو اپناؤ تو میں تمھیں قتل کر دوں۔" نازیہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

پھر دونوں کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ رضا کے بازوؤں کی گرفت اور سخت ہوئی۔ نازیہ نے اس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ دوسرے لمحے وہ سسک سسک کر رو رہی تھی۔ رضا اسے سینے میں سمو لینے کی کوشش کرتے ہوئے اس کے بالوں میں منہ چھپائے کہے جا رہا تھا۔

"میری جان۔ میری زندگی!"

اعتماد، بھروسے اور یقین کا سکون نازیہ کی نس نس میں اترتا جا رہا تھا۔

حقیقت

ہارن کی آواز سن کر چار سالہ گول مٹول پنکی اپنی واکی ٹاکی گڑیا پھینک کر تالیاں بجاتے ہوئے کمرے سے باہر بھاگی۔

"بابا آ گئے، بابا آ گئے۔۔۔۔۔" وہ شور مچاتے ہوئے لاؤنج میں آئی اور پھر بے اختیارانہ باہر کی طرف لپکی۔

بینا کچن میں کھڑی گلو کو چائے بنانے کا کہہ رہی تھی۔ پنکی کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو یوں لگا جیسے کسی نے کانوں میں شہد ٹپکا دیا ہو۔

"صاحب آ گئے گلو۔" اس نے بھی پنکی ایسی بے اختیارانہ خوشی میں کہا۔ اور گلو کا جوابی جملہ سنے بغیر ہی تیز تیز

قدم اٹھاتی کچن کے بیرونی دروازے سے نکل کر پورچ کی طرف لپکی۔

لیکن

ماں بیٹی جس والہانہ انداز میں پورچ کی طرف دوڑی تھیں۔اسے ایک دم بریک سی لگ گئی۔ جہاں قدم تھے، وہیں رک گئے۔ پنکی کے چہرے پر کچھ ناگوار سے تاثرات ابھرے۔

خوشی کو دھچکا جو لگا تھا۔کچھ ایسی ہی کیفیت بینا کی بھی تھی۔ طارق کی جگہ شاہد کو دیکھ کر ایک لمحے اسے بھی ناگواری ہی کا احساس ہوا۔

"ہیلو گڑیا!" شاہد نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے دروازے میں کھڑی پنکی کی

طرف پیار سے دیکھا۔

"السلام علیکم بھابھی۔۔۔۔" اس نے دوسری طرف بینا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"انکل شاہد آئے ہیں بیٹا۔۔۔۔۔"

"کیا بات ہے، ہمارے آنے سے گڑیا کو خوشی نہیں ہوئی۔" شاہد گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے چشمہ اتارنے لگا۔

"دراصل وہ سمجھی کہ بابا آئے ہیں۔۔ تیر کی طرح تیزی سے بھاگی آئی تھی۔" بینا نے پیارے سے پنکی کو بازوؤں میں بھرتے ہوئے کہا۔

"آئے نہیں طارق بھائی؟" چابی انگلی کے گرد گھماتے ہوئے شاہد نے پوچھا۔

بینا نے نفی میں سر ہلا دیا۔۔۔

"کافی دن ہوگئے انہیں گئے۔"

"ہاں آج گیارہواں دن ہے۔"

"فون بھی نہیں آیا کوئی۔"

"فون بھی نہیں آیا کوئی۔"

"پشاور سے آیا تھا۔۔اس کے بعد کوئی پتہ نہیں۔"

شاہد بھی قدرے متفکر ہو گیا۔۔۔ پھر آگے بڑھتے ہوئے پنکی کو گود میں اٹھالیا اور بولے۔"کوئی بات نہیں گڑیا۔ آجائیں گے بابا۔۔۔۔ ڈھیر ساری چیزیں بھی تو آپ ہی کے لیے لائیں گے نا۔۔۔ مجھے بھی دو گی نا چیزیں۔"

"اوں ہوں۔" بچی آنے والی چیزوں کے تصور سے خوش ہو کر بولی۔"ایک بھی نہیں دوں گی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"کیوں؟"

"بس۔"

"بس کیا ہوئی۔"

"آپ ہمارے لیے کیا لائے ہیں؟" پنکی نے الٹا سوال کر دیا۔

بینا نے ڈانٹا۔۔"ایسی باتیں نہیں کرتے۔۔۔۔"

"کیوں ماما۔۔۔۔۔۔ پہلے انکل شاہد ہمیں چیزیں دیں۔ پھر ہم اپنی چیزیں بھی انہیں دیں گے۔۔۔"

بینا ہنس پڑی۔۔۔۔ شاہد اسے گود میں لیے اندر چلا آیا۔لاؤنج میں بچھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے پھر بینا سے پوچھا۔"کوئی خط وط بھی نہیں آیا۔"

"نہیں۔"۔۔۔بینا دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ خاصی پریشان سی لگ رہی تھی۔

"کابل میں حالات بھی تو اچھے نہیں۔۔۔" اس نے چند لمحوں بعد کہا۔

"وہ تو ہے۔ لیکن لوگ آتے جاتے ہیں۔ چند دن ہوئے میرا دوست وہاں سے آیا ہے۔ گڑبڑ تو ہے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔"

"طارق کو میں نے منع بھی کیا۔" بینا جیسے رو دینے کو تھی۔

"ہاں اسے اور انتظار کر لینا چاہئے تھا۔۔۔ یہ جھڑپیں ختم ہو جائیں تو۔۔۔۔۔"

"وہ تو سن ہی نہیں رہے تھے۔ دفتر سے آتے ہی تیاری شروع کر دی کہ کل پشاور جانا ہے۔ وہاں سے دوسرے دن کابل۔۔۔۔"

"اس کا مین بزنس بھی تو کابل ہی کی پارٹیوں سے ہے نا۔۔۔۔۔"

"جہنم میں گیا بزنس۔" بینا جل کر بولی۔ "جس دن سے گئے ہیں، جان اٹکی ہوئی ہے انہی میں۔ فون بھی تو نہیں کیا جا کر۔"

"پتہ نہیں وہاں حالات کیا ہیں۔۔۔۔ موقع نہیں مل سکا ہو گا۔" شاہد بھی متفکر سا نظر آنے لگا۔

پنکی انکل کی گود سے اتر کر کمرے میں چلی گئی۔ بینا نے گلو کو چائے لانے کے لیے

آواز دی۔

"لے آیا صاحب۔" گلو نے باورچی خانے سے جواب دیا۔

"شاہد بھائی آئے ہیں۔ چائے کے ساتھ کچھ لے آنا۔۔۔" بینا نے کہا تو گلو کچن کے دروازے میں آتے ہوئے بولا۔ "او ہو میں سمجھا صاحب جی آ گئے ہیں۔۔۔"

بینا نے ایک گہری سانس لے کر صوفے کی پشت پر سر ڈال دیا۔۔۔۔

"ان حالات میں طارق کو وہاں جانا نہیں چاہئے تھا۔" کچھ لمحوں بعد شاہد نے کہا تو بینا بولی۔

"انہیں تو جانے کی خدا جانے کیوں اتنی جلدی پڑی تھی۔۔۔ ایکا ایکی تیار ہو گئے۔ بہت پریشان تھے۔۔۔ کہتے تھے، نہ گیا تو ساری رقم ڈوب جائے گی۔"

"ہوں۔" شاہد کچھ نہیں بولا۔۔۔ ویسے ان دنوں کابل میں حالات بد سے بدترین ہو رہے ہیں۔" اندرونی خانہ جنگی کے علاوہ غیر ملکی حملہ آوروں کی وجہ سے حالات بہت مخدوش ہو گئے تھے۔ بمباری، گولہ باری اور دوبدو لڑائی کی خبریں تشویشناک تھیں۔ افغان جان و مال کی حفاظت کے لیے سینہ سپر تھے۔ جو لوگ مقابلہ نہ کر سکتے تھے، جانیں بچا بچا کر سرحد پار کر رہے تھے۔ پاکستان کی سرزمین ان کے لیے پناہ گاہ تھی۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ روزانہ مختلف جگہوں سے سرحد پار کر کے پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔

طارق کا بزنس کابل کی ایک پارٹی سے تھا، لین دین خوب تھا۔ پارٹی مضبوط تھی۔ دس سال سے وہ اس پارٹی کو مال سپلائی کر رہا تھا۔ لاکھوں کا مال جاتا اور پیسہ واپس آتا تھا۔ کبھی تاخیر نہیں ہوتی تھی۔۔۔ طارق مضبوط بنیادوں پر محض اسی پارٹی کی وجہ سے کھڑا تھا۔ اس کے کاروبار کو وسعت دینے بھی یہی پارٹی کارفرما تھی۔ ۔۔۔ گڑبڑ شروع ہونے سے پہلے کئی لاکھ کا مال اس نے کابل بھجوایا تھا۔ جس کی پیمنٹ لینا تھی۔ کئی بار۔۔۔۔ فون کر چکا تھا۔ ٹیلیکس بھی دیئے تھے، لیکن کام نہیں بنا تھا۔

ویسے کئی لوگوں کا کاروبار افغانیوں سے تھا، ان حالات میں وہ خاموش ہو بیٹھے تھے۔۔۔ طارق بھی متفکر تو رہتا تھا۔ لیکن وہاں جانے کی بات کبھی نہ کی تھی۔ اچھے حالات میں تو وہ دو دفعہ بھی کابل جاتا تھا۔ لیکن ان دنوں وہ خود بھی دوسروں کی طرح خاموش ہو گیا تھا۔

لیکن

اس دن شاید کوئی اطلاع ملی تھی۔۔۔ وہ ایک دم کابل جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔۔۔ بینا نے روکا بھی تو نہیں رکا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر بینا بھی چپ ہو گئی تھی۔ وہ ویسے بھی بزنس کے معاملے میں اس سے کبھی کوئی

بات نہیں کرتی تھی۔

بینا اور طارق کی شادی چھ سال قبل بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ یہ شادی محبت کی شادی تو نہ تھی۔ لیکن شادی کے بعد محبتوں نے اتنا استحکام اور جوش پایا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے والہ وشیدا لگتے تھے۔ ان کے پیار کی خاندان بھر میں مثالیں دی جاتی تھیں، ٹوٹ کر چاہنے والا شوہر پا کر بینا پھولی نہ سماتی تھی اور محبتوں کی ہمہ دم پھوار برسانے والی کامنی کومل سی بیوی پانا طارق کی خوش نصیبی تھی۔ پنکی کی آمد ان کی چاہتوں میں اضافے کا باعث بنی تھی۔ پھول سی بچی ماں کی آنکھوں کا تارا تھی تو باپ کے دل کی تسکین۔

پنکی کے بعد ایک بچہ ہوا، جو چند دنوں کا ہو کر فوت ہو گیا۔ یوں پنکی بھائی کا پیار بھی سمیٹنے لگی تھی۔

شادی کے بعد طارق کا کاروبار بہت پھیل گیا تھا۔ دولت کی دیوی ان پر بے طرح مہربان ہو گئی تھی۔۔۔ طارق خوش تھا۔۔۔ اپنی اس خوشی کا اظہار وہ اکثر بینا کو بانہوں میں بھر کر کرتا، جھوم کر کہتا۔

"یہ سب تمہارے دم قدم سے ہے میری جان!"

بینا وفور مسرت سے سرشار ہو جاتی۔۔۔ "محنت آپ کرتے ہیں۔۔۔ یہ سب

آپ کی محنت اور لگن کا نتیجہ ہے۔۔۔"

وہ خوشی سے بہکنے لگتا۔

شادی کے تین سال بعد ہی انہوں نے یہ خوبصورت گھر بنوایا تھا۔ تین بیڈ رومز کا یہ گھر ان کی خوبصورت اور رعنائیوں بھری جنت تھا، اس جنت کو پر سکون اور خوبصورت بنانے کے لیے بینا ہر دم کوشاں رہتی۔۔۔ وہ اپنے گھر ہی کی زیبائش و آرائش میں لگی رہتی۔۔۔ اس لیے اس نے طارق سے اس کی بزنس کے متعلق کبھی استفسار ہی نہیں کیا تھا۔۔۔ نہ ہی کبھی کوئی رائے دی تھی، جو مانگتی تھی مل جاتا تھا۔ اس کی خواہش تو طارق اس کی آنکھوں میں پڑھ لیتا تھا۔ اس لیے اسے کسی کام میں دخل دینے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ ہاں کبھی کبھی وہ

ہنس کر ضرور کہتی۔ "آپ کو تجارتی منڈی کابل ہی ملی تھی۔۔۔ کوئی یورپ کا ملک منتخب کرتے یا امریکہ کا مزہ بھی آتا وہاں جانے کا۔۔۔"

طارق کبھی کبھی اس کی بات سے ناخوش بھی ہوتا۔ "کابل کابل ہے۔" وہ اسے چڑانے کے لیے کہتا۔ "وہاں حسن ہی حسن ہے۔ جدھر دیکھو جہاں دیکھو۔۔۔ حسین نظارے۔"

وہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتی اور طارق سے کہتی۔ "اس حسن سے دامن بچا کر ہی رکھیے گا۔"

طارق بھی شوخ ہو کہتا۔ "پگلی میں تو قدرتی حسن کی بات کر رہا ہوں۔ سبزہ پوش، برف پوش پہاڑوں کی کہساروں کی۔۔۔۔۔ پھولوں کی بہاروں کی۔۔۔۔"

دونوں ہنس پڑتے۔

دو ایک دفعہ بینا بھی کابل گئی تھی۔۔۔ فطرت کا حسن انجوائے کرنے کی بجائے اس نے غیر ملکی چیزوں کی خریداری پر توجہ دی تھی۔۔۔۔ کپڑا، کراکری۔ آرائشی چیزیں، الیکٹرک کی، کچن کی چیزیں۔۔۔ جی بھر کر شاپنگ کی تھی اس نے۔۔۔۔۔۔۔

اس کے بعد بھی کئی دفعہ طارق نے بینا کو ساتھ لے جانا چاہا لیکن بینا نے ہر دفعہ

اسے غیر ملکی چیزوں کی ایک لسٹ پکڑا دی تھی، اسے ان چیزوں کی طلب تھی۔ کابل کو کیا دیکھنا تھا۔ جیسا ایک بار دیکھا، ویسا سو بار دیکھا۔

لیکن اب جو طارق گیا تھا۔ تو ان گیارہ دنوں میں وہ کوئی گیارہ ہزار بار سوچ چکی تھی۔

"ایسے مخدوش حالات میں اس نے جانا ہی تھا تو وہ خود بھی ساتھ چلی جاتی۔ فکر تو نہ رہتی۔۔۔ جو کچھ ہوتا دونوں کو ہی ہوتا۔۔۔۔"

گلو چائے کی ٹرالی گھسیٹتا آ گیا۔

"صاحب جی آپ کو صاحب کی کوئی اطلاع ملی ہے؟" گلو نے شاہد سے سوال کیا۔

شاہد نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"خدا خیر کرے۔ صاحب جی خیریت سے ہوں۔" اس نے کندھے پر پڑے جھاڑن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

"خیر ہی سے ہوں گے گلو بادشاہ۔" شاہد نے فضا کو خوشگوار بنانے کے لیے ہنس کر کہا۔ "ان کے کئی جاننے والے ہیں وہاں۔ ایک تو دوست بھی ہے، جس کے ہاں ٹھہرے بھی ہیں اکثر۔"

"ہوں۔" بینا نے کہا۔ "وہی کئی کئی دن روک لیتا ہے۔ شاید اس دفعہ بھی اسی نے نہ آنے دیا ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔۔۔"

بینا نے شاہد کے لیے چائے بنائی۔ پلیٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ٹرالی ہی اس کے سامنے سرکا دی۔ خود خالی چائے پینے لگی۔

شاہد کے جانے کے بعد بینا اور بھی متفکر ہو گئی۔ وسوسے، وہم، سوچیں، سب منفی انداز کی تھیں۔ اسے طارق کے اس دوست پر بھی بہت غصہ آنے لگا، جو ہر دفعہ اسے کئی

کئی دن زبردستی کابل میں روک لیتا تھا۔ اب بھی اسی نے روکا ہوگا۔۔۔ بینا پورے یقین کے ساتھ سوچ رہی تھی۔

بیل بج رہی تھی۔ بینا نے بے دلی سے فون اٹھایا۔ لیکن ہیلو کی آواز پر ہی وہ پہچان گئی کہ طارق بول رہا ہے۔۔۔ سکون اور اطمینان کی لہر اس کے اندر پھیل گئی۔ اتنے دنوں کے انتظار سے گھبرائی ہوئی

تھی۔۔۔۔۔ احوال پرسی کرنے سے پہلے ہی اس پر برس پڑی۔۔۔۔

"کابل جا کر کچھ خیال ہی نہیں رہتا آپ کو، پیچھے بھی کسی کو مرتا جیتا چھوڑ گئے ہیں۔ جان پر بنی ہوئی تھی۔ پنکی اتنا مس کرتی تھی۔۔۔۔۔ سارے رشتے دار پریشان ہیں۔ فون ہی کر دیا ہوتا۔ عجب بے پرواہ آدمی ہیں آپ۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

اس کی ساری باتیں سکون سے سننے کے بعد طارق نے صرف اتنا کہا۔ "رات تک پہنچ جاؤں گا۔۔ آ کر بتاؤں گا سب کچھ۔۔۔"

"بول کہاں سے رہے ہیں۔۔۔۔؟"

"پشاور سے۔"

"بائی ائیر آ جاتے۔"

"گاڑی یہاں ہے۔"۔

"اتنا لمبا سفر کریں گے۔"

"اب ہمدردی جاگ اٹھی۔"

"ہٹئے، نہیں بولوں گی آپ سے۔ اتنا پریشان کیا ہے۔"

"میں خود بھی پریشان رہا ہوں۔۔۔"

"کیوں؟"

"آ کر بتاؤں گا۔"

اور جب طارق پہنچا تو اس کے ساتھ ایک بچی بھی تھی، سرخ و سپید سنہری بالوں والی اڑھائی تین سالہ بچی بے حد خوبصورت تھی۔ بینا نے بڑے تجسس سے اسے دیکھ کر پوچھا۔ "کون ہے یہ؟"

اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے طارق اپنی ٹانگوں سے لپٹ جانے والی پنکی کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

"آپ کے لیے یہ پیاری پیاری گڑیا لایا ہوں۔"

"دکھائیں۔" پنکی نے کمبل کھینچا، سوئی ہوئی بچی ڈسٹرب ہو کر بسورنے کو تھی کہ طارق بولا۔ "چلو اندر چل کر دکھاتے ہیں، جاگ نہ جائے، رونے لگی تو چپ کرانا مشکل ہو گا۔"

"بابا۔۔۔۔" پنکی نے والہانہ پیار سے باپ کی دونوں ٹانگوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے بازوؤں کے گھیرے میں لے لیا۔

"ہائے ہائے، اسے تو اٹھالیں۔ اتنی اداس ہو رہی تھی آپ کے بغیر۔۔۔" بینا نے پنکی کی طرف داری کرتے ہوئے کہا۔

"او میرا بیٹا۔" طارق نے کمبل میں لپٹی بچی کو ایک بازو پر کرتے ہوئے جھک کر دوسرے بازو میں پنکی سمیٹ لیا۔

گلو گاڑی میں سے چیزیں نکالنے لگا۔۔۔ بینا کچھ الجھی الجھی نظر آئی تو طارق بولا۔

"چلو اندر چلیں۔۔۔۔"

"آجاؤ پنکی میرے پاس۔" بینا نے پنکی کو لینا چاہا۔

"اوں ہوں۔۔۔" طارق بولا۔ "رہنے دو اسے، تم اسے اٹھاؤ۔"

بینا نے کمبل میں لپٹی بچی کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔ "یہ ہے کون۔ بتایا نہیں

آپ نے۔۔۔۔"

"بتایا تو ہے بچی ہے۔" طارق نے کہا۔

"کس کی؟" بینا نے بچی کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"انسان کی۔" طارق شوخی سے بولا۔

"اس انسان کا کوئی نام نہیں۔" بینا نے پیاری سی بچی کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔

"پنکی بیٹے۔۔۔ طارق نے پنکی کو پیار کرتے ہوئے پکارا۔ بینا کی بات کا جواب نہیں دیا۔

"بابا۔۔۔" پنکی بولی۔

"ہوں۔"

"میں آپ سے نہیں بولتی۔"

"کیوں؟"

"آپ آئے کیوں نہیں تھے۔۔۔۔"

"اوئے ہوئے۔۔۔۔" طارق نے پھر پیار کر لیا۔ "میرا بیٹا اداس ہو گیا تھا نا۔۔۔"

"اور نہیں تو کیا۔" بینا بولی۔ "جب بھی گاڑی کا ہارن سنتی، اٹھ بھاگتی۔۔۔ بابا آ گئے بابا آ گئے۔"

"کچھ زیادہ ہی دن لگ گئے۔۔۔ اس دفعہ۔۔۔"

"ایک ہفتے کا کہہ کر گئے تھے۔"

"بس ہو گئی دیر۔۔۔۔ کیا کرتا مجبوری تھی۔۔۔"

"فون بھی نہیں کر سکے۔۔۔ ہوں۔۔۔۔"

"ہوں۔" دونوں ہنس پڑے۔ گلو سامان اٹھا کر اندر لے جانے لگا۔

بینا اور طارق بھی دونوں بچیوں کے لے کر اندر آ گئے۔

بچی کو کمبل میں لپیٹے لپیٹے بینا نے صوفے پر ڈال دیا۔ پنکی بابا کی گود میں سما گئی۔۔۔ بینا نے بچی کے متعلق پوچھا تو طارق نے ساری تفصیل بتا دی۔ "رحمان گل سے میرے مراسم تو جب وہ کچھ عرصے کے لیے لاہور میں رہا تھا، بن گئے تھے۔ زیادہ دوستی کابل جانے سے ہوئی۔۔۔ وہ بہت نفیس آدمی ہے۔ پر بیچارہ اس خانہ جنگی کا شکار ہو گیا۔۔ اس کا گھر بالکل تباہ ہو گیا ہے۔ بیوی ماں اور ایک بہن حالیہ بمباری میں مارے گئے۔ وہ خود شدید زخمی ہو گیا۔۔ یہ جانے کیسے معجزانہ طور پر بچ گئی۔"

"اس کا کوئی اور نہیں تھا۔ جس کے حوالے بچی کر دیتے۔" بینا نے پوچھا۔

"دو تین رشتے داروں کا پتا دیا تھا۔۔۔ انہیں تلاش کرنے میں تو اتنے دن لگ گئے۔ وہ جانے کہاں گئے۔ ان کے گھر ویران پڑے تھے۔ چند ایک کے متعلق تو پتہ چلا کہ پاکستان ہجرت کر گئے ہیں۔۔۔ بارڈر پر افغان مہاجرین میں تلاش کرنے کی بھی کوشش کی، کوئی پتہ نہیں ملا۔"

"آپ اسے بتائے بغیر بچی کو لے آئے۔"

"نہیں اس کی خواہش پر ہی لایا ہوں۔ وہ بچی کو محفوظ ہاتھوں میں دینا چاہتا تھا۔ موت کی دہشت ابھی اس کے اعصاب پر تھی۔ اس نے منت کی کہ بچی کو میں ساتھ لے جاؤں۔"

"ہوں۔"

"وہ ٹھیک ہو گیا تو آ کر بچی کو لے جائے گا۔"

"ٹھیک نہ ہوا تو۔" بینا نے کہا تو طارق کو اس کی بات بھونڈی اور بے تکی لگی۔ اس کا منہ تکنے لگا۔

بینا جھجھکے بغیر بولی۔ "کابل کے جو حالات ہیں اور جو آپ نے بتائے ہیں۔" بینا نے تفصیل دوہراتے ہوئے کہا۔ "وہ نہ آ سکا تو پھر کیا ہوا اس بچی کا۔۔۔۔؟"

"ہمارے پاس ہی رہے گی۔۔۔۔ رحمان گل کی امانت ہے۔ وہ آ گیا تو لے جائے

گا۔ نہیں تو سمجھنا کہ پنکی کو خدا نے ایک بہن دے دی ہے۔۔۔۔"

بینا چپ ہو گئی۔۔۔ طارق رحمان گل کے متعلق اسے تفصیل سے بتانے لگا۔ "اس شخص کی بدولت آج میں اس مقام پر ہوں، جتنی مدد میرے کاروبار کو وسعت دینے میں اس نے کی ہے، میں اس کا احسان نہیں اتار سکتا۔ ویسے بھی جب میں کابل گیا۔ اس نے ہمیشہ بھائیوں کی طرح اپنے پاس رکھا، اتنی آؤ بھگت کرتا تھا کہ بتا نہیں سکتا۔ پیار کے رشتے ایسے بھی تو ہوتے ہیں۔"

"ہوں۔۔"

"کابل میں ان دنوں بہت گڑبڑ ہے۔ کچھ پتہ نہیں چلتا، دوست کون، دشمن کون۔۔۔۔ رحمان گل بہت ہی پریشان تھا۔ گھر بار تباہ۔ بیوی مر گئی۔۔۔ ماں بہن سب ختم ہو گئے۔ اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ اس بچی کے لیے وہ بہت متفکر اور پریشان تھا۔ میں اتفاقاً ہی گیا۔ اسے اس طرف سے قدرے اطمینان ہو گیا کہ بچی اب محفوظ ہو گئی ہے۔۔۔"

پھر طارق رحمان گل کی تباہ حالی کا تذکرہ کرتے ہوئے بولا۔ "توبہ کرنی چاہیئے اس طرح تباہ ہوا بیچارہ۔۔۔ گھر بار کاروبار۔۔ کچھ بھی نہیں بچا۔۔۔۔"

بینا بھی بڑی متاثر نظر آ رہی تھی۔۔۔ وہ صوفے پر کمبل میں لپٹی بچی کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"خدا کرے بچی ٹھیک ٹھاک رہے۔" بینا بولی۔

"اداس تو ہو گی۔۔۔لیکن مجبوری ہے، بہلانا پڑے گا۔" طارق نے کہا۔ "ویسے بچہ پیار چاہتا ہے۔۔پیار ملے تو مانوس ہو جائے گی۔"

"ہوں۔"

گلو چائے بنا کر لے آیا تھا۔۔۔سفر کی تکان چائے کی گرما گرم پیالی سے ہی کچھ کم کر

سکتی تھی۔

طارق پنکی کی طرف متوجہ ہو گیا اور بینا طارق کے لیے چائے بنانے لگی۔ گلو کمبل میں لپٹی بچی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "بالکل گڑیا لگتی ہے، ریشمی ریشمی پیاری پیاری سی۔۔۔آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔"

"ساری کی ساری بہت خوبصورت ہے گلو۔۔۔ صبح جاگے تو دیکھ لینا، اب تو کھانا گرم کرو۔۔۔۔آٹھ بج رہے ہیں۔ ہم نے بھی صاحب کے انتظار میں کچھ نہیں کھایا۔۔" بینا نے کہا۔

"اچھا جی۔" گلو کچن کی طرف بڑھ گیا۔۔۔

طارق چائے کی پیالی لیتے ہوئے بولا۔ "کھانے کے بعد چائے پی لیتے۔"

"نہیں جی۔۔آپ چائے پئیں۔ گلو صاحب اتنی جلدی تھوڑے ہی کھانا لگا دیں۔"

طارق نے مسکراتے ہوئے چائے کے گھونٹ حلق سے اتارنے لگا۔

بچی کے چیخ چیخ کر رونے کی آواز آئی تو طارق کی آنکھ کھل گئی۔

"اوہ خدایا، نادرہ رو رہی ہے۔" وہ بولا۔

بینا شاید پہلے ہی جاگ گئی تھی، کروٹ بدلتے ہوئے بولی۔ "کیا ہے۔"

"اٹھا لو نا اسے۔" طارق نے بال سلجھاتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے چپ کہاں ہو گی۔" بینا گرم گرم بستر سے اٹھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ اس بچی کے آنے سے اسے خوشی نہیں ہوئی تھی۔ مفت کی ذمہ داری تھی۔ اسے ذہنی کوفت بھی ہوئی تھی لیکن طارق نے جن حالات کا ذکر کیا تھا، ان کے پیش نظر اپنے احساسات کو بے نقاب نہیں کیا تھا۔

طارق بیڈ سے نکلا۔۔۔ بینا بولی۔ "چپ کرائیں اسے، پنکی کو بھی جگا دے گی۔"

طارق نے بچی کو تھپکا۔۔۔ لیکن وہ روئے گئی۔ مجبوراً طارق کو اسے کمبل میں لپیٹ کر کندھے سے لگانا پڑا۔

"بس بس میری بچی۔۔چپ چپ ہو جا۔۔۔ وہ مانو بلی۔۔۔مارو اسے چپ چپ۔۔۔"

بچی روئے گئی۔ طارق بولا۔ "اردو سمجھتی بھی تو نہیں نا۔"

"فارسی میں لاڈ کریں۔۔" بینا نے کہا۔ اس کے لہجے میں کچھ چبھن تھی۔ جسے طارق نے محسوس نہیں کیا۔۔ پھر اسے فارسی کے ادھورے الفاظ اور اردو ملے جملے سنا سنا کر تھپکنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد بچی سو گئی۔۔۔ طارق نے اسے بیڈ پر اپنے پاس ہی لٹا دیا۔

"یہاں سوئے گی؟" بینا نے کروٹ بدل کر حیرانگی سے کہا۔

"بھئی کیا کریں۔۔ وہاں پھر رونے لگے گی تو کون چپ کرائے گا۔ اتنے دنوں سے میرے پاس ہے۔ مجھ سے کافی مانوس ہو گئی ہے۔ یہیں سونے دو۔۔۔"

وہ خود بھی لیٹ گیا۔۔۔

بینا نے قدرے تشویش سے کہا۔ "کون سنبھالے گا اسے، اچھی خاصی مصیبت ہو گئی۔۔۔ کیا کیا جائے۔"

"ذمے داری لیتے وقت سوچنا چاہئے تھا آپ کو۔"

"کسی کے احسانوں کا بوجھ اتنا زیادہ ہو تو سوچنے کی فرصت نہیں ہوتی۔ بینا بیگم اور پھر اس کے جو حالات تھے۔
میں یہی کر سکتا تھا۔۔"
"مسئلہ ہی بنے گا۔"

"بنانا چاہو تو۔"
"کیا مطلب؟"
"بینا تم عورت ہو۔ اس بچی کو ممتا دے سکتی ہو، ماں کی محبت سے وہ محروم ہو گئی ہے۔ باپ یوں چھوٹ گیا۔۔"
"اچھا جی۔۔ اب سو جائیں۔ ابھی سوچنے کو بہت کچھ ہے۔"
"کوئی مائی ڈھونڈو۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔"
"دیکھوں گی۔۔ آیا کا خرچا برداشت کرنا پڑے گا۔"
"بینا۔۔ پیسے کی فکر مت کرو۔۔ جتنے میں بھی کوئی آیا ملے، رکھ لو۔۔"
"بہت اچھا جناب۔"
اس نے اس کی طرف سے پیٹھ موڑ لی۔ طارق نے بچی کی طرف رخ کر لیا۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں کھوئے کھوئے جانے کب پھر نیند سے ہم آغوش ہو گئے۔
گلو کی بیوی راجاں بال بچوں سے فارغ ہو چکی تھی۔ دونوں بیٹے بیاہ دیئے تھے۔ اور بیٹی بھی گھر بار کی ہو چکی تھی۔۔۔ گلو دن رات یہاں رہتا تھا۔ راجاں کبھی بیٹوں کے پاس چلی جاتی، کبھی بیٹی کے پاس۔ نادرہ کو سنبھالنے کے لیے راجاں سے موزوں عورت کہاں مل سکتی تھی۔ گلو تو دل سے یہی چاہتا تھا۔ بیوی یہاں ہی

رہے اور فالتو پیسے بھی ملتے رہیں۔ طارق ہی کو راجاں کا خیال آیا۔ گلو نے فوراً ہامی بھر لی۔ اور اسی دن راجاں کو جا کر لے آیا۔
دو دن جو آیا یا مائی کے بغیر گزرے تھے، بہت صبر آزما تھے۔ بچی صرف اور صرف طارق سے مانوس تھی۔ اسی کی گود میں چڑھتی رہتی۔ پنکی کو دکھ محسوس ہوتا، وہ کبھی کبھی بابا سے روٹھ جاتی، ضدیں کرنے لگتی۔ کبھی نادرہ کی پٹائی کر دیتی، اسے کھینچ کر بابا کی گود سے اتار دیتی۔

"نہیں بیٹے ایسے نہیں کرتے۔ پیاری پیاری بہن ہے۔ اس کے ساتھ کھیلو، اسے اپنے کھلونے دو۔"
"یہ گندی ہے، گندی ہے۔۔۔" وہ چیختی۔ اسے باہر پھینک دو۔"
"پنکی۔" بینا الجھ جاتی۔ "مت کرو۔"
"آ جاؤ میرے پاس۔۔۔" طارق اسے بھی گود میں بھر لیتا لیکن پنکی کو نادرہ کا وجود گوارا نہ ہوتا۔۔۔ وہ اسے لاتیں مارتی۔ ہاتھوں سے پرے دھکیلتی۔
راجاں آ گئی تو طارق نے شکر ادا کیا۔
"لو بھئی راجاں سنبھالو اسے۔۔ روئے دھوئے گی لیکن پیار سے رکھو گی تو جلدی مانوس ہو جائے گی تم سے۔"
راجاں نے ہاتھ نادرہ کی طرف بڑھائے، وہ طارق کے کندھے سے لگ کر احتجاجاً چیخنے لگی۔
"کیسی پیاری بچی ہے۔ میم کا بچہ لگتی ہے۔" راجاں نے بچی کو پیار سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"اس کی ماں بھی ایسی ہی تھی۔۔۔ بالکل ماں پر ہے۔" طارق نے بچی زبردستی اس کی گود میں دیتے ہوئے کہا۔۔۔ تو جہاندیدہ سی راجاں نے ایک پل کو بڑی عجیب نظروں سے طارق کو دیکھا۔ بینا نے راجاں کی نظروں کا نظروں سے تعاقب کیا۔

"میرے دوست کی بچی ہے۔" طارق جلدی سے بولا۔ "اس کی ماں حالیہ بمباری میں مر گئی ہے۔ اس کا باپ زخمی ہے۔ جب تک وہ ٹھیک نہیں ہو جاتا۔ یہ ہمارے پاس رہے گی۔" طارق نے پوری کہانی تفصیل سے اسے بھی سنا دی۔

"اچھا جی۔" راجاں نے بے یقینی سے پھر اسے دیکھا۔ اس کی نظروں سے طارق کو جانے کیا کوفت ہوئی۔ وہ جلدی سے بولا۔ "اسے اچھی طرح رکھنا ہے۔ پیار سے۔

یہ امانت ہے ہمارے پاس۔"

اچھا صاحب جی۔" وہ بچی کو زبردستی اٹھا کر کمرے سے باہر لے گئی۔

بچی کے زور زور سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ طارق کے چہرے سے پریشانی مترشح تھی۔ جسے بینا بھانپ کر بولی۔ "اب روئے گی تو ضرور بہلائے گی راجاں۔ آپ اس کا دھیان چھوڑ ہی دیں، مانوس ہوتے ہوتے کچھ وقت تو لگے گا۔۔۔"

"خدا کرے بہل جائے۔" طارق بولا۔

بینا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ پنکی کے کھلونے، جو قالین پر ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ اٹھانے لگی۔

طارق پنکی سے باتیں کرنے لگا۔ لیکن اس کے کان بچی کی آواز پر ہی لگے تھے۔ بینا یہ بات اچھی طرح محسوس کر رہی تھی۔

"بی بی جی۔" راجاں نے نادرہ کو خوبصورت فراک پر پھولوں والی سوئیٹر پہناتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔"

"بڑی خوبصورت سوئٹریں اور فراک لائے ہیں صاحب۔"

"ہاں میں ساتھ ہی گئی تھی۔ اس کے پاس کپڑے تھے ہی کہاں۔"

راجاں نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔ "بہت پیار کرتے ہیں صاحب اس سے۔"

"ہوں۔" بینا کو یہ ذکر کچھ اچھا نہ لگا۔

"ایسے جیسے اپنی ہی بیٹی ہو۔۔۔" راجاں نے بات تو معمولی سی کہی۔ لیکن اس ڈھنگ سے کہی کہ بینا کے کان کھڑے ہو گئے۔ پھر بھی وہ کسی وسوسے کو تقویت دیئے بغیر بولی۔

"بن ماں باپ کی ہے۔ ترس تو آتا ہی ہے بیچاری پر۔"

"اس کی ماں بمباری میں مر گئی۔ اور باپ شدید زخمی ہو گیا۔"

"ہو گا۔۔" راجاں نے پھر دیدے گھمائے تو بینا بولی۔

"یقین نہیں آیا تمھیں۔"

"بی بی جی۔۔۔ یقین آئے نہ آئے، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہم نے تو صاحب جی کا حکم بجالانا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

راجاں بڑے پراسرار طریقے سے ہنس پڑی۔ بینا کا ذہن پراگندہ ہو گیا۔

بچی کو نہلا کر اس نے کپڑے بدل دیئے تھے۔ نیوی بلو اور سرخ سوئیٹر میں پھولے گالوں اور ریشمی جھالروں والی پلکوں والی سرخ و سپید بچی بہت ہی پیاری لگ رہی تھی۔۔۔ راجاں مانوس ہو گئی تھی۔۔" جاؤ کھیلو۔۔۔" راجاں نے اس سے کہا۔ بچی قالین پر پڑے کھلونوں کی طرف قدم قدم اٹھاتی چل دی۔

"ویسے ہے بہت خوبصورت۔۔ صاحب کہتے ہیں۔ ساری ماں پر گئی ہے۔۔"

"ہوں۔"

"ماں بھی کیا شے ہو گی۔" راجاں نے بچی کے اتارے ہوئے کپڑے سمیٹتے ہوئے کہا۔ راجاں نے کوئی خدشہ کھل کر تو ظاہر نہ کیا لیکن اس کی باتوں میں جو بس تھی، اس نے بینا کے اندر کچھ غیر محسوس سی ہلچل مچادی۔ بینا اس کمرے سے نکل آئی۔ لاؤنج میں آ بیٹھی۔ گلو کو ایک پیالی چائے بنانے کو کہا اور خود میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔

لیکن

اسے چائے پینے میں لطف ملا، نہ میگزین دیکھنے سے کچھ تسکین ملی۔ اندر ہی اندر جانے

کیا اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ قرار نہیں آ رہا تھا۔ بے چینی ہی بے چینی تھی۔

وہ اٹھ کر باہر آ گئی۔۔۔ چند لمحے لان میں گھومتی رہی۔۔ ذہن کسی بے یقینی کا شکار ہو رہا تھا۔۔۔ وہ گھومنے پھرنے سے بھی سکون نہ حاصل کر پائی۔۔ واپس اندر جانا چاہتی تھی کہ گیٹ سے گاڑی اندر آتی دیکھ کر وہیں رک گئی۔ بڑی چھوٹی بہن اور امی آئی تھیں۔ بڑے بھیا بھی تھے اور ان کے تینوں بچے بھی۔

وہ مسکراتے ہوئے ان کے استقبال کو بڑھی۔ علیک سلیک پوری طرح ہو بھی نہ پائی تھی کہ بڑے بھیا ہنس کر بولے۔ "بھئی ہم تو اس کابلی تحفے کو دیکھنے آئے ہیں۔ جو اس دفعہ طارق کو کابل ٹور میں ملا ہے۔"

"ہائے آپی کہاں ہے وہ بچی۔ سنا ہے بہت خوبصورت ہے؟" بہن تجسس سے بولی۔

"کس نے دے دی طارق کو اپنی بیٹی؟" امی نے سنجیدگی کی آواز میں کہا۔

بھابھی نے ہنس کر بینا کے کان میں سرگوشی کی۔ "یہ طارق نے کوئی چکر تو نہیں چلایا ہوا تھا۔۔۔ دوڑ دوڑ کر کابل جاتے تھے کیوں؟"

سب ہنستے مسکراتے اندر آئے لیکن بینا بوکھلا سی گئی تھی۔ زہر کی ہلاکت خیزی مقدار پر منحصر نہیں ہوتی،

خاصیت پر مبنی ہوتی ہے۔ معمولی باتوں کا زہر بھی ذہن میں اتر جائے تو ہلاکت خیزی کا موجب بن جاتا ہے۔ پہلے راجاں کی باتوں نے بینا کا سکون درہم کیا تھا۔ اب بھابھی کا مسکرانا، طنز تیر کی طرح چبھ گیا۔ وسوسے تو شاید پہلے دن بچی کو دیکھ کر ہی بیدار ہونے کو تھے، جانے کس مصلحت نے ان کو اٹھنے نہیں دیا تھا۔

لیکن

آج راجاں اور بھابھی کی باتوں نے اس کے اندر قیامت کی ہلچل مچادی تھی۔ رات وہ بستر میں چت لیٹی آنکھیں بند کیے سوچتی رہی، کسی کہانی کو جوڑنے کا جتن کیا جائے تو کڑیاں خود بخود مل جاتی ہیں۔ بینا کے ذہن میں بھی کہانی ابھر رہی تھی، طارق کا بار بار کابل جانا۔۔۔

دنوں وہاں ٹھہرنا۔۔۔ پھر اس دفعہ جانے کی پریشانی۔۔ روکنے پر بھی نہ رکنا۔۔ پوچھنے پر بھی نہ رکنا۔۔ پوچھنے پر بھی کچھ نہ بتانا۔ پھر ایک لمبا قیام بغیر کسی اطلاع کے اتنے دن رکے رہنا۔ واپسی پر بچی کا ساتھ۔۔۔۔ کہانی پوری کی پوری تسلسل سے اس کے ذہن میں بنتی جا رہی تھی۔

وہ اپنے ہی خیالوں کی تلخی سے گھبرا گئی۔ بستر میں اٹھ بیٹھی، سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا۔

اس کے پاس ہی طارق بے خبری کی نیند سو رہا تھا۔ اس کے اٹھنے سے بھی وہ ڈسٹرب نہ ہوا۔ اس کی اس قدر پرسکون نیند نے بھی کہانی کے تاثر میں بھرپور حصہ لیا۔۔ بینا یقین کی حدوں کو چھونے لگی۔۔۔ "یہ بچی طارق ہی کی بچی ہے۔" اس نے اپنے ذہن میں اس سوچ کے ساتھ دھماکے محسوس کیے۔ وہ بے دم ہو کر بستر پر گر گئی۔

ساری رات اس پر ڈوبنے ابھرنے کی کیفیت طاری رہی، کبھی تو غصے سے پاگل سی ہو جاتی۔۔ جی چاہتا طارق کا منہ نوچ لے۔ اس کی گردن دبوچ کر اس سے پوچھے کہ یہ کیا گل کھلایا ہے۔۔ کبھی ریت کی دیوار کی طرح

آپوں آپ ہی منہدم ہوتی چلی جاتی۔

اتحاد کی شکست ناقابل برداشت ہوتی ہے۔بینا سمجھ نہ پارہی تھی کہ کیا کرے۔

یہ بچی ملنے جلنے والوں کے لیے بھی ایک موضوع بن گئی تھی۔کوئی طارق کی باتوں کو پورے یقین سے سنتا، اس کے اقدام کو سراہتا۔انسانی ہمدردی اور دوستی کی بنا پر بچی کو اپنے پاس رکھنا عظمت کا نشان تھا۔

لیکن

انہی میں سے بعض لوگ اس کہانی کو من گھڑت قرار دے کر خیال ظاہر کرتے کہ یہ بچی طارق کی کوئی بھول ہے یا اس نے کابل میں کسی افغانی عورت سے شادی کر رکھی ہوگی۔ہوسکتا ہے بچی کی ماں حالیہ بمباری میں مر گئی ہو۔۔طارق اپنی بچی کو وہاں سے لے آیا ہو۔

طارق ایسی باتوں سے بالکل بے خبر تھا۔

اور جن باتوں سے طارق بے خبر تھا۔بینا باخبر تھی۔یہ باتیں اس کے اندر طوفان اٹھا رہی تھیں۔۔۔کھولتے طوفان باہر پھٹ پڑنے کو بے تاب تھے۔

بینا کو اکثر پریشان اور الجھا الجھا طارق بھی دیکھتا تھا۔دو ایک بار اس نے پوچھا بھی۔۔۔لیکن بینا نے کچھ نہیں بتایا۔

"طبیعت خراب ہے کیا؟"

"کیا ہوا تمھیں؟"

"پریشان کیوں رہتی ہو؟"

"کوئی تکلیف ہے؟"

وہ کبھی کبھی پوچھ لیتا۔لیکن بینا کوئی جواب نہ دیتی۔اندر ہی پیچ و تاب کھاتی رہتی۔گھر کی فضا پر طوفانوں کے پیش خیمہ ایسی خاموشی مسلط تھی۔

پنکی کی دیکھا دیکھی نادرہ بھی بینا کی طرف ہمکتے ہوئے بولی۔"ماما۔۔۔۔"

بینا نے جواب دینے کی بجائے اک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔۔۔وہ تیورا کر گری۔

"بینا۔۔۔"طارق گرجا۔۔۔وہ اتفاق ہی سے اس وقت ادھر آ گیا تھا۔پھر آگے بڑھ کر اس نے بچی کو گود میں اٹھایا۔۔۔پیار کرتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔

بینا اک خشونت بھری نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے اندر چلی گئی۔۔طارق بچی کو اٹھائے اٹھائے اس کے پیچھے اندر آ گیا۔

بچی کے ساتھ بینا کا رویہ دن بدن ترش ہوتا جارہا تھا۔لیکن وہ اس بے دردی سے

پیٹ ڈالے۔طارق کو بینا پر بے طرح غصہ آرہا تھا۔

"تھپڑ بچی کے گال پر نہیں، تمہارے دل پر لگا ہے۔اسی لیے تڑپ اٹھے ہو۔"بینا نے خونخوار نظروں سے طارق کو دیکھ کر کہا۔طارق بھنا گیا۔اس عورت کو کیا ہوتا جارہا ہے، کیا ایک معصوم سی بچی اس پر اتنی بار ہو گئی تھی کہ اس بار کو اتار پھینکنے کے درپے تھی۔وہ بچی کا بار توراجاں پر تھا۔یا طارق کی جیب پر۔پھر بینا کو اس کی تکلیف کیوں تھی۔حسن و معصومیت تو ہر دل میں گھر کر لیتے ہیں۔بینا کا من اتنا کٹھور تھا کہ بچی کی معصومیت اور اس کا حسن بھی اس کو متاثر نہ کرتے تھے۔

بینا کی رفاقت میں چھ ساڑھے چھ سال گزر چکے تھے۔اس کا یہ بھیانک رخ اب وہ پہلی بار دیکھ رہا تھا۔۔اسے

ایک لمحہ کو تو یقین ہی نہ آیا کہ یہ بینا ہی ہے۔ بینا جو محبتوں کی امین ہے، چاہتوں کی آبشار ہے، جس نے اس کا دل کبھی نہیں دکھایا، کبھی پریشان نہیں کیا۔ وہی بینا اتنی ظالم اور ایسی سفاک بھی ہو سکتی ہے۔

"بینا تمھیں کیا ہوتا جا رہا ہے۔۔۔؟" اس نے اس کے کندھے پر سر رکھ کر سارا غصہ پی لیا۔

"جو تمھیں ہو گیا ہے۔" وہ غرائی۔

"مجھے؟ مجھے کیا ہوا ہے۔۔۔؟" وہ حیرانگی سے بولا۔

بینا نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔ دونوں ہاتھوں پہ چہرہ گرالیا۔ دوسرے لمحے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

طارق پریشان ہو گیا۔ بچی کو نیچا کھڑا کرتے ہوئے وہ بینا کے ہاتھ چہرے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے بینا کو پکارنے لگا۔

"کیا ہوا ہے، بتاتی کیوں نہیں ہو۔۔" اس نے بینا کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے پوچھا۔

بینا نے دھواں دھواں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اذیت کے کن مرحلوں سے گزر رہی تھی۔ طارق کو بتا نہ سکی۔۔۔ دل میں اٹھنے والے طوفان زبان کی راہ نہ پا سکے۔

کیوں؟

یہ وہ خود بھی نہ سمجھ پائی۔

سوچوں کا طنز یہ وار اس کے ذہن کو کچا پھوڑا بنا رہے تھے۔ وہ بے حد چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔ گھر کے کاموں میں جی لگتا نہ باہر کی فضا راس تھی۔ بے چینی اور بے کلی نے ادھ موا کر دیا تھا۔ طارق سے اسے نفرت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ نادرہ کو دیکھ نہ سکتی تھی۔۔ کئی دفعہ اس نے سب سے چھپ کر اس بچی کو ظالمانہ انداز میں پیٹا تھا۔ بال نوچے تھے۔ گالوں پر چٹکیاں کاٹی تھیں۔ زناٹے دار تھپڑ لگائے تھے۔ بچی اس سے اس قدر

خوف زدہ ہو گئی تھی کہ سامنا ہوتے ہی چیخنے لگتی۔ راجاں نہ ہوتی تو اس کے سلوک سے شاید بچی موت سے ہمکنار ہو چکی ہوتی۔۔۔ نادرہ تو ایک طرف، طارق کے حوالے سے اب وہ پنکی کو بھی مارنے پیٹنے سے باز نہ آتی تھی۔

طارق پریشان تھا۔ گھریلو فضا جو کبھی جنتی رعنائیوں سے معمور لگتی تھی، اب جہنم کی طرح محسوس ہوتی تھی۔۔۔ بچی اتنی بڑی پرابلم بن جائے گی۔ اس نے سوچا ہی کب تھا۔

"کاش رحمان گل ٹھیک ہو کر آجائے۔ اپنی امانت لے جائے۔ مجھے تو لگتا ہے میں اس امانت کا اہل نہیں۔ مجرم بن گیا ہوں۔۔۔" اس دن ناشتے کی میز پر ناشتہ زہر کرتے ہوئے بینا کے کسی طنز پر وہ غصے سے بولا۔

"ہونہہ۔۔۔" بظاہر بینا نے ہنستے ہوئے آواز نکالی۔

"بینا تم مجھے پاگل کر دو گی۔"

"یہ حوصلہ تو تمہارا ہی ہے۔"

"بینا۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو۔"

"تمھیں خود سمجھنا چاہئے۔ ایک معصوم بچی کو تم نے اپنے اعصاب پر اتنی بڑی مصیبت بنا کر سوار کر رکھا ہے۔"

"تو اتارو نا یہ مصیبت۔"

"اتار دینے کی ہوتی تو اب تک میں اتار چکا ہوتا۔ ایک دوست کی امانت ہے بچی۔ وہ آئے گا تو لوٹائی جاسکتی ہے۔"

"بات ہوئی نا۔۔ لوٹانے کا سوال ہی کب پیدا ہوگا۔"

اس کے طنز پر وہ بلبلا کر بولا۔ "تو کیا کروں، باہر پھینک دوں بچی کو۔"

تب بینا ابرو تان کر اسے دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں بولی۔ "تمھیں ایسا کرنا ہی ہوگا۔"

"کیا؟" وہ حیرت زدہ سا اسے تکنے لگا۔

"اس گھر میں یہ بچی رہے گی یا میں۔۔۔"

"بینا۔۔۔۔"

"یہ میرا فیصلہ ہے۔۔۔ بچی۔۔۔"

"کہاں رکھوں بچی کو۔۔"

"اور کوئی ٹھکانہ نہیں تو یتیم خانے بھیج دو۔۔۔"

"بینا۔۔۔" وہ چیخا۔ تو بینا ہنس پڑی۔ یہ ہنسی نہیں، طنز کا بہتا ہوا لاوا تھی۔

"میں اب اسے اور برداشت نہیں کروں گی۔ مجھے رکھو یا اسے۔۔ سمجھے۔۔۔۔" وہ ایک جھٹکے سے کرسی سے اٹھی۔

طارق بھی اس سے زوردار جھٹکے سے اٹھا۔ بینا پر اسے بری طرح غصہ آگیا۔ لال پیلا ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ بچی جب تک اس کا باپ نہیں آجاتا یہیں رہے گی، اسی گھر میں۔ تمہارا

کوئی اور ٹھکانہ ہے تو جاسکتی ہو۔۔۔"

اس نے کرسی کو ٹھوکر ماری اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کھانے کے کمرے سے نکل گیا۔

بینا کے ذہن میں کوئی گنجائش تھی بھی تو آج نکل گئی۔ یقین کو آج پورا یقین آگیا کہ نادرہ طارق کی بچی ہے۔۔۔ اس یقین نے اسے اتنا دکھی کر دیا کہ وہ بے حال ہو کر وہیں گر سی گئی۔ میز پر سر رکھے وہ بچوں کی طرح کتنی دیر روتی رہی۔

شک کا اظہار کر دیا جائے تو وہ شک نہیں رہتا۔ وہم کو دیانت داری سے پرکھا جائے تو اس کی اصلیت سامنے آجاتی ہے۔۔۔ شک اور وہم کا وجود تو اس وقت تک برقرار رہتا ہے، جب تک ان کے سامنے ہتھیار ڈالے رہیں۔۔۔ ان کا اظہار برملا نہ کیا جائے، اس کی اصلیت جانچنے کے لیے کوشش نہ کی جائے۔۔۔ یہ تو چھپے رہزن ہیں۔۔۔ انسانی ذہن کو تاراج کرتے رہتے ہیں۔ تباہی اور ویرانی اس طرح پھیلا دیتے ہیں کہ انہیں برملا ظاہر کرنے اور ان کی اصلیت جاننے کی صلاحیتیں مفقود ہو جاتی ہیں۔

بینا بھی ذہنی تباہی سے دوچار تھی۔۔۔ کوئی مثبت سوچ نہ ابھرتی تھی۔ منفی انداز فکر نے تعمیری پہلوؤں کو ناقص اور ناکارہ بنا دیا تھا۔

اب تو طارق اور بینا کی خوشگوار اور ہنستی مسکراتی زندگی وہم وشک کی پھیلائی ہوئی تباہی سے دوچار تھی۔ ہر وقت لڑائی جھگڑا طارق بھی چڑ گیا تھا۔ اب وہ پنکی سے بھی زیادہ نادرہ پر محبتیں نچھاور کرنے لگا تھا۔ کھلونے کپڑے اور بسکٹ ٹافیاں، ڈھیروں کے حساب سے نادرہ کے لیے لانے لگا۔ اگر اس لڑکی کی معصوم ذات سے چڑ کر بینا گھر تباہ کرنے پر اتری تھی تو سزا کے طور پر ایسا رویہ اس کے خیال میں حق بجانب تھا۔

حالات بد سے بدترین صورت اختیار کر چکے تھے۔ بچی وجہ نزاع بنی رہی۔۔۔ نہ ہی طارق نے کھل کر پوچھا اور نہ ہی بینا نے شک کا اظہار برملا کیا۔ کئی بار اس نے چاہا بھی

کہ طمانچے کی طرح طارق کے منہ پر یہ بات دے مارے۔ چیخ چیخ کر اس کی غلطی کا احساس اسے دلائے لیکن سوچنا آسان تھا، اس پر عمل پیرا ہونا مشکل۔ زبان پر بات آتے آتے رہ جاتی۔

اور

پھر جو بات بینا کھل کر نہ کہہ سکی۔ بینا کی بھابھی ربیعہ نے کہہ دی۔ بینا کئی دن روٹھ کر میکے بیٹھی رہتی تھی۔ پنکی پریشان کرتی تو اسے گھر آنا پڑتا۔۔۔ بندھن مضبوط تو تھے۔ لیکن حالات کی ناسازگاری سے ٹوٹنے پر آجائے۔۔۔ طلاق ہونے میں بھی کسر نہ رہتی۔

ان دنوں بھی بینا میکے روٹھی بیٹھی تھی۔ ماں نے سمجھایا۔ اگر نادرہ طارق کی بیٹی ہے تو اسے قبول کر لینے پر بینا کو آمادہ کرنا چاہا۔ ربیعہ نے بھی بہت مغزماری کی۔

لیکن

بینا نہ مانی۔

ربیعہ بینا کو سمجھا سمجھا کر عاجز آگئی تو اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"طارق بھائی۔۔۔ آپ اعتراف کر لیتے تو معاملہ اس حد تک نہ بگڑتا۔"

ربیعہ ہولے سے بولی۔۔ "بینا کو جو شک ہے کہ۔۔۔۔"

"شک؟ کیسا شک؟" وہ حیرانگی سے بولا۔

"یہی۔ اس بچی کے سلسلے میں۔۔۔۔۔"

"حد ہو گئی بھابھی۔ بینا کی تنگ دلی کمینگی پر اتر آئی ہے، اک بن ماں باپ کی بچی کو اس نے مسئلہ بنا لیا ہے۔ اسے

برداشت ہی نہیں کر سکتی۔۔۔" وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

"پھینک دوں اسے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ آپ اعتراف ہی کر لیتے، شک جنم ہی نہ لیتا۔"

"شک کیسا؟"

"بینا کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"وہ سمجھتی ہے نادرہ آپ کی بچی ہے۔۔۔ کسی افغانی عورت سے۔۔۔"

"بھابھی۔۔۔" طارق چیخا۔۔۔ ربیعہ چپ ہو گئی۔

"غلطی انسان سے ہو جاتی ہے۔ اگر آپ نے وہاں شادی کر لی تھی یا۔۔۔" ربیعہ نے کئی لمحوں کے توقف کے بعد کہنا چاہا تو طارق ماتھے پر مکا مارتے ہوئے بولا۔

"خدا کے لیے بھابھی بس کریں۔"

وہ کئی لمحے مضطرب رہا۔ پھر ٹھوس لہجے میں بولا۔ "تو یہ بات ہے۔ بینا کو مجھ پر شک ہے۔ مجھ پر، میرے کردار پر۔۔۔۔ ہوں۔"

"ہاں طارق بھائی۔۔۔۔"

"تو ٹھیک ہے۔ اگر اس کا اعتماد اتنا کمزور ہے۔ اس کے لیے یقین کے رشتے اتنے جھوٹے ہیں تو ٹھیک ہے۔ وہ جو چاہے کرے۔ یہ بچی میرے پاس ہی رہے گی۔۔۔۔"

ربیعہ اس کی بات سے کچھ سمجھ نہ پائی۔ طارق پھنکارا۔۔ "بھابھی بینا سے کہہ دیں۔ وہ اپنے شک کو اور تقویت

دے لے۔ مجھ پر بھروسے اور اعتماد سے کنارہ کش ہو جائے۔ اتنی سی بات کا اس نے بتنگڑ بنا ہی لیا ہے تو دور ہی رہے مجھ سے۔ وہ مجھ پر شک کرتی رہے۔ جی بھر کر کرتی رہے۔"

"طارق بھائی۔"

"میں آج تک یہی سمجھتا رہا کہ وہ بچی کو ہار جان کر اس کو مسئلہ بنا بیٹھی ہے۔ وہ ایسی تنگ نظر، ایسی شکی اور ایسی وہمی ہے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

وہ پھنکار رہا تھا۔ ربیعہ چپ رہی۔

طارق کو اس بات سے زبردست دھچکا لگا تھا۔ بینا سے اسے نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔

ربیعہ نے معاملے کی سنگینی محسوس کرتے ہوئے بینا کی وکالت کرنا چاہی۔ "اس کا بھی تو قصور نہیں طارق بھائی۔۔ غلط فہمی۔۔۔"

"غلط فہمی ہی کیوں۔ کیا وہ مجھے جانتی نہیں۔۔۔ چھ ساڑھے چھ سال کے عرصے میں بھی وہ مجھے نہیں جان پائی۔ اتنا ذلیل سمجھا ہے مجھے۔ میں نے ساری بات بتادی تھی۔ اس پر اسے یقین کیوں نہ آیا۔۔۔ مجھے جھوٹا، فریبی اور دھوکے باز سمجھتی ہے۔"

وہ چپ ہو گئی۔

طارق غصے سے تلملاتا رہا۔

دن رات کا چکر چلتا رہا۔ بینا کو ماں باپ اور ربیعہ نے پھر مجبور کر کے گھر بھیج دیا۔ لیکن اس دفعہ وہ گھر آئی تو اپنے ہی گھر میں اجنبی بن گئی تھی۔ طارق کو اس سے جیسے کوئی واسطہ ہی نہیں رہا تھا۔ بینا بھی بے تعلق ہو گئی

تھی۔ دونوں ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے صدیوں کے فاصلے پر پڑے تھے۔ طارق کو غصہ تھا کہ بینا نے اس پر بھروسہ نہیں کیا۔ شک کر کے اس کے بے مثال کردار کو داغدار کر دیا۔

ادھر بینا اس کے لاتعلقی کے اظہار سے اپنے اس شک کو اور تقویت دینے جا رہی تھی کہ نادرہ طارق ہی کی بچی ہے۔

مصالحت کی راہیں دونوں ہی نے مسدود کر دی تھیں۔ خاموشی اچھی ہوتی ہے، لڑائی جھگڑے اب نہیں ہوتے تھے۔ ارد گرد کے لوگ نہیں سنتے تھے۔ ماں باپ بھائی بھابی سب سمجھتے تھے کہ خاموشی جب متکلم ہو گی۔ تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن خاموشی

بعض اوقات سنگین بھی ہو جاتی ہے۔ دوریاں۔۔۔ آپوں آپ پھیل جاتی ہیں۔ گرہیں پڑتی جاتی ہیں اور الجھاؤ بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

بینا اور طارق کے حق میں بھی خاموشی سنگینی کا روپ دھار چکی تھی۔ وسوسے، شک اور واہمے زبان نہ ملنے پر اتنے مستحکم ہو چکے تھے کہ ان کے چھٹنے کا امکان ہی نہ رہا تھا؟

دن ہفتوں اور مہینوں کا روپ دھار چکے تھے، چھ ماہ گزر گئے۔

"وہ اب تک ٹھیک ہی نہیں ہوا نا، جو آ کر بیٹی کو لے جاتا۔" بینا کبھی کبھی غصے اور طنز سے ربیعہ سے کہتی۔

"سب بکواس ہے۔ جھوٹ ہے۔ جوں جوں وقت گزر رہا ہے اس جھوٹ کو پول کھلتا جا رہا ہے۔ میں بچی تو نہیں جو کچھ سمجھوں نہیں۔"

کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا کہ طارق کا گریبان پکڑ کر اسے احساس دلائے کہ جھوٹ بول کر تم نے کیا پایا ہے۔ وقت ثابت کر رہا ہے کہ تم نے میرے اعتماد کو لوٹا ہے۔ تم جھوٹے ہو، فریبی ہو۔ دغا باز ہو۔۔۔

لیکن

اس کا موقع ہی نہ ملا۔ یہ وقت ہی نہ آیا کہ ایک سنگین حادثے نے کایا ہی پلٹ دی۔ طارق گاڑی کے حادثے میں ہلاک ہو گیا۔ روٹھے روٹھے ہی ہمیشہ کے لیے روٹھ کر چلا گیا۔ نہ بینا کو احساس دلانے کا موقع ملا۔ نہ طارق کو صفائی پیش کرنے کا وقت ملا۔۔۔۔ دل کی دل میں لیے وہ دنیا سے اٹھ گیا۔ اور دل کی دل میں سمائے بینا اس دنیا میں اکیلی رہ گئی۔ ایک قیامت تھی جو ٹوٹ پڑی تھی۔ بینا کی دنیا تہہ و بالا ہو گئی۔ کئی دن تو صدمے سے نپٹ ہی نہ سکی۔ ذہن درہم برہم ہو گیا۔ بہکی بہکی باتیں کرتی رہتی۔ یقین ہی نہ آتا کہ ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا ہے۔

لیکن جب اس نے حقیقت کو قبول کر لیا۔ سچائی کو مان لیا۔ تو صدمے کی شدت بھی کم ہو گئی۔

ویسے بھی وقت ایسے زخموں کا معالج خود ہی ہوتا ہے۔ زخم مٹتے تو نہیں لیکن اذیت میں کمی ضرور آجاتی ہے۔

بینا بھی کچھ سنبھلی لیکن سنبھلتے ہی نادرہ پر عتاب بن کر ٹوٹنے لگی۔ سارا غصہ، سارا دکھ، ساری اذیتوں کی تسکین کے لیے وہ معصوم بچی کو نشانہ بنا لیتی۔ اسے بے طرح پیٹ ڈالتی۔ ناخن اس کے نرم و گداز بدن میں چبھو دیتی۔ اور جب وہ اذیت سے بلبلا اٹھتی تو بینا کے چہرے پر خوشیاں بے ہنگم انداز میں ناچنے لگتیں۔ کبھی کبھی تو وہ جنونی اور پاگل سی لگنے لگتی۔ بچی کے بدن پر نیل پڑ جاتے تھے۔ چہرے پر خراشیں آجاتی تھیں۔ ایسے میں راجاں ہی تھی جو اسے سینے میں چھپا لینے کی کوشش کرتی۔ سمجھتی وہ بھی اسے طارق ہی کی اولاد تھی۔ پھر بھی انسانی بچہ تھی۔ بچے کا کیا قصور تھا۔ وہ تو فرشتوں جیسی پاکیزہ اور معصوم تھی نا۔

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ بینا کا دکھ اپنی جگہ لیکن اب بھی وہ حسد و رقابت کی آگ میں جھلستی رہتی تھی۔ طارق یاد آتا تو غم اور غصے کی لہریں سینے میں اٹھنے لگتیں۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا اسے قبر سے جھنجھوڑ کا اٹھائے اور

چلا چلا کر پوچھے۔ "کیوں دھوکہ دیا تھا مجھے۔ کیوں اعتراف نہیں کیا اپنے جرم کا۔۔۔۔ کیوں جھوٹ بولتے رہے تھے مجھ سے؟"

اس دن بھی وہ ایسے ہی خیالات میں الجھی بیٹھی تھی۔ آج پھر اس نے دل کا غبار نادرہ پر نکالا تھا۔ اتنا مارا تھا۔ اتنا مارا تھا کہ بے چاری کے منہ سے خون نکل آیا تھا۔

راجاں بچی لے کر گھر سے چلی گئی تھی۔ بنگلے کے پیچھے چھوٹی کھلی زمین تھی۔ وہ بچی کو ادھر لے جا کر پیار کر رہی تھی۔ تھپک رہی تھی۔ اور دانتوں سے نکلا خون اپنے دوپٹے سے صاف کر رہی تھی۔

"ماما۔" بینا کا گھٹنا پکڑ کر پنکی نے زور سے ہلایا۔

"کیا ہے؟" وہ اسے بھی پرے دھکیل کر اٹھی۔

"باہر کوئی آیا ہے جی۔" گلو نے کہا۔ "آپ سے ملنے چاہتا ہے۔ افغانی لگتا ہے۔ شاید صاحب جسے مال بھیجتے تھے کابل، وہ آدمی ہے۔۔۔۔"

"اسے ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔۔۔۔"

"جی بہتر۔"

گلو نے آنے والے کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر بینا کو اطلاع دی۔

"میں آرہی ہوں۔" بینا نے دوپٹہ ڈھنگ سے اوڑھا اور ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی۔

آنے والا کوئی افغانی باشندہ ہی تھا۔ سر پر بڑی سی کالی پگڑی تھی۔ گھیر دار کرتا، اوپر سے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ تنگ موری کی بھاری شلوار، تلے کے کالے کالے موٹے چپل تھے۔

"آپ طارق کی بیگم ہیں۔" اس نے بینا کو سلام کرنے کے بعد پوچھا۔

"جی۔" بینا نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"ہمیں طارق کا سن کر بہت افسوس ہوا۔ وہ ہمارا جگری دوست تھا۔" بینا نے سر جھکا لیا۔

"میرا نام رحمان گل ہے۔۔۔" طارق کی جوانمرگی پر تعزیت کرتے ہوئے اس نے نم آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

"رحمان گل۔" بینا زیر لب بڑبڑائی۔ گھبرا کر اس نے رحمان گل کی طرف دیکھا۔ رحمان گل دفتر سے ہوتا ادھر آیا تھا۔ طارق کی موت کی خبر وہیں سنی تھی۔۔۔ وہ بنیا کو بتا رہا تھا۔

"ہم بڑی مشکلوں سے کابل سے ادھر آیا ہے بیگم صاحب۔ ہم طارق سے اپنی امانت لینے آیا تھا۔ کیا پتہ تھا وہ۔۔۔" اس کی آواز رندھی تھی۔

بینا کو یوں لگا جیسے ساری دنیا گھومنے لگی ہے۔

"ہماری بچی آپ کے پاس امانت ہے۔۔۔" رحمان گل بے صبری سے بولا۔ "اس کو بلا دیں۔ ہم اسے ملنے کے لیے کتنا بے چین ہے۔" رحمان گل بچی کے لیے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے شکریہ ادا کر رہا تھا۔ بینا سن سی ہو گئی۔

"طارق ادھر نہ آجاتا تو پتہ نہیں ہماری بچی کدھر جاتا۔ ہم زخمی تھا۔ جلدی نہ آسکا۔ اب

دونوں اس وقت اتفاق ہی سے ڈرائنگ روم میں تھے۔ جینی نے صوفے پر چھلانگ لگائی، پھر میز پر کودی اور گلدان قالین پر گر گیا۔ کرسٹل کی ایش ٹرے دور جا گری۔ اسد اس کے پیچھے کودا تو میز صوفے کے ساتھ رکھی سائیڈ ٹیبل سے جا ٹکرائی۔ دونوں نے اودھم مچایا ہوا تھا۔۔۔ کھٹ پٹ کی آواز آئی اور دونوں کی کھلکھلاہٹ اور غراہٹ بی بی گل نے سنی تو تیزی سے اندر آئیں۔

جینی چیختے ہوئے دوسرے صوفے کے پیچھے چھپ رہی تھی اور اسد درمیانی میز پر پھلانگ کر صوفے کی

پشت پر آ گیا تھا۔

"اسد!" بی بی گل زور سے بولیں۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"اس چڑیل سے پوچھیں۔" اسد نے بالآخر اس کے بالوں کی مٹھی بھر ہی لی۔

جینی چلائی۔ "بی بی گل۔۔۔۔ میرے بال۔۔۔۔۔۔ گل لالہ۔۔۔۔ بال تو چھوڑیں۔"

بی بی گل آگے بڑھیں۔ اسد کے ہاتھ کو جھٹکا دیا۔۔۔۔ جینی کے بال چھڑائے۔ جینی چھلانگ لگا کر صوفے کے اوپر چڑھی اور ماں سے لپٹ گئی۔۔۔۔ "بی بی گل۔۔۔ بی بی گل۔۔۔۔"

بی بی گل نے بیٹی کو سینے سے لگاتے ہوئے اسد کو گھورا۔ "کیا ہو گیا ہے تمھیں اسد۔"

"کیوں باز نہیں آتی یہ۔۔۔۔" اسد جھلایا۔

"کیا کہتی ہے۔ تجھے۔۔۔" بی بی گل جھلائیں۔

"قربان جاؤں۔" جینی نے شوخی سے کہا اور اسد کی جھلاہٹ سے محفوظ ہوتے ہوئے منہ ماں کی چھاتی میں چھپا لیا۔

"دیکھا۔۔۔۔۔۔۔۔" اسد اس پر جھپٹا۔

"اے ہے۔۔" ماں نے بیٹی کو دونوں بازوؤں کے حصار میں لیتے ہوئے ہنس کر اسد سے کہا۔ "پاگل تو نہیں ہو گئے۔"

"یہ کیوں نہیں باز آتی۔" وہ بولا۔

"صرف قربان جاؤں لالہ یہی کہتی ہوں نا۔"

اسد غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ لیکن گل بی بی ہنس پڑیں۔ "بچے غصہ نہیں کرتے۔ کیا ہوا جو قربان جاؤں کہتی ہے تجھے۔"

"یہ چڑاتی ہے اور کچھ نہیں۔" اسد بولا۔ " جان بوجھ کر کہتی ہے۔"

"خدا کی قسم نہیں۔۔۔" وہ گل بی بی کے سینے سے الگ ہوتے بولی۔ "گل لالہ خدا کی قسم جان بوجھ کر نہیں کہتی۔ آپ میرے بھائی ہیں۔ بہت پیارے بھائی؛ قربان جاؤں آپ پر۔"

اسد کچھ کہنے کو تھا کہ گل بی بی بولیں۔ "بیٹے تم چڑتے کیوں ہوں۔۔۔ یہ کوئی بری بات تو نہیں کہتی۔ ہم لوگ پٹھان ہیں۔ یہ ہماری روایات میں سے ہے۔ کہ جو اچھا لگے اسے دعائیہ کلموں سے بلاتے ہیں۔ قربان جاؤں کہتے ہیں۔ صدقے واری ہوتے ہیں۔"

"بس۔۔۔۔" جینی نے شوخی سے بھائی کو دیکھا۔

"مجھے اچھا نہیں لگتا۔" اسد منہ بناتے ہوئے بولا۔

"اور مجھے بہت اچھا لگتا ہے قربان جاؤں۔" وہ پھر شوخی سے ہنسی۔ تو اسد جز بز ہوتے ہوئے بولا۔

"باز آجاؤ جینی ورنہ۔ کسی دن قربان ہی کر ڈالوں گا تجھے۔ گلا دبا دوں گا تیرا۔۔۔"

جینی ماں سے ہٹ کر اس کے سامنے ہو کر بولی۔ "یہ بھی آزما لو گل لالہ۔۔۔ جینی اپنے بھیا پر قربان ہونے کو ہر وقت تیار ہے۔"

اس نے یہ بات اتنے صدق سے کہی کہ بی بی گل کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا اور اسد کا غصہ بھی فرو ہو گیا۔۔۔ اس نے جینی کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کا سر ادھر ادھر ہلاتے ہوئے بولا۔۔۔۔ "افسوس تو یہ ہے کہ تو میری ایک ہی۔۔۔ بہن ہے۔ دو چار ہوتیں تو سچ مچ

ہی تیر اگلا دبوچ دیتا۔۔۔۔"

بی بی گل صوفے پر بیٹھ گئیں۔ دونوں کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولیں۔ "تم دونوں کا بچپنا کب جائے گا۔ اسی طرح لڑتے مرتے رہو گے۔۔۔"

"یہ ستاتی ہے مجھے۔۔۔" اسد ماں کے پہلو میں بیٹھ گیا۔

"ہر گز نہیں۔ قربان جاؤں۔" جینی نے پھر شوخی سے کہا۔

اسد کو پھر غصہ آیا۔ وہ اٹھ کر جینی کو پکڑنے کو تھا کہ بی بی گل نے بازو سے پکڑ کر بٹھا لیا۔ انہیں بھی ہنسی آگئی۔

"آپ اسے منع کیوں نہیں کرتیں گل بی بی۔" وہ شاکی انداز میں بولا۔

"اے ہے، کیا ہوا جو وہ کہتی ہے۔" بی بی گل بولیں۔

"کہہ دیا نا کہ مجھے پسند نہیں۔" وہ چلایا۔

"اور مجھے پسند ہے قربان جاؤں۔" جینی پھر دوڑ لگانے کے موڈ میں تھی۔ بی بی گل نے پیار سے بیٹی کو دیکھا، مسکراتے ہوئے اسد سے بولیں۔ "اسد تم اتنے بڑے ہو گئے ہو۔"

"جینی چھوٹی ہے؟" ماں کی بات کاٹتے ہوئے اسد غصے سے بولا۔ "لنگور کی طرح لمبی ہو گئی ہے۔ عقل چھو کر نہیں گئی۔"

"بہر حال تم سے تو چھوٹی ہے نا۔۔۔ پیار کا اظہار ہی تو کرتی ہے، مت چڑا کرو۔"

"ہونہہ۔۔۔" اسد نے خونخوار نظروں سے جینی کو دیکھا۔ جو ماں کے ساتھ لگی برابر شوخی سے چڑائے جا رہی تھی۔

"قربان جاؤں گل لالہ اتنا غصہ اچھا نہیں ہوتا۔۔۔" وہ بولی۔ تو بی بی گل بے ساختہ ہنس پڑیں۔

"آپ کہ شہ سے یہ اتنا سر چڑھ رہی ہے۔" اسد اٹھا اور غصے سے پاؤں پٹختا کمرے سے باہر جانے لگا۔

بی بی گل اسے غصے سے جاتا دیکھ کر ہنسے گئیں، سر ادھر ادھر مارتے ہوئے بولیں۔ "انجینئر بن جائے گا اس سال۔ لیکن بچپنا نہیں گیا۔۔۔"

وہ کمرے سے نکل گیا تو بی بی گل جینی کو سرزنش کرتے ہوئے بولیں۔ "تو بھی تو باز نہیں آتی۔ جان بوجھ کر

اسے چڑاتی ہے۔۔۔۔"

جینی مسکرا رہی تھی، کہنے لگتی۔ "بی بی گل خدا کی قسم۔۔۔۔ گل لالہ مجھے اتنے اچھے لگتے ہیں کہ واقعی ان پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے۔"

"بہنوں کے دل بھائیوں کے لیے ہمیشہ سے ہی نرم و گداز ہوتے ہیں۔" بی بی گل نے بیٹی کا ماتھا چوم کر کہا۔ چند لمحے چپ رہیں۔ پھر بولیں۔ "خدا تم دونوں کو خوش رکھے اور تم دونوں کا پیار اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ رہے۔"

"آمین۔" جینی نے ہاتھ اٹھائے اور پھر منہ پر پھیر لیے۔ بی بی گل کو اس کی اس حرکت پر بے طرح پیار آگیا۔

ملک سعد اللہ خان کا آبائی گاؤں تو مردان کے قریب تھا۔ زمین اور باغات تھے۔ لیکن وہ پشاور میں سکونت پزیر تھے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے گاؤں سے تعلق توڑا نہیں تھا۔ چھٹیوں میں بچوں سمیت گاؤں جاتے تھے۔ حویلی میں قیام ہوتا، عزیز رشتہ داروں سے ملنا ملانا ہوتا۔ زمینوں اور باغات کی نگرانی تو قریبی عزیز حشمت خان کے سپرد تھی۔ پھر بھی سعد اللہ خاں گاؤں آتے جاتے رہتے تھے۔۔۔ حشمت خان سے حساب لیتے اور جانچ پڑتال کرتے تھے۔

ملک صاحب کے دو ہی بچے تھے۔ اسد اور زینت، جسے پیار سے جینی کہتے تھے۔ دونوں بچے ماں باپ کی آنکھوں کا تارا تھے۔ اسد جینی سے چھ سال بڑا تھا۔ دونوں میں شروع ہی سے بڑا پیار تھا۔ لیکن لڑتے بھی بہت تھے۔ لڑائی زیادہ تر اسی بات پر ہوتی، جینی

ربان جاؤں کہنے سے باز نہ آتی اور اسد کا پارہ اس بات پر چڑھنے سے نہ رکتا۔ کبھی کبھی تو وہ اسے غصے میں سچ مچ ہی پیٹ ڈالتا۔ بال نوچ لیتا۔ جینی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ رو پڑتی۔ لیکن پھر بھی کہے جاتی۔۔۔۔ "گل

لالہ جتنا چاہو مار لو۔۔۔۔ میں قربان ہی جاؤں گی۔"

وہ دل سے بھائی کو چاہتی تھی۔ کبھی کبھی تو اس کا جی چاہتا کہ اسد پر قربان ہو جائے۔ جن دنوں اسد ۔۔۔۔۔۔۔ ایف ایس سی کر رہا تھا۔ کالج سے اسکوٹر پر آتے ہوئے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔

جینی نے جب ایکسیڈنٹ کی خبر سنی تھی۔ تو دھڑام سے گر کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ اور پھر جب ہوش آیا تو پتہ چلا کہ اسد کو معمولی چوٹیں آئی ہیں تو وہ سجدے میں گر گئی تھی۔ جتنے دن وہ اسپتال رہا، اس کے ساتھ رہی۔ بی بی گل اور آغا جان ہی نے چاہا کہ وہ گھر چلی جایا کرے۔ کچھ دیر آرام کیا کرے۔

لیکن وہ نہ مانی۔

ایک دن جب اسد آنکھیں بند کیے بیڈ پر پڑا تھا۔ جینی نے دیوانہ وار اس کے پلنگ کے گرد چکر لگانا شروع کر دیئے۔ ساتھ ساتھ کہے گئی۔

"گل لالہ کی بیماری میں نے لے لی۔"

اس نے شہنشاہ بابر کا قصہ پڑھ رکھا تھا۔ جس نے ہمایوں کی بیماری میں اس کے گرد سات چکر کاٹے تھے اور یوں بیٹے کی جان بچ گئی تھی اور وہ چند دنوں بعد چل بسا تھا۔ یہ محض اتفاق سہی۔ پھر بھی جینی اسی خلوص سے چکر کاٹ رہی تھی، جس طرح شہنشاہ بابر نے کاٹے تھے۔

اسد اس کے والہانہ اور بے اختیارانہ پیار بھرے جذبے سے بڑا متاثر ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھاتے ہوئے بولا تھا۔ "جینی پھینی کتنی پیاری بہن ہے تو۔۔۔۔ دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش نصیب کوئی ہو سکتا ہے۔"

جینی کے آنسو نکل آئے تھے۔ بولی تھی۔ "گل لالہ آپ جلدی سے اچھے ہو جائیں۔۔۔ آپ کو ان پٹیوں میں

جکڑا ہوا دیکھ نہیں سکتی۔"

"پگلی۔۔ جانتی بھی ہے کہ معمولی زخم ہیں، پھر بھی اتنی فکر مند ہے۔ میں چند دنوں میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔"

"اللہ کرے۔"

اسد کو بھی اس سے بہت پیارا تھا۔۔ وہ اسے کبھی افسردہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بچپن میں تو جب کبھی وہ روتی۔ وہ بھی اس کے ساتھ رویا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ جینی کی بڑی سی گڑیا ٹوٹ گئی۔ اس نے رورو کر برا حال کر لیا۔ اسد بارہ تیرہ سال کا تھا۔ وہ اسے بہلاتا رہا، پیار کرتا رہا۔ اور گڑیا دلانے کا وعدہ کرتا رہا۔ لیکن جب بھی وہ چپ نہ ہوئی۔۔ تو وہ خود بھی اس کے ساتھ زور وشور سے رونے لگا۔۔ بی بی گل آوازیں سن کر آئیں، جب اصلی بات پتہ چلی تو ہنستے ہنستے بے حال ہو گئیں۔ آغا جان کو بھی بتایا، ان دونوں کی دادی آغا بی بی زندہ تھیں۔ انہیں بھی واقعہ سنایا۔ سب ہنستے رہے۔

لیکن دونوں کے پیار نے سب کو بڑا متاثر کیا۔

ان کا بچپن بے مثال محبت کے لاتعداد واقعات سے بھرا ہوا تھا۔ اب دونوں جوان تھے۔ اب بھی محبت ویسی ہی تھی۔ لیکن چڑانا ستانا اب کچھ زیادہ ہی تھا۔۔ کبھی کبھی تو بی بی گل اور آغا جان دونوں کو ڈانٹ دیتے۔۔ جس کے بعد چند دن خاموشی سے گزر جاتے لیکن جونہی موقع ملتا، تو دونوں میں ٹھن جاتی۔

پھر

جینی چڑائے جاتی۔ "قربان جاؤں گل لالہ۔۔ قربان صد قیداری۔۔"

دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔

لیکن نوک جھونک، لڑائی جھگڑے اور چھیڑ چھاڑ میں کوئی فرق نہ آیا۔ اسد انجینئر بن گیا۔

ایک بڑی فرم میں اسے ملازمت بھی مل گئی۔ لیکن بہن بھائی وہی رہے، جو شروع سے تھے۔

جینی اپنے کمرے میں تھی۔ ٹیپ پر کوئی خوبصورت سا نغمہ چل رہا تھا۔ جینی قالین پر الٹی لیٹی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ نغمے کے ترنم کے ساتھ ساتھ سر کو ہولے ہولے جنبش بھی دیئے جا رہی تھی اور پاؤں مدھم سروں پر ہل رہے تھے۔۔ ایف اے کا امتحان دے کر ان دنوں وہ فارغ تھی۔۔ گھر میں نوکر چاکر بہت تھے، پھر بھی وہ کچن میں گھس جایا کرتی تھی۔ رنگا رنگ کھانے بنانا اس کی ہوبی تھی۔۔ یہ کھانے اسد کو بہت پسند تھے لیکن اسے چھیڑنے کے لیے وہ ہمیشہ ناک بھوں چڑھا کر کھانے کھایا کرتا تھا۔

آج بھی اس نے خاص ڈش بنائی تھی۔۔ اس کی ایک دوست نے اسے چکن سالے کی ترکیب بتائی تھی۔ یہ چکن تیار کر کے وہ کمرے میں آ گئی تھی، گل لالہ کا انتظار تھا۔

بی بی گل نے کھانا میز پر لگوا دیا۔ آغا جان کراچی گئے ہوئے تھے، سب لوگ اکٹھا کھانے کے عادی تھے۔ وہ بھی کچھ دیر اسد کا انتظار کرتی رہیں۔ دو بج چکے تھے، اس وقت تک اسے آ جانا چاہئے تھا۔

"جینی۔" وہ کمرے میں آ گئیں۔

"جی بی بی گل۔" جینی اٹھ بیٹھی۔

"کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ اسد ابھی تک نہیں آیا۔"

"بی بی گل آپ نے کھانا کیوں لگوا دیا؟"

"روز لگواتی ہوں۔ پونے دو تک اسد آ جاتا ہے۔ آج جانے کیوں لیٹ ہو گیا۔ کوئی کام پڑ گیا ہو گا۔۔"

"آ جائیں گے۔ انہیں پتا ہے میں نے ان کے لیے آج خاص ڈش بنائی ہے۔"

"سوا دو ہو چکے ہیں۔"

"واقعی۔"

"ہاں۔"

"خدا خیر کرے۔ گل لالہ خیریت سے ہوں۔"

جینی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن اسے زیادہ پریشان نہیں ہونا پڑا۔ گل لالہ کا فون آگیا، وہ آج کھانے پر نہیں آسکتے تھے۔

"کیوں؟" جینی نے جھلا کر پوچھا۔

"بس کچھ کام ہے۔" اسد کی آواز مسکرا رہی تھی۔

"وہ جو چکن میں نے بنایا ہے۔"

"رات کو کھالیں گے۔"

"دوپہر آپ کھانا کہاں کھائیں گے۔"

"دوست کے ساتھ۔"

"کیوں۔۔۔ دوست کو بھی گھر لے آتے۔"

جواب میں اسد ہنس پڑا۔ جینی نے منہ پھلا لیا۔

اسد شام ڈھلے گھر آیا۔ جینی بھوکی بیٹھی رہی۔ بی بی گل کے اصرار پر بھی اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اسد نے سنا تو پیار سے اس کے سر پر تھپکی ماری۔ "بے وقوف لڑکی، اب تو عقل سے کام لیا کرو۔۔۔ مجھے سو کام ہوتے ہیں۔"

"گاڑی آپ کے پاس ہوتی ہے، آکر کھانا تو کھا سکتے ہیں۔ اور خاص کر آج میں نے اتنے پیار سے آپ کے لیے

چکن بنایا تھا۔ لے آتے نا دوست کو بھی ساتھ۔۔۔"

اسد بڑے پراسرار انداز میں مسکرا دیا۔ اس کی آنکھوں میں انوکھی سی چمک تھی۔ کچھ

خفیف سا بھی نظر آیا۔

"کیا بات ہے گل لالہ۔" جینی اسکی پراسرار مسکراہٹ کا راز جاننے کے درپے ہوئی۔

"کچھ نہیں، کچھ نہیں۔" وہ جیسے گھگھیایا۔ "ویسے اب یہ بچپنے چھوڑ دے، دوپہر کا کھانا اب اکثر مس ہوا کرے گا۔"

"کیوں؟"

"بس۔"

"بتائیں گے نہیں۔۔۔"

"بتاؤں گا۔۔۔"

"تو پھر بتائیں نا۔۔۔"

"تجھے بتانے کی بات نہیں۔"

گل لالہ کے چہرے پر پھلجھڑیاں سی تھیں۔ بات اس نے بتائی تو نہیں لیکن جینی سمجھ گئی کہ کوئی بات ہے ضرور۔

"بی بی گل۔"

"ہوں۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔"

"کیا کرے گی۔"

"خالہ سے مل لوں گی۔ ماہ گل سے ملے کتنے دن ہو گئے۔"

"چلو ٹھیک ہے تیار ہو جاؤ۔"

"کتنے دن کا پروگرام ہے۔ باباجانی کے گاؤں گا۔"

"دو چار دن۔ خدا کرے باباجانی ٹھیک ہوں۔ ان کی خیریت دریافت کرنے ہی تو

جا رہی ہوں۔"

"آغا گل نے بتایا تو تھا۔ اب وہ ٹھیک ہیں۔۔۔"

"باپ ہے میرا جینی جان۔ دل چاہ رہا ہے انہیں دیکھنے کو۔"

جینی ہنس پڑی۔ "میں بھی تو ناناجانی کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ ماہ گل بھی آئی ہے، خوب مزہ رہے گا۔۔۔"

جینی بی بی گل کیساتھ باباجانی کے گاؤں جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ باباجانی کا گاؤں چارسدہ سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ بڑا ذرخیز علاقہ تھا۔ باباجانی کی وسیع و عریض زمینیں تھیں۔ باغات تھے۔ اور کچی چار دیواری والی اندر سے پکی حویلیاں تھیں، جن میں ان کی خالہ اور دو ماموں رہتے تھے۔ یہ حویلیاں گاؤں میں تھیں۔ لیکن شہری آسائشوں اور زیبائشوں سے آراستہ تھیں۔ ماہ گل اپنے انجینئر شوہر کے ساتھ اسٹیٹس چلی گئی تھی۔ ان دنوں آئی ہوئی تھی۔ جینی کی اس سے بڑی دوستی تھی۔

باباجانی کی عیادت کے لیے بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ماہ گل کے سسرال والے بھی اور خالو کے بہن بھائی بھی۔ بڑی رونق تھی باباجانی روبصحت تھے۔ اس لیے سب خوش تھے۔ انہی لوگوں میں حیدر خان بھی تھا۔ ماہ گل کا دیور، خوبرو خوش مزاج اور پرکشش سی شخصیت کا مالک حیدر خان ایگریکلچر یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

جینی باباجانی کے پلنگ پر بیٹھی ہولے ہولے ان کا سر دبا رہی تھی کہ وہ بھی کمرے میں آ گیا۔ جینی نے اسے دیکھا اور اس نے جینی کو دیکھا۔ دونوں چند ثانئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ دونوں کو اپنے ہونے کا احساس ہی نہ رہا۔

"آؤ بیٹے۔" باباجانی نے پیار سے بلایا۔ پھر جینی سے بولے۔ "اپنی ماہ گل کے ساتھ آیا ہے۔ قادر خان کا چھوٹا بھائی ہے۔"

"اور آپ؟ باباجانی۔" حیدر نے مسکراتے ہوئے پلنگ کی پائنتی کی طرف کھڑے

ہو کر جینی پر نگاہ ڈال کر پوچھا۔

"اسے نہیں جانتے۔۔" باباجانی نے پیار سے جینی کا گال تھپتھپایا۔ "میری بیٹی ہے زینت، جینی۔۔ بی بی گل کی بیٹی ہے۔ بی بی گل سے تو تم مل چکے ہو نا۔"

"جی باباجانی۔۔۔"

"بیٹھو۔۔"

وہ کرسی پلنگ کے قریب کھینچ کر بیٹھ گیا۔ جینی نے اس کی طرف دیکھا۔ نگاہیں لڑ کھڑا گئیں۔ حیدر کے لبوں پر پھیکی سی مسکان پھیل گئی۔

رات کھانے کی طویل و عریض میز پر پورا خاندان براجمان تھا۔ ان لوگوں کی مہمان نوازی کا تو جواب نہیں تھا۔ آج تو خان ماما نے خاص اہتمام کیا تھا۔ اتنے ڈھیر سارے عزیز جمع تھے۔ ان کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ کھانے کی میز پر حیدر جینی کے مقابل آ بیٹھا۔ خدا جانے یہی جگہ اتفاقاً ملی تھی۔ یا خود ہی جینی کا سامنا چاہا تھا۔ جینی اس کی نگاہوں سے نگاہیں نہ ملا پائی۔ جب بھی اس کی طرف دیکھا، اس کی نگاہ شوق کو چہرے پر مرکوز پایا۔ نگاہوں کی حدت سے وہ گلنار ہو گئی۔ حیدر خان اس کی حیا بار نگاہوں پر مفتون ہو گیا۔

جذبے بے زبان ہوتے ہیں لیکن ہوتے تنومند ہیں۔ آپوں آپ بے زبانی ہی منوا لیتے ہیں۔ خاموشی ہی میں اتنا کچھ کہہ جاتے ہیں کہ الفاظ کی ضرورت ہی نہیں رہتی، چپکے چپکے اقرار ہو جاتا ہے۔

اگلے دن خاندان کے سارے بچے بیرونی لان میں جمع تھے۔ گپ شپ لگ رہی تھی۔ چھوٹے بچے اچھل کود میں مصروف تھے۔ جوان لڑکے لڑکیاں درختوں تلے بیٹھے تھے۔ پڑھائی کی باتیں ہو رہی تھیں۔ حالات حاضرہ پر تبصرے ہو رہے تھے۔ خاندانی روایتوں کو نئے زمانے کی روشنی میں پرکھ کر تنقید اور تنقیص کے پہلو نکالے جا رہے تھے۔

موسم گرم اور خشک تھا۔ لیکن تازہ ہوا بھلی لگ رہی تھی۔

ایکا ایکی ہواؤں میں تیزی آ گئی۔

"لگتا ہے آندھی آئے گی۔" زر گل نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بارش ہونی چاہیے۔" ریشمینہ نے اپنی بلوریں آنکھیں گھمائیں۔

"بہت کم بارش ہوتی ہے اس موسم میں۔ خشک ہی گزر جاتا ہے۔" صمد خان بولا۔

"ہوا تو ٹھنڈی ہے۔" جینی نے کہا۔

حیدر خان نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور آہستگی سے بولا۔ "جنت میں ہوا ٹھنڈی ہی ہوتی ہے۔"

"گویا تو یہ جنت ہے۔۔۔" ریشمینہ نے ہنس کر کہا۔

"جہاں اتنے پیارے پیارے دوست جمع ہوں، وہ جگہ جنت نہیں تو کیا ہے۔" حیدر خان نے دزدیدہ نظروں سے جینی کو دیکھ کر کہا۔ جینی کے گال تمتما اٹھے۔

سب باتیں کرنے لگے۔

"قہوہ چائے منگوائی جائے۔" صمد نے سب سے پوچھا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔ لیکن قہوہ چائے نہیں، دوسری چائے۔۔۔ شیر چائے۔" زر گل نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ گرمیوں میں چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔" صمد ہنسا۔

"ہم لوگ تو گرمی سردی نہیں جانتے۔ چائے کے عادی ہیں۔ جتنی مل جائے پئے جاتے ہیں۔" ریشمینہ بولی۔

"واقعی۔" حیدر نے کہا۔

"کون جائے گا چائے کا کہنے۔" صمد نے لڑکیوں کی طرف دیکھا۔

"کہنے نہیں، بنانے کہو۔۔" حیدر نے کہا۔ "یہ اتنی بہت ساری لڑکیاں بیٹھی ہیں۔

بنا لائیں چائے۔"

"جی نہیں، ہم نہیں اٹھنے کے۔" دو تین لڑکیوں نے کہا۔

"میں بنا لاتی ہوں۔" جینی اٹھی۔

"زندہ باد۔" لڑکوں نے نعرہ لگایا۔ "سب سے اچھی بچی جینی۔۔۔۔"

"لاکھوں میں ایک۔" ریشمینہ نے چھیڑا۔

سب نے قہقہہ لگایا۔ ہنسی کے اس طوفان ہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حیدر نے دل کی آواز سرگوشی کی صورت میں جینی کے کانوں میں اتار دی۔ ہولے سے بولا۔ "چن لیا۔ لاکھوں میں ایک چن لیا۔۔۔"

جینی نے اس کی طرف حیا بار نگاہوں سے دیکھا۔ لیکن حیدر کی نگاہوں میں جو کچھ تھا۔ وہ زیادہ دیر ان نگاہوں کا سامنا نہ کر پائی۔ آنکھیں جھک گئیں۔ لب تھرکنے لگے اور دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں۔

اگلے دن حیدر خان واپس جا رہا تھا۔ وہ اداس تھا۔ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے زندگی کا گھماؤ اپنے محور سے ہٹ رہا

ہے۔کچھ یہی کیفیت جینی کی بھی تھی۔کھو دینے اور پالینے کی حالت تھی۔

گھر میں بہت سے لوگ تھے۔تنہائی کہاں میسر آتی،جو حال دل ایک دوسرے سے کہا جاتا۔آنکھیں ہی تھیں جو بول رہی تھیں،پیغام دے رہی تھیں،دل کی کیفیت بیان کر رہی تھیں۔

جانے سے پہلے بہ مشکل ایک لمحہ ملا۔حیدر جینی کے قریب سے گزرااور گاڑی کا دروازہ کھولنے سے پہلے بولا۔"جینی مجھے بھلانہ دینا۔۔۔تمہاراانتظار میری زندگی ہو گا۔۔۔"جینی کی آنکھیں جانے کیوں بھیگ گئیں۔۔۔بے اختیاری کے عالم میں اس نے ہونٹ کا سرا دانتوں تلے دبالیا۔

وہ اسد کا کمرہ ٹھیک کر رہی تھی۔ایک ہفتہ وہ گاؤں رہ کر آئی تھی۔اسد نے کمرے کا ناس مار دیا تھا۔وہ کمرہ ٹھیک کرتے ہوئے حیدر کے بارے میں سوچ رہی تھی۔دل و دماغ پر اسی کا خیال چھایا تھا۔

"ڈاکو۔"وہ اسد کی الماری ٹھیک کرتے ہوئے زیر لب مسکرائی۔۔"لمحوں میں متاع حیات لوٹ لی۔"

اس نے ہینگر میں اسد کا کوٹ لٹکانے کے لیے اٹھایا۔

"یہ کیا۔"جھک کر اس نے قالین پر گرنے والی تصویر اٹھالی۔

"ہوں۔"وہ ایک حسین سی لڑکی کی تصویر دیکھ کر مسکرائی۔پھر کوٹ کرسی پر پھینک کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔تصویر کو غور سے دیکھا،چہرہ اجنبی تھا۔لیکن اتنا حسین کہ نگاہ ہٹائے نہ ہٹتی تھی۔تصویر اسد کی جیب سے گری تھی اور جینی کے لیے یہ جاننا مشکل نہ تھا کہ یہ لڑکی کون ہے۔یقیناًاسد کی دوست۔۔۔۔۔

"لیکن یہ ہے کون۔"اس نے تصویر کو الٹا پلٹا۔نام نہیں لکھا تھا۔وہ ایک دم کوٹ پر جھپٹی۔شاید کوئی پرزہ مل جائے۔کہ اس حسین چہرے کی شناخت ہو سکے لیکن کچھ نہیں ملا۔

اس نے کوٹ ہینگر میں ڈال کر الماری میں لٹکایا۔پھر جلدی جلدی کمرے کی ترتیب ٹھیک کی اور مسکراتے

ہوئے تصویر چرا کے اپنے کمرے میں لے آئی۔

"قربان جاؤں گل لالہ۔کیا انتخاب ہے۔کتنی پیاری جوڑی ہو گی۔۔۔"وہ تصویر کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے باتیں کرنے لگی۔

جینی سے صبر کہاں ہو سکتا تھا۔وہ گل لالہ سے پوچھنے کو بے چین تھی۔اس رات کھانا کھانے کے بعد وہ اسد کے کمرے میں جا پہنچی۔وہ مسکرا رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔"اسد نے پوچھا۔"بڑی خوش نظر آ رہی ہو۔"

"قربان جاؤں۔"

"جینی۔۔۔۔۔۔۔باز آجاؤ۔"

"بالکل نہیں آؤں گی باز۔۔۔۔آپ جانتے ہیں۔"

"پٹ جاؤ گی۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔۔قربان جاؤں۔"

اسد نے ماتھا ہاتھ پر ٹکا لیا۔

جینی ہنس پڑی۔

پھر کرسی کی پشت پر آتے ہوئے بولی۔"گل لالہ۔"

"ہوں۔"

"ایک بات پوچھوں۔"

"کیا؟"گل لالہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ ہنستے ہوئے گھوم کر اس کے سامنے آبیٹھی۔اسد اسے تکنے لگا۔

"کیا بات ہے۔"اس نے پوچھا۔

"آپ کی کوئی چیز کھوئی ہے۔"اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"کیا۔"وہ بھی کھلکھلائی۔

"ان دنوں تو خود کھو گیا ہوں۔"وہ ہنس کو بولا۔

"اچھا جی۔۔۔ہوں۔ سمجھ گئی۔"

"کیا سمجھی ہو۔۔۔"

جینی نے اس کی آنکھوں میں شوخی سے آنکھیں ڈال کر ہنستے ہوئے کہا۔"بہت کچھ گل لالہ۔۔۔قربان جاؤں بہت کچھ۔"

"یعنی۔۔۔"

"یعنی یہ۔۔۔"اس نے ہاتھ میں پکڑی تصویر جو دوپٹے میں چھپا رکھی تھی، گل لالہ کے

سامنے کر دی۔

اسد پر ایک لمحہ کو گھبراہٹ طاری ہوئی لیکن پھر ہنس پڑا۔۔۔"یہ کہاں ملی تھی۔"

"ڈھونڈ لی۔"

"تلاشی لیتی رہتی ہو میری۔"

"یہ کون ہے؟"

"اک لڑکی۔"

"نام و پتہ۔۔۔"

"تمھیں کیا۔۔۔"

"میں ہی کام آؤں گی قربان جاؤں۔۔۔بتا دیجئے۔"

وہ ہنس پڑا۔

پھر اس نے تہمینہ آفریدی کے متعلق جینی کو سب کچھ بتا دیا۔یہ حسین و جمیل لڑکی بہت بڑے آفریدی خاندان کی بیٹی تھی۔ان لوگوں کی طرح یہ لوگ بھی سوات کا علاقہ چھوڑ کر پشاور میں آباد ہو چکے تھے۔بے شمار زمینیں اور باغات تھے۔شہر میں بھی کافی جائیداد تھی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔دونوں پیار کے اٹوٹ بندھن میں جکڑے تھے۔زندگی بھر ساتھ دینے کے عہد و پیمان ہو چکے تھے۔دونوں اکثر ملتے رہتے تھے۔ تہمینہ کے والدین سے بھی وہ مل چکا تھا،وہ اسد کو پسند کرتے تھے۔

جینی حیرانگی اور خوشی کے ملے جلے جذبوں سے مغلوب ہو کر باتیں سن رہی تھی۔اسد مسکراتے ہوئے بولا۔

"جس دوپہر میں گھر پہ کھانا نہ کھاؤں، سمجھ لیا کرو کہ تہمینہ کے ساتھ ہوں۔۔۔کسی ہوٹل میں یا اس کے گھر۔"

"یہ بات ہے۔"وہ مسکرائی۔

"بالکل۔"وہ بھی ہنسا۔

جینی بڑے تجسس سے گل لالہ سے تہمینہ کی باتیں پوچھتی رہی۔وہ بھی بے تکلفی سے اسے بتاتا رہا۔

"میں تمھیں بتانے ہی والا تھا۔"اسد نے مسکرا کر کہا۔

"سچی۔"وہ خوش ہو کر بولی۔

"ہاں۔بی بی گل سے اب میں تھوڑا ہی کہہ سکتا ہوں۔تم ہی کہو گی نا ان سے۔۔۔"

وہ شوخی سے بولی۔"جو میں نہ کہوں تو۔۔۔"

"جینی۔۔"اسد سنجیدہ ہو گیا۔"تہمینہ مجھے بے حد عزیز ہے۔میری زندگی میں آنے والی وہ پہلی لڑکی ہے۔۔۔وہ میری سب سے عزیز متاع ہے۔میں اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔۔"

جینی بڑی متاثر ہوئی۔اسد کرسی سے اٹھا اور اس کے سر پر تھپکی لگاتے ہوئے ولا۔"اپنے گل لالہ کی زندگی۔۔۔چاہتی ہو تو تہمینہ کے لیے بی بی گل سے بات کرو۔نہیں چاہتی تو۔"

"ہائے گل لالہ۔۔۔"اس نے گھبرا کر اسد کا ہاتھ پکڑ لیا۔"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔تہمینہ کے لیے مجھے جان کی بازی بھی لگانا پڑی تو لگا دوں گی۔۔۔۔"

"اوہ میری پیاری پیاری جینی پھپھنی۔"گل لالہ نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر پیار سے دائیں بائیں گھمایا۔

وہ مسکرا دی۔

ماہ گل نے کچھ شاپنگ کرنا تھی۔وہ اسی سلسلے میں دو تین دن کے لیے پشاور آئی۔بی بی گل اس کی پھوپھی تھی۔ اپنا گھر تھا،اس لیے بنا اطلاع ہی چلی آئی۔

اس کے ساتھ حیدر بھی آیا تھا۔

"میں تو ڈرائیور کے ساتھ ہی آ رہی تھی۔عین وقت پر حیدر تیار ہو گیا کہنے لگا بھابھی۔میں ساتھ چلتا ہوں۔" ماہ گل بی بی گل سے گلے ملتے ہوئے بولی۔

"بڑی خوشی ہوئی۔"بی بی گل نے ماہ گل کو پیار کرنے کے بعد حیدر کے سر پر ہاتھ پھیرا۔جس نے بی بی گل کو مودبانہ آداب کیا تھا۔

"میرے آنے سے آپ ناراض تو نہیں ہوئیں؟"حیدر نے خوش دلی سے کہا۔

بی بی گل اس کی خوش دلی پر مسکرائیں۔"تم غیر نہیں ہو،ہم تو غیروں کے آنے پر بھی خوشی کا اظہار کرتے ہیں بیٹے۔"

"شکریہ بی بی گل۔"وہ مسکرایا۔

حیدر آغا جان سے بھی تپاک سے ملا۔انہوں نے بھی خندہ پیشانی سے پزیرائی کی۔اسد سے علیک سلیک پہلے بھی تھی۔دونوں مل کر بہت خوش ہوئے۔

خوشی تو جینی کی دیدنی تھی۔آنکھوں میں ستاروں کی چمک بھر گئی تھی۔چہرے پر قوس قزح کے رنگ لہرانے لگے تھے۔ہونٹوں پر بھیگی بھیگی مسکراہٹ بڑی جاندار ہو گئی تھی۔

ماہ گل اور حیدر دو دن یہاں رہے۔ماہ گل کو شاپنگ سے فرصت نہ ملی۔بی بی گل کو بھی ساتھ لیے پھرتی۔ حیدر کو جینی کی قربت کا موقع میسر آیا۔

اس دن گھر میں دونوں کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔حیدر نے اپنی بے قراریوں اور بے تابیوں کی ساری داستان اس کے گوش گزرا کر دی تھی۔جینی شرمائی لجائی اس کی سنتی رہی تھی۔۔۔اور من ہی من میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔لیکن اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔لیکن اس کے انداز نے دلی۔۔۔جذبات حیدر پر واضح کر دیئے۔

وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

"جینی میرا آخری تعلیمی سال ہے۔اس کے بعد میں اپنے گھر والوں کو سوالی بنا کر بی بی گل

کے پاس بھیجوں گا۔ایک سال اور گزار لو گی نا۔۔۔"

جینی نے سر جھکا لیا۔اس کی زبان تو گنگ تھی۔لیکن پلکوں کی لرزشیں حال دل کہے جا رہی تھیں۔

ماہ گل دو دن رہی۔ حیدر تو اس قیام کی طوالت چاہتا تھا۔ جب آغا جان اور بی بی گل نے ماہ گل سے کہا۔ "دو دن تو تم نے شاپنگ میں گزار دیئے۔ کیا صرف شاپنگ ہی کرنے آئی تھیں۔ ہم سے ملنے آتیں تو آرام سے ہمارے پاس رہتیں۔"

ماہ گل ہنس کر بولی۔ "آغا جان آپ کی محبت ہی تو کھینچ لائی۔۔۔ ورنہ شاپنگ واپسی پر کراچی سے بھی کر سکتی تھی۔"

"محبت کھینچ لائی۔" جب ماہ گل نے کہا تو حیدر نے کن آنکھیوں سے جینی کو دیکھا اور اثباتی انداز میں گردن کو ہولے سے جنبش دے کر اپنا مفہوم اس پر واضح کر دیا۔

آنکھوں کی زبان نہیں انداز بولتے ہیں لیکن پرکھنے والی آنکھیں سب کچھ پرکھ لیتی ہیں۔ حیدر اور جینی کے تاثرات پر کسی نے دھیان دیا ہو یا نہ ہو۔ اسد نے ان کی صداقتوں کو بڑی حد تک محسوس کر لیا۔ ماہ گل اور حیدر کے چلے جانے کے بعد جینی پر جو چپ کا دورہ پڑا۔ یہ بھی ان صداقتوں کا ایک ثبوت تھا۔ اسد بہت کچھ جان گیا اور یہ جان کر اسے خوشی بھی ہوئی۔ حیدر خان اور اس کا خاندان دیکھا بھالا تھا۔ محتاج تعارف نہیں تھا۔ گو ان کے پاس بہت زیادہ زمینیں اور باغات نہیں تھے پھر بھی تعلیمی میدان میں یہ خاندان بہت آگے تھا۔ شجاعت اور بہادری میں بھی بے مثال تھا۔ شرافت بھی مسلم تھی۔

اسد نے دل ہی دل میں جانچا پرکھا اور خوش ہوا۔ جینی کے لیے اس سے اچھا رشتہ اور کون سا ہو سکتا تھا اور جب رشتوں کی خواہش میں پسند کے رشتے بھی شامل ہو جائیں تو کیا کہنے۔

اسد کا جی تو چاہا کہ جینی کو کریدے چھیڑے۔ ستائے۔ لیکن ایک تو وہ بہن تھی،

دوسرے چھوٹی تھی۔ پاس ادب جینی کی زبان کھولنے میں مانع ہوتا۔ اس لیے وہ چپ ہی رہا۔ بی بی گل اور آغا

جان نے بھی حیدر کو بہت پسند کیا۔ جینی ماں باپ کے منہ سے اس کی تعریفیں سن سن کر گلنار ہوتی رہی، اس کی خواہش پر اسد نازاں ہوتا رہا۔

جینی نے تہمینہ کے متعلق بی بی گل کو بتایا۔ بی بی گل نے آغا جان سے بات کی۔ وہ گل زمان آفریدی کو جانتے تھے۔

"اگر وہ لوگ رضامند ہوں تو رشتہ کرنے میں کیا حرج ہے۔ بہت با وقار لوگ ہیں۔ بہت مانا ہوا خاندان ہے، شرافت نجابت اور خاندانی عظمت میں یہ لوگ بہت آگے ہیں۔" آغا جان نے تبصرہ کیا۔

بی بی گل بولیں۔ "رضامندی تو بعد میں پتہ چلے گی، پہلے رشتہ لے کر جائیں تو سہی۔ مانگنا تو ہمیں ہے۔"

جینی جھٹ سے بولی۔ "ہم کسی سے کم ہیں۔ ہمارے گل لالہ سا کوئی ہوگا۔ لاکھوں کروڑوں میں بھی نہیں ملے گا ایسا۔ قربان جاؤں اپنے گل لالہ کے، ساری دنیا میں اس سا کوئی نہیں۔"

آغا جان اور بی بی گل اس کی بات پر ہنس پڑے۔ اس کو گل لالہ سے کتنا پیار تھا، وہ بڑے متاثر ہوئے۔

آغا جان نے رشتہ لے جانے کی اجازت دے دی، جینی خوشی سے پھولی نہ سمائی۔

آغا جان کمرے سے چلے گئے تو وہ خوشی سے ناچنے لگی۔ چاند سی بھابھی جان سے زیادہ پیاری، گل لالہ کے لیے اسکا تصور ہی جانفزا تھا۔

بی بی گل بھی خوش تھیں۔ اتنے اچھے خاندان میں رشتہ جوڑنا بڑی بات تھی۔

اس دن جینی نے اسد کے آتے ہی شوخی دکھائی۔ بڑی کاوش سے منہ بنایا۔

"گل لالہ۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"ہوں۔"

"میں نے آپ کی تہمینہ کی بات بی بی گل سے کی تھی۔"

"ہاں۔" وہ بے تابی سے بولا۔

"بی بی گل تو خوش تھیں۔ لیکن۔۔۔۔۔"

"لیکن کیا۔"

"آغا جان نہیں مانتے۔"

"کیوں۔"

"بس آغا جان کو آپ جانتے ہیں۔ ہاں کر دی تو ہاں، نہ کر دی تو نہ۔ ان سے کبھی وجہ پوچھنے کی جرأت کر سکا ہے؟"

اسد کا چہرہ اتر گیا۔ سیاہ بدلیاں سی اس کے خوبصورت چہرے پر لہرائیں۔ وہ بریف کیس اٹھائے، بنا کچھ کہے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

جینی ہنسی دباتی دبے دبے پاؤں چلتی اس کے پیچھے آئی۔

اسد نے بریف کیس غصے سے پھینکا۔ ٹائی نوچ کر ڈھیلی کی اور کرسی میں گر گیا۔

"گل لالہ۔" جینی کرسی کی پشت پر آ کر بے چین ہو کر بولی۔

"جینی۔" اس نے جینی کو کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر کہا۔ "آغا جان سے بے شک کہہ دینا۔ انہوں نے رضا مندی نہ دی تو میں مر جاؤں۔۔۔۔"

جینی نے تڑپ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیئے۔ مذاق اتنا مہنگا پڑے گا، اس نے کب سوچا تھا۔ گھبرا کر وہ اس کے سامنے آئی اور جلدی سے بولی۔ "میں تو مذاق کر رہی تھی۔ قربان جاؤں آغا جان نے تو بخوشی اجازت

دے دی ہے۔"

"سچ۔"

"ہاں۔"

اسد نے اس کے بالوں میں مٹھی بھر کر پیار سے جھنجھوڑا۔ "آئندہ ایسا مذاق نہ کرنا جینی، مر جائے گا تمہارا گل لالہ۔۔۔"

جینی روہانسی ہو گئی۔۔۔ اسد جانتا تھا مر جانے کا لفظ بھی وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لیے زیادہ رعب دے رہا تھا۔

وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "معاف کر دیں گل لالہ۔ میں نے چھیڑا تھا یونہی ہم تو اس جمعہ کو باقاعدہ رشتہ لے کر جا رہے ہیں۔ بات طے کر کے آئیں گے انشاءاللہ۔ قربان جاؤں آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

اب اسد شوخ ہو گیا۔ جان بوجھ کر چھیڑا۔ "بات طے نہ ہو سکی تو کیا بنے گا۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا قربان جاؤں۔۔۔ یہ رشتہ ضرور ہو گا۔ بات مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"بڑی آئیں اماں بی۔" وہ ہنسا۔

جینی نے مستحکم انداز میں کہا۔ "اماں بی۔ بننا پڑا تو وہ بھی بن جاؤں گی۔ چلئے یقین کر لیجیے تہمینہ آپ کی ہو گی بس۔۔۔"

دونوں ہنس پڑے۔

جینی بڑے اہتمام سے تیار ہوئی۔ اپنے من پسند کپڑے پہنے، لمبے سیاہ بالوں کو برش کر کے پشت پر کھلا چھوڑ

دیا۔ کالی آنکھوں اور سنہری رنگت والی جینی کے چہرے پر خوشی سے انوکھا سا نکھار آ گیا تھا۔ آج وہ گل لالہ کے لیے تہمینہ کو مانگنے جا رہی تھی۔ بی بی گل بھی تیار ہو گئی تھیں۔ ہلکے بادامی ریشمی کپڑوں پر انہوں نے شیفون کا کھلا دوپٹہ اوڑھا تھا۔ ہلکا سا میک اپ کیا تھا۔ گلے میں پرل کی دو لڑیاں پہنی تھیں وہ بہت باوقار نظر آ رہی تھیں۔ جینی نے ماں کے گال پر پیار کرتے ہوئے کہا۔ "آج تو بڑا روپ آیا ہے آپ پر۔"

"بیٹے کا گھر بسانے کی خوشی ہے جانی۔" بی بی گل نے بھی جواباً بیٹی کا ماتھا چوما۔

آغا جان نے بھی بی بی گل پر پیار سے نگاہ ڈالی۔ اسد بھی مسکرایا۔

دونوں ماں بیٹی کو گاڑی میں بٹھایا۔ آغا جان نے دعا کی۔ "خدا کرے کامیاب لوٹو۔"

یہی صدا اس کے دل سے بھی نکلی۔۔۔ کامیابی کا یقین تو تھا، پھر بھی خدانخواستہ کوئی رکاوٹ پیدا ہو جاتی تو۔

ماں بیٹی تہمینہ کے ہاں گئیں۔ انہیں آمد سے مطلع کیا گیا تھا۔ اسی لیے آفریدی، ان کی بیگم شاہ گل اور دونوں بڑے بیٹے زین اور عثمان ڈرائنگ روم کے دروازے پر معزز مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھے۔

انہیں بڑے خلوص سے خوش آمدید کہا گیا۔

سب ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ آفریدی نے اپنے بیٹوں اور بیگم کا تعارف کروایا۔ جینی کو بھی گل بی بی نے سب سے ملایا۔

رسمی سی باتیں ہونے لگیں۔

"تہمینہ کہاں ہے؟" جینی نے بے چینی سے پوچھا۔ اسے دیکھنے کے شوق میں وہ مری جا رہی تھی۔

"آ رہی ہے۔" گل شاہ نے پیار سے جینی کو دیکھا۔ پیار بھری نگاہیں ایک اور طرف سے بھی جینی پر مرکوز تھیں۔

یہ زین تھا۔ خوبرو نوجوان۔ جو حال ہی میں امریکہ سے ایم بی اے کر کے واپس آیا تھا۔ وہ آفریدی کا بڑا بیٹا تھا۔ جینی پہلی ہی نگاہ میں دل کو بھا گئی تھی۔ حسیناؤں کے دیس میں کئی سال رہ کر آنے والے زین کو سیاہ آنکھوں، کھلے گھٹاؤں ایسے لمبے بالوں اور سنہری رنگت والی شرمیلی سی

لڑکی بے طرح بھا گئی تھی۔

تہمینہ آ گئی۔۔۔

جینی بے اختیارانہ اٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔۔ وہ اپنی تصویر سے بھی زیادہ حسین تھی۔

بی بی گل نے بھی تہمینہ کو پیار کیا۔۔۔ لڑکی انہیں بہت اچھی لگی تھی۔ اسد اور اس کی جوڑی خوب تھی۔ تہمینہ اور جینی ایک ہی صوفے پر بیٹھ گئیں۔ تہمینہ کچھ لجائی شرمائی بیٹھی تھی۔ جینی تو اس کی ایک ایک ادا پر واری ہو رہی تھی۔

زین اسے تکے جا رہا تھا۔

ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ملازم کھانے پینے کی چیزیں ٹرالی پر لے آیا تھا۔ خاطر مدارات ضروری تھی۔۔۔ تہمینہ نے سب کو پلیٹیں پیش کیں۔ کھانے پینے کی چیزیں آفر کیں۔

جب یہ مرحلہ طے ہو چکا اور بزرگوں میں سنجیدگی سے باتیں ہونے لگیں تو تہمینہ ماں کے اشارے پر اٹھ گئی۔ جینی بھی اس کے ساتھ گئی۔ پھر زین اور عثمان بھی باہر چلے گئے۔ عثمان کو تو کسی دوست سے ملنے جانا تھا۔ زین تہمینہ اور جینی کے ساتھ لان میں آ گیا۔

جینی تو تہمینہ ہی کی دیوانی تھی۔ اس کے ساتھ باتیں کیے جا رہی تھی۔۔ زین نے بھی زیادہ باتیں نہیں کیں۔ اس لڑکی کے حسن و جمال میں کھویا، اس کے والہانہ پن ہی سے محفوظ ہوتا رہا۔

بی بی گل کی آمد کا مدعا تو گھر والوں کو معلوم ہی تھا۔ پھر انہوں نے بھی بڑی انکساری سے دامن پھیلایا۔ اسد کے لیے تہمینہ کا ہاتھ مانگا۔

اسد کو گھر والے جانتے تھے، پسند بھی کر چکے تھے۔ آفریدی روشن خیال آدمی تھے۔

بیٹی کی پسند کا بھی تھوڑا بہت پتا تھا۔ وہ اسی وقت ہاں کرنے کو تیار تھے کہ شاہ گل نے رسم دنیا نبھانے کو کہا۔

"کچھ دن سوچنے کی مہلت دیں۔"

"ضرور ضرور۔۔۔" بی بی گل نے فراخدلی سے کہا۔ "لیکن تہمینہ میری بچی ہے۔" شاہ گل اور آفریدی ہنس پڑے۔

پر تکلف سی چائے سب نے مل کر پی۔۔۔ شام گہری ہو گئی تھی۔ جینی کا جی تو نہیں چاہتا تھا لیکن بی بی گل نے رخصت کی اجازت چاہی تو اسے بھی اٹھنا پڑا۔

واپسی سے پہلے بی بی گل نے ان لوگوں کو بھی گھر آنے کی دعوت دی۔ دوسرے جمعہ کو انہیں گھر بلا لیا۔

بڑی پر تکلف دعوت کا اہتمام تھا۔ جینی نے بڑے شوق سے کئی چیزیں اپنے ہاتھ سے بنائی تھیں۔ ڈائنگ روم کی ساری ترتیب بدلی تھی۔ قیمتی برتن نکالے تھے۔ اس کا تو خوشی سے زمین پر پاؤں نہیں پڑ رہا تھا۔ ناچ رہی تھی۔۔۔ گنگنا رہی تھی۔۔۔ خوشیاں منا رہی تھی۔۔۔ اسد کے تو صدقے واری ہو رہی تھی۔ قربان جا رہی تھی۔ آج تو اسد بھی اس کے قربان جانے پر نہیں چڑ رہا تھا۔ بہت خوش تھا۔

وقت مقررہ پر مہمان آ گئے۔ شاہ گل اور آفریدی کے ساتھ زین بھی آیا تھا۔ سب بڑے تپاک اور محبت سے ملے۔ شاہ گل نے اسد اور جینی دونوں کو بازوؤں میں بھر لیا۔ جینی کو بہت پیار کیا۔

جینی نے اسد کے قریب سے گزرتے ہوئے خوش دلی سے سرگوشی کی۔ "بات بن گئی گل لالہ۔۔۔ مبارک ہو۔"

"تمھیں بھی۔" اسد بھی خوش تھا۔

وہ اتراتی ہوئی شاہ گل کے پاس جا بیٹھی۔

چائے پورے لوازمات کے ساتھ پی گئی۔۔۔ پھر زین اور اسد دوسرے کمرے میں جا بیٹھے۔ اور جینی رات کے کھانے کی تیاری دیکھنے چلی گئی۔

یوں بھی سمجھ دار بچے تھے، بزرگوں کو باتیں کرنے کا موقع دینا ہی تھا۔

ان کے جاتے ہی رشتے ناتے کی باتیں ہوئیں۔ انہیں برا بھلا بھی کہا گیا لیکن وہ رسوم ادا کرنے کی باتیں بھی ہوئیں۔

"ہمارا تو ایک ہی بیٹا ہے۔ میں تو ساری رسمیں ادا کروں کی انشااللہ۔" بی بی گل نے کہا۔

شاہ گل ہنس کر بولیں۔ "وہ ظاہر ہے۔ ہم رسمیں منانے کی باتیں ہی کرتے ہیں، عملاً کچھ نہیں کرتے۔"

"اچھی ہی لگتی ہیں۔ شادی کا مزہ ان رسوم ہی سے تو ہے۔۔۔" بی بی گل بولیں۔

چند منٹ یہی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر آفریدی نے شاہ گل سے کچھ ہولے سے کہا۔ وہ ہنس پڑیں۔ صوفے پر سیدھی ہو کر بیٹھتی ہوئی بولی۔

"اس دن آپ ہمارے ہاں سوالی بن کر آئے تھے بی بی گل۔"

"جی بالکل۔۔" بی بی گل نے کہا۔

"آج ہم بھی سوالی بن کر آئے۔" وہ مسکرا کر بولی۔ بی بی گل ایک دم کچھ نہیں سمجھیں تو شاہ گل نے کہا۔

"جینی کی نسبت آپ لوگ کہیں ٹھہرا تو نہیں چکے۔۔۔"

بی بی گل نے اطمینان کا سانس لے کر آغا جان کی طرف دیکھا۔ آغا جان نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"شکر ہے۔" شاہ گل بولی۔۔۔ "ورنہ۔۔۔ زین۔۔" اس نے کچھ کہا نہیں لیکن بات سب سمجھ گئے۔

پھر آفریدی نے کہا۔ "بدلے کا رشتہ ہماری روایات میں بھی ہے اور ہمارے دلی خواہش بھی۔ زین کے متعلق آپ پوری تحقیق کر لیں۔ میں اپنے بیٹے کی آپ سے تعریف نہیں کروں گا۔ میری اور شاہ گل کی دلی خواہش ہے کہ آپ اسے اپنی فرزندی میں لے لیں۔ جینی ہمیں بہت پیاری لگی ہے۔ تہمینہ آپ کی ہوئی، جینی ہماری بنا دیں۔ یہ ہمارے بیٹے کی بھی خواہش ہے۔۔۔۔"

آغا جان اور بی بی گل نے تو وہم گمان میں بھی نہ تھا کہ جینی کے لیے اتنا اونچا رشتہ آئے گا۔۔۔۔۔۔ وہ چپ ہو گئے۔ تو آفریدی بولے۔ "آپ سوچ لیں۔ اللہ کا فضل ہے۔ کسی چیز کی کمی نہیں۔ آپ لاکھوں کا مہر بندھوانا چاہیں تو ہم بخوشی تیار ہوں گے۔"

"نہیں یہ بات نہیں۔" بی بی گل جلدی سے بولیں۔

"تو پھر ہاں سمجھ لیں۔" شاہ گل مسکرائی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" شاہ گل نے کہا۔

آفریدی بولے۔ "ہماری اگلی ملاقات ہو تو دونوں رشتے طے ہو جانے چاہئیں۔"

"واقعی۔" شاہ گل نے کہا۔

آغا جان نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور بی بی گل مسکرا دیں۔

کئی سوٹن وزنی بم بھی گرتا تو شاید جینی کو اتنا دھچکا نہ لگتا۔ وہ تو ششدر سی رہ گئی۔ بالکل پتھر کا بت بن گئی۔

بی بی گل نے اسے گلے لگا لیا۔ "بیٹی دنیا کا یہی دستور ہے۔ ماں باپ کے گھر میں تو بیٹیوں کا عارضی قیام ہوتا ہے۔ ان کا اصلی گھر تو انہیں شادی کے بعد ہی ملتا ہے۔"

بی بی گل نے اسے گلے لگائے دنیا نے دستور کی باتیں کرتی رہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جینی باپ اور بھائی کی آنکھ کا تارا ہے۔ شادی کا مطلب ان سے بچھڑنا ہے۔ اسی بچھڑنے کے خوف سے وہ پیلی پڑ گئی ہے، کانپ گئی ہے۔

لیکن اسد کی نظروں نے دکھ اور اذیت کے سائے دیکھ لیے۔ پہلے تو اسے جینی اور حیدر کی پسند کا صرف احساس ہی تھا۔ اب یقین ہو گیا۔ کہ محبت کے بندھن پوری شدت اور قوت سے بندھ چکے ہیں۔ وہ تہمینہ کے والدین کی پیش کش پر پریشان۔۔۔ ہو گیا۔ اسی رات جب بی بی گل نوکروں کو کھانا دے کر فارغ ہوئیں اور اپنے کمرے میں جانے لگیں تو اسد نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔

"کیا بات ہے، کچھ پریشان لگ رہے ہو۔" بی بی گل نے بیٹے کے پریشان چہرے کو دیکھا۔

"بی بی گل۔"

"ہوں۔"

وہ چند لمحے چپ رہا۔

"کیا بات ہے۔" بی بی گل کچھ پریشان نظر آئیں۔ "کیا کہنے کو بلایا ہے۔"

"بی بی گل آپ نے جینی کا کیا سوچا ہے۔"

"اوہ۔۔ اچھا۔" وہ خوش ہو گئیں۔

"ہوں۔"

"بیٹے یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ جینی کے لیے اتنا اچھا رشتہ ملنا اس کی خوش بختی ہے اور۔۔۔۔"

"لیکن بی بی گل۔۔۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکا تو بی بی گل بولیں۔ "بیٹا یہ کوئی بری بات نہیں۔ بدلے کے رشتے ہماری روایات کا حصہ ہیں۔ وہ ہمیں بیٹی دیں گے تو بیٹی مانگنے کا بھی انہیں حق ہے۔ اور پھر ان کا بیٹا بھی تو دیکھو، کتنا خوبرو لائق شریف اور خاندان۔۔۔۔ کیا کمی ہے ان میں۔"

اسد ایک دم کوئی بات نہ کہہ سکا۔ جینی کے جذبات کا کیونکر اظہار کرتا؟ پھر بھی بولا۔ "جینی سے تو پوچھ لیں۔"

بی بی گل ہنس پڑیں۔۔۔ "وہ خوش ہی خوش ہو گی۔"

اسد چپ ہو گیا۔ لیکن سوچوں نے دماغ کو بری طرح جکڑ لیا۔ صرف اتنا ہی کہا۔

"حیدر بھی تو اچھا لڑکا ہے۔"

"ہاں اچھا ہے لیکن زین سے اچھا نہیں۔ اور پھر کون سا حیدر کے والدین رشتہ لینے آ گئے ہیں جو ہم اس کی بجائے زین کو رشتہ دے رہے ہیں۔۔۔ کیا خبر انہوں نے حیدر کا کہاں کرنا ہے رشتہ۔۔"

اسد چپ ہو گیا۔ بات ٹھیک بھی تھی۔

لیکن پریشانی دور نہ ہوئی۔

دو دن گزر گئے۔ شاہ گل پھر آ گئیں۔ انہیں اپنے سوال کا جواب چاہیئے تھا۔ لیکن اسد نے کوئی فیصلہ کن جواب نہیں دیا۔

بات بڑھ گئی۔ شاہ گل نے برا منایا۔ اور پھر انہوں نے پیغام بجھوا دیا۔ کہ ہوں گے تو دونوں ہی رشتے ہوں گے۔ نہیں تو ایک بھی نہیں۔ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔

یہ بات بھی بم گرانے کے مترادف تھی۔ دونوں میں سناٹے اتر گئے۔ اسد نے بی بی گل سے کہہ دیا۔ "اگر وہ لوگ بضد ہیں تو ٹھیک ہے بات یہیں روک دی جائے۔"

"لیکن تم جینی کا رشتہ وہاں کیوں نہیں کرنے دیتے۔" بی بی گل سٹپٹائیں۔

"اس لیے۔۔۔۔۔ کہ یہ شادی جینی بھی نہیں چاہتی۔" اسد نے کہہ ہی دیا۔ بی بی گل پریشان ہو کر اس کا منہ تکنے لگیں۔

چند لمحے چپ رہیں پھر بولیں۔ "تمھیں جینی نے کہا ہے کچھ۔"

"نہیں۔" وہ بولا۔

"پھر تم کیسے کہہ رہے ہو۔"

"میں محسوس کرتا ہوں۔"

"تم غلط محسوس کرتے ہو۔"

"جینی کتنی پریشان ہے۔ آپ نہیں دیکھتیں۔"

"ہاں وہ ہے۔ لیکن اس لیے کہ شاید شادی کے لیے وہ ذہنی طور پر آمادہ نہیں۔ اسے ہم سے بچھڑنے کا دکھ ہے۔"

وہ روہانسی ہنسی ہنس کر بولا۔ "کیا باتیں کرتی ہیں بی بی گل۔"

"نہیں یقین آتا۔ تو خود اس سے پوچھ لو۔ لاڈلی ہے تمہاری، نہیں چھپائے گی کوئی بات۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔۔"

بی بی گل اٹھ کر چلی گئی اور وہ جینی سے کھل کر بات کرنے کے متعلق سوچنے لگا۔

جب سے تہمینہ کے ہاں سے یہ پیغام آیا تھا کہ "ہوں گے تو دونوں ہی رشتے ہوں گے، نہیں ہو گا تو ایک بھی نہیں ہو گا۔"

جینی کی جیسے جان پر بنی تھی۔ دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ ایک طرف اپنا دل تھا جو حیدر کی محبت سے سرشار تھا اور دوسری طرف گل لالہ تھا۔ جو اسے اپنے آپ سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ اور جس نے کہا تھا کہ اسے نہ ملی، تو وہ مر جائے گا۔

جینی اس خیال ہی سے خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ کانپ جاتی تھی۔ اپنے گل لالہ کی خوشیوں کے لیے اسے قربانی دینا ہی تھی۔

قربانی دینے کا سوچ لینا آسان ہے لیکن عملاً۔۔۔ کتنا مشکل ہے۔ یہ جینی جانتی تھی۔ جس پر سوچوں کی قیامتیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ گل لالہ کی محبت کو اس نے اپنے دل کی ساری خوشیوں پر ترجیح دینے کی بالآخر ٹھان ہی لی۔۔ جس رات اس نے یہ فیصلہ کیا۔ وہ رات اس کے لیے قیامت کی رات تھی۔ حیدر اس کے لیے کیا تھا۔ اس رات اس نے پوری شدتوں سے محسوس کیا۔ لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ گل لالہ کی خوشیوں کی خاطر

اپنا دل، اپنی محبت، اپنا پیار، قربان کر دینے کا فیصلہ وہ گل لالہ کو ناکام و نامراد نہیں دیکھ سکتی تھی۔ گل لالہ نے کہا تھا کہ وہ تہمینہ کے بغیر زندہ نہیں رہے گا۔ جینی کے لیے یہ سوچ بھی قیامت تھی۔

اور اس دن موقع پا کر اسد جینی کے کمرے میں آ گیا۔ اس کا چہرہ دلی پریشانی کا غماز تھا۔ جینی کی چھٹی حس نے اسے آگاہ کر دیا کہ اسد ضرور اس رشتے کے بارے میں بات کرے گا۔ اس نے اپنے آپ کو مجتمع کیا اور

مسکراتے ہوئے اٹھ کر گل لالہ کا خیر مقدم کیا۔

"کیا کر رہی تھیں۔۔۔" اس نے کرسی کی پشت مضبوطی سے پکڑ کر جینی کی طرف دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ مسکرائی۔

گل لالہ نے اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ اس نے اپنی مسکراہٹ پر قابو رکھا۔

"جینی۔" چند لمحے خاموش رہ کر اسد بولا۔

"جی گل لالہ۔"

"ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتاؤ گی۔"

"کبھی جھوٹ بولا ہے میں نے قربان جاؤں۔۔۔" وہ جان بوجھ کر ہنس پڑی۔ اس کا خیال تھا قربان جاؤں پر گل لالہ بھڑک اٹھے گا۔ لیکن وہ انتہائی سنجیدہ اور متین تھا۔

"کیا بات ہے گل لالہ۔" جینی نے خود ہی بات چھیڑی۔

گل لالہ اس کی طرف پشت کرتے ہوئے بولا۔۔۔ "میں عجیب مخمصے میں ہوں۔"

"کیوں۔"

"آج کل گھر میں جو کچھ ہو رہا ہے، تم یقیناً بے خبر نہیں ہو۔"

"جی۔۔۔" جینی سرتاپا لرز گئی۔

"پھر۔۔۔" گل لالہ ایک دم اس کی طرف گھوم کر اس کی آنکھوں میں جھانک کر

بولا۔ ایک لمحہ کو جینی بوکھلائی۔ ڈگمگائی۔ لیکن اس نے ساری پریشانی مسکراہٹ میں سمیٹ لی۔ پھر اس کی طرف کمر موڑتے ہوئے بولی۔

"ہوں۔" گل لالہ اس کی پشت پر نظریں جمائے تھا۔

وہ جھجکی۔

"پوچھو نا۔"

"گل لالہ۔ آپ کیوں نہیں چاہتے کہ تہمینہ کے بدلے مجھے۔۔۔۔"

"جینی۔" گل لالہ حیران ہو کر بولا۔۔۔ "میں تو۔۔۔۔۔ میں تو سمجھتا تھا کہ۔۔۔۔۔۔۔۔"

"آپ غلط سمجھیں تو اس کا میرے پاس کیا علاج؟"

"تو۔۔۔ تو تم۔۔۔۔ خوش ہو۔۔۔۔"

وہ چپ ہو گئی۔

گل لالہ اس کے کندے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تو تم خوش ہو یہاں رشتہ۔۔۔۔"

"مجھے شرم آتی ہے گل لالہ۔۔۔ لیکن میں۔۔۔ خوش ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں چہرہ گرا لیا۔

"واقعی۔۔۔۔" اسد کو اب بھی یقین نہ آیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو۔۔۔۔۔۔۔ تو میں غلط سمجھا تھا۔ بی بی گل نے سچ ہی کہا تھا کہ تم بچھڑنے کے غم میں۔۔۔۔"

"ہاں گل لالہ۔۔" وہ ایک دم پلٹی اور گل لالہ کے گلے میں باہیں ڈال کر بے اختیار ہو کر رو دی۔

اب گل لالہ کا دل مطمئن تھا۔ اس نے جینی کو خوب پیار کیا اور اس کے رونے پر ہنستا رہا۔ مذاق کرتا رہا۔

جینی نے کتنی مہارت سے گل لالہ کو دھوکہ دے دیا تھا۔۔۔ وہ مطمئن ہو گئی۔

بڑی دھوم دھام سے شادیاں ہوئیں۔ تہمینہ اسد کے پہلو میں دلہن بن کر آ بیٹھی اور جینی زین کے حجلہ عروسی میں آ گئی۔

ماہ عسل منانے کے لیے تہمینہ اور اسد کاغان چلے گئے۔

زین نے یورپ کا ٹور لگانا تھا۔ چند دنوں میں تیاری کر کے دونوں نئے جوڑے ماہ عسل منانے چلے گئے۔

تہمینہ اور اسد تو دو ہفتے کے بعد واپس آ کر کراچی چلے گئے، زین اور جینی تین ماہ کے لیے گئے تھے۔

تہمینہ اور اسد بے انتہا خوش تھے۔ دونوں کے چہروں پر نکھار تھا۔ تہمینہ تو اتنی نکھر گئی تھی، ایسا رنگ روپ نکالا تھا کہ نظر کہیں نہیں ٹھہرتی تھی چہرے پر۔ بات بات پر قہقہے لگاتی، شوخیاں کرتی۔۔۔ یوں لگتا تھا اس کے اندر خوشیوں کی پھوار اسے بھگوئے دیتی ہے۔

تین ماہ بعد زین اور جینی بھی واپس آ گئے۔

زین کو آتے ہی کراچی انٹرویو کیلئے جانا تھا۔ وہ جینی کو اس کی خواہش پر میکے چھوڑ گیا۔ جینی کو دیکھ کر سب ہی حیران ہو گئے۔

اس کی سنہری رنگت ماند پڑ گئی تھی۔ سیاہ آنکھوں میں بن برسے بادلوں کے جمع ہونے کا گمان ہوتا تھا۔۔۔ ایک گمبھیر سی اداسی نے اس کے سارے وجود کا احاطہ کر رکھا تھا۔

بی بی گل، آغا جان، اسد اسے دیکھ کر حیران ہو گئے۔

لیکن اس نے بہانہ بنا دیا۔ "تین مہینے سفر ہی کرتے رہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ تھک گئی ہوں۔ میں آرام کروں تو بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی۔۔۔"

ماں باپ نے یقین کر لیا۔ انہیں یقین دلانے کو جینی بات بے بات قہقہے بھی تو لگا رہی تھی۔

لیکن اسد ٹھٹک گیا۔ جینی کی باتیں اسے مطمئن نہ کر سکیں۔ اس کی ہنسی میں گھلے آنسوؤں کی نمی وہ صاف طور

پر محسوس کر رہا تھا۔اس کے قہقہے اسے یوں لگتا جیسے مد قوق سینے میں کھانسی کھڑ کھڑا رہی ہو۔

وہ اسے دیکھ کر پریشان ہوتا رہا۔

اس دین جینی اپنے کمرے میں کھڑکی میں کھڑی دور خلاؤں میں جانے کیا دیکھ رہی تھی۔اسد اندر آیا تو اسے پتہ تک نہ چلا۔اسد کئی لمحے اس کے قریب کھڑا اس کا جائزہ لیتا رہا۔۔۔وہ تو گرد و پیش سے کیا،اپنے آپ سے بھی بے خبر تھی۔

کئی لمحے گزر گئے۔۔۔اسد اسے تکتا رہا اور اس کی موجودگی سے بے خبر وہ خلاؤں میں گھورتی رہی۔

"جینی۔"اسد کے ہونٹوں سے بے دم سی آواز نکلی تو جینی کی بے خبری کی نظر ہو گئی۔وہ اسی طرح کھڑی رہی۔

تب اسد نے پریشان ہو کر قدرے اونچی آواز میں اسے مخاطب کیا۔"جینی۔"

جینی ایک دم چونک گئی۔جلدی سے مڑی۔۔۔گل لالہ کو دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"اوہ۔۔آپ کب اندر آئے گل لالہ۔۔۔"

اسد نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔

جینی گھبرا گئی۔لیکن گھبراہٹ کو مسکراہٹ کے لبادے میں لپیٹتے ہوئے بولی۔"کیا دیکھ رہے ہیں گل لالہ۔"

"جینی۔"گل لالہ نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔وہ اب بھی نگاہیں جینی کے چہرے پر جمائے تھا۔

"جی قربان جاؤں!"حسب عادت جینی نے کہا،گل لالہ تڑپ گئے۔بے اختیارانہ جینی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹوٹتی آواز میں بولے۔"جینی کہیں سچ مچ ہی قربان تو نہیں ہو گئی؟"

جینی سے سر جھکا لیا۔

گل لالہ کا دل تڑپ تڑپ اٹھا۔

پھر جینی نے سر اٹھایا۔تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔لیکن آنکھوں میں جمع شدہ بادل برس جانے کو مچل رہے تھے۔

دلہن

مایوں کا سرخ جوڑا پہنے وہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔اس کی کھلی ہتھیلیوں پر سہیلیاں مہندی سے پھول بوٹے بنا رہی تھیں۔الہڑ نوجوان لڑکیوں اور نئی بیاہتا دلہنوں نے اسے گھیر رکھا تھا۔ قلقل کرتی ہنسیاں بہہ رہی تھیں،وہ چپ تھی۔ہنس نہیں رہی تھی۔لیکن یوں لگتا تھا اس کے انگ انگ سے،ہنسیوں کے فوارے پھوٹ رہے ہیں ،نرم و ملائم سی پھوار برس رہی ہے۔ قہقہے گونج رہے ہیں۔

کل اس کی برات آرہی تھی،وہ پیا گھر جا رہی تھی۔اک نئی اور انوکھی دنیا میں قدم رکھ رہی تھی۔ایسی دنیا جو قوس قزح کے رنگوں کی طرح حسین ہو گی،جو پھولوں کی خوشبوؤں سے لبریز اور نغموں کے ترنم کی طرح دلفریب ہو گی۔وہ سکھیوں،سہیلیوں،بہنوں اور بھابیوں میں گھری بیٹھی تھی،جو بات بات پر قہقہے لگاتی تھیں۔شوخ شوخ فقرے چست کر رہی تھیں۔اپنے تجربے بتا رہی تھیں۔

جوان لڑکیوں کا لحاظ کیے بغیر نئی دلہنیں اپنی اپنی کہانیاں سنا رہی تھیں۔کوئی کان میں بے تکلفی سے مذاق کر رہی تھی۔

لیکن

وہ

وہ تو جیسے وہاں تھی ہی نہیں۔ وہ تو حسین تصورات میں کھوئی کل رات کے

حسین تصورات، جب رنگ و نور کے سیلاب امنڈ پڑیں گے، پھولوں سے لدی مسہری پر وہ زرنگار گٹھڑی بنی بیٹھی ہو گی۔ دل بے تابی سے دھڑکے گا۔ اور ان دھڑکنوں کی صدا کسی کی آواز پا میں ڈوب جائے گی۔ دروازہ کھلے گا، بند ہو گا اور وہ۔

وہ

اس کے خوابوں کا شہزادہ فضا کا دل دھڑکاتا آئے گا۔۔۔۔۔ پھر ساری کائنات کا حسن اس بند کمرے میں سمٹ آئے گا۔ مضبوط بازوؤں کا حلقہ جو تنگ ہوتا جائیگا۔ گرم گرم سانسوں کی مہکار، جو اس کے ان چھوئے ہونٹوں کو چھولے گی۔۔۔ دل کی دھڑکنیں ہم آہنگ ہونگی۔

نشہ ہی نشہ۔۔۔۔ سرور ہی سرور۔۔۔۔۔ اور پھر یہ سب کچھ ہمیشہ ہی ہو گا۔ خوبصورتیاں کس خوبصورتی سے اس کے اندر اتر جائیں گی۔

اے لڑکی۔۔۔۔ ہتھیلی سیدھی رکھ، جانے وہ اندر اندر شرما جانے سے کچھ اور دوہری ہو گئی تھی۔ ہتھیلی ہل گئی تھی۔ اس کی سہیلی شمع جو بڑے محتاط طریقے سے اس کی سنہری نرم اور نازک ہتھیلیوں پر مہندی کا رنگ اتار رہی ہے، بولی۔

"اے آج کی لڑکی۔۔۔۔ کل کی عورت۔۔۔ ٹھیک سے مہندی لگوا لے۔" میمونہ بھابھی نے اس کی گدگدی۔۔ کرتے ہوئے کہا۔۔۔

کل کی عورت۔۔۔ کئی جوان دلہنیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔۔۔ "تو اور کیا۔ آج یہ لڑکی ہے۔۔۔ کل یہ عورت بن جائے گی۔" میمونہ نے شوخ ہوتے ہوئے کہا۔ "کیوں جی شبانہ صاحبہ۔۔۔"

"اللہ بھابھی۔"۔۔۔ وہ لجا گئی۔

"کل کی کل دیکھئے گا۔ پلیز ہمیں آرام سے مہندی لگا دینے دیں۔" رشو نے شبانہ کی ہتھیلی پر پتلی پتلی سی مہندی سے پھول بناتے ہوئے کہا۔

"پاگل ہی ہو جائے گا۔ ان مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھ کر۔" ساجدہ نے کہا۔

"ہاں شروع شروع میں تو سبھی پاگل ہو جاتے ہیں۔" سیما نے منہ بنایا۔ "پھر پاگل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔" حنا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بالکل بالکل۔۔۔۔" رشو اور حمیرا نے تائید کی۔

باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ ہنسی مذاق میں کچھ سنجیدگی بھی اتر آئی۔

شمع اور رشو کو موقع ملا۔ وہ مہندی لگانے میں منہمک ہو گئیں۔

شبانہ پھر انجانی دنیا کے حسین و رنگین تصوروں میں کھو گئی۔

اکیس بائیس سالہ شبانہ نے تین سال پہلے بی اے کیا تھا۔ ابو تو چاہتے تھے۔ وہ ایم اے میں داخلہ لے لے۔ لیکن امی نہ مانی تھیں۔ چار بیٹیاں تھیں۔ چاہتی تھیں۔ بی اے کرتے ہی رشتہ مل جائے۔ تو شادی کے فریضے سے سبکدوش ہو جائیں۔ اس مسئلے پر گھر میں کئی دن بحث چلی تھی۔

ابا کہتے تھے، ایم اے میں داخلہ لینے میں کیا حرج ہے۔ رشتہ مل گیا تو شادی کر دینا، نہ ملا۔ تو ڈگری تو لے ہی لے گی۔

امی متفق نہ ہوتی تھیں۔ متوسط طبقے کے گھرانے پر ایک ہی بیٹی کا بار کم نہیں ہوتا۔۔۔ اوپر تلے کی چار بیٹیاں تھیں۔۔۔ وہ کہتیں، ہمارے پاس کون سا خزانہ کھلا پڑا ہے۔ ایم اے کے دو سالوں میں جو خرچ کرنا ہے۔ وہ

جہیز کے لیے دیں۔ جب تک رشتہ نہیں ملتا۔ گھر داری ہی سیکھے، سوئی سلائی ہی مانگ نہیں ہوتی جہیز کی۔ گھر بیٹھ کر یہ کام بھی کرے گی۔ اور گھر داری کے طور طریقے بھی سیکھے گی۔ پڑھائی کے دوران تو لڑکیاں لونڈے بنی پھرتی ہیں۔ گھر کے کاموں کے نزدیک نہیں پھٹکتیں۔

ابو قائل نہ ہوئے۔ لڑکیوں کے ہاتھ میں ڈگری ضرور ہونی چاہئے۔ اب تو وہ دور آرہا ہے۔ کہ مرد کے ساتھ عورت کو بھی کمانا پڑے گا۔ ایم اے کرے تو اچھی نوکری مل سکتی ہے۔

اماں برمان جاتیں۔ نوکری کا پہلے ہی سوچ لیں۔ آپ کو کیا پتہ میری شبانہ کی قسمت کتنی یاور ہو گی۔ نوکری خدا نہ کرے۔ جو ضرورت آن پڑے۔ عقل سے کام لینا تو تم سیکھو گی ہی نہیں۔ نوکری کرنا عیب تو نہیں۔ ہم لوگ متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ کمر توڑ مہنگائی نے سفید پوشی کا بھرم بھی نہیں رکھنا۔ خاوند کے ساتھ مالی معاونت کے لیے اگر بیوی بھی کوئی کام یا نوکری کر لیتی ہے۔ تو اس میں برائی کیا ہے۔

اماں کچھ قائل ہوتیں، کچھ نہیں۔ شانہ کے مستقبل کو تو انہوں نے خوشگوار امیدوں کے سہارے سجا رکھا تھا۔ خوبصورت جسم اور متناسب خدوخال والی شبانہ کے لیے انہوں نے کیسے کیسے خواب دیکھے تھے۔ یہ وہی جانتی تھیں۔ ان خوابوں کے عکس شبانہ کی آنکھوں میں بھی لہراتے تھے۔ اسی لیے اس نے ایم اے میں داخلہ لینے کی بجائے گھر داری میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ اس نے کھانا پکانا، کڑھائی سبھی کچھ سیکھا۔

اس کے لیے کئی رشتے آئے تھے۔ لیکن لڑکا من نہ بھایا۔ کسی کا گھر بار اچھا نہ نکلا۔ اماں نے بھی تلاش جاری رکھی۔ اچھے رشتے کی آس میں دن گزرتے چلے گئے۔ اماں فکر مند رہنے لگیں۔ ابا شبانہ کے دو سال گھر بیٹھ کر ضائع کر دینے کا بار بار تذکرہ کرنے لگے۔ شبانہ کے بھی مستقبل کے خواب کچھ بکھرنے لگے۔

انہی دنوں شبانہ کے لیے یہ رشتہ آ گیا۔ دور کی خالہ تھیں۔ دو ایک بار گھر آئیں۔ سلجھی ہوئی قبول صورت پسند آ گئی۔ ان کا بیٹا بینک میں ملازم تھا۔ دو منزلہ مکان اپنا تھا۔ وراثت میں ملی ہوئی کچھ جائیداد بھی تھی۔ شوہر کا

کاروبار بھی وسیع نہ سہی، اتنا ضرور تھا کہ فراغت اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ دور کی خالہ نے قربت کی خواہش کا اظہار کیا۔ تو اماں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہ رہا۔ اپنے بہر حال غیروں سے تو اچھے ہی تھے۔ ان کی خوبیوں اور خامیوں کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو تھا ہی۔

ابا کو بھی کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ ارشد کے متعلق جہاں سے بھی پوچھا، تسلی بخش جواب ملا۔ شریف او بر سر روزگار لڑکا جس کی خاندانی اور مالی حیثیت بھی اچھی تھی۔ شبانہ کے لیے ایسا ہی بر تو چاہئے تھا۔ شرافت اور لیاقت کے ساتھ ساتھ شکل وصورت اور قد کاٹھ کا بھی اچھا تھا۔ شبانہ کی خوش بختی تھی۔ جو ایسا رشتہ ملا۔ جھٹ منگنی اور پٹ شادی والی بات ہوئی۔ بمشکل خالہ نے تین مہینے کی مہلت دی، وہ تو چاہتی تھی۔ منگنی پر ہی رخصتی کروالیں۔ ان کا بھی پہلا بیٹا تھا۔ شادی کا ارمان ہر ماں کی طرح ان کے دل میں بھی مچلتا تھا۔ پیاری سی دلہن لانے کی متمنی تھیں۔ شبانہ ان کے معیار پر پوری ہی اتری تھی۔

دونوں گھرانوں میں دھوم دھام سے شادی کی تیاری ہونے لگی۔ اماں سلیقہ مند عورت تھیں۔ شروع ہی سے جہیز جمع کرنا شروع کیا ہوا تھا۔ روز کے خرچہ سے پیسہ پیسہ بچا کر بھی چیزیں خریدتی رہتی تھیں۔ ابا جان کے پاس بھی پس انداز کیا ہوا کچھ پیسہ تھا۔ متوسط طبقے کے ہر خاندان کی طرح دونوں میاں بیوی کو صرف یہی فکر تھی۔ کہ یہ شادی باعزت طریقے سے انجام پا جائے۔ معقول جہیز بھی تیار ہو جائے۔ اور بارات کی خاطر مدارات میں کوئی کمی نہ رہے۔ رکھی رکھائی پونجی دونوں کھلے دل سے خرچ کر رہے تھے۔ تین بیٹیاں اور بھی تھیں۔ لیکن انہیں اس وقت ان کی فکر نہ تھی۔ ان کا بھی اللہ مالک تھا۔ فی الحال تو انہیں شبانہ کو ہی رخصت کرنا تھا۔

اماں نے کیا کچھ کیا۔ ابا نے کہاں کہاں سے پیسہ جمع کیا۔ شبانہ کو پتہ تو تھا۔ دل بھی دکھتا تھا۔ لیکن نئی سہانی

زندگی اتنی دلفریب اور پر کشش تھی کہ اس کے لیے یہ سب کچھ کر گزرنا کچھ زیادہ نہ لگتا تھا۔

بارات بھی ایک شان سے آئی تھی۔ خالہ نے شبانہ کے لیے اتنے خوبصورت لباس اور اتنا پیارا پیارا زیور جمع کیا تھا۔ کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ ہر زبان پر شبانہ کی خوش بختی کے

تذکرے تھے۔

"بڑی بھاگوان ہے۔"

"ایسے تیز نصیب والی ہے۔"

"اتنا زیور چڑھاوے میں آیا ہے۔"

"کپڑا تو ایک سے ایک بڑھیا ہے۔"

عورتیں چڑھاوے میں آنے والی چیزوں کو دیکھ دیکھ کر تبصرے کر رہی تھیں۔ کچھ خوش ہو رہی تھیں۔ کچھ دل ہی دل میں رشک و رقابت محسوس کر رہی تھیں۔

ارشد نے بھی آج شہزادے کا روپ دھارا تھا۔ سنہری شیروانی اس کے وجیہہ اور باوقار سراپے پر بے حد اٹھ رہی تھی۔ شبانہ کی سہیلیاں اور بہنیں آآ کر اسے بتا رہی تھیں۔ اور وہ۔۔۔۔ لطف و انبساط کی لہریں اپنے وجود میں اٹھتی محسوس کر رہی تھی۔

شبانہ دلہن بنی۔

بھاری عروسی جوڑا اور جگ مگ کرتے زیورات حسن میں اضافے کا سبب بے شک تھے۔ لیکن اصل حسن تو اس کی آنکھوں میں تھا۔ جگمگاتی امیدوں، لہریں لیتے تصوروں اور من میں گدگدی کرتی امنگوں میں تھا۔

ہر لڑکی کی طرح وقت رخصت شبانہ پر بھی رقت طاری ہوئی۔ بابل کی دہلیز چھوڑتے وقت اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔۔۔ ماں باپ بھائی بہنوں کا ساتھ چھوڑتے وقت وہ بھی دلگیر ہوئی۔

لیکن

نئے گھر کی دہلیز پار کرتے وقت اس کا جس طرح سواگت ہوا۔ اسے جتنی اہمیت دی گئی۔ اس کے جتنے ناز اٹھائے گئے۔ جتنا جوش و خروش اور والہانہ پن ظاہر کیا گیا۔ اسے اپنے اوپر فخر سا محسوس ہوا۔ اعتماد سے اس کا من بھر گیا۔

اور

پھر

وہ رات آہی گئی، جو اس کی دھڑکنوں میں تلاطم مچائے تھی۔

اوپر کی منزل پر دائیں ہاتھ والا کمرہ اس کا حجلہ عروسی تھا۔ کمرہ خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ رنگ و نور کے سیلاب امنڈ پڑتے تھے۔ خوشبوئیں پھیلی تھیں۔ پورا بیڈ پھولوں سے بھرا تھا۔ کمرے میں سرخ سرخ روشنیوں کا غبار پھیلا تھا۔

وہ لجائی شرمائی بیڈ پر بیٹھی انتظار کی لذت سے سرشار تھی۔

دروازہ کھلا۔

پھر چٹخنی چڑھادی گئی۔

اس کے سپنوں کا شہزادہ آگیا تھا۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔ دل کی دھڑکنیں تھم سی گئیں۔ گھبراہٹ کا جیسے دورہ سا پڑا۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گے۔ اور خوشبوں میں بسا بدن پسینے میں نہا گیا۔

خوابوں کا شہزادہ ہولے ہولے نپے تلے قدم رکھتے ہوئے مسہری کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وفور شوق و مسرت سے جیسے بن پیئے مست تھا۔ پھر دل کی دھڑکنیں تھم سی گئیں۔ شوق کا دست دراز بڑھا۔ حیا اور سمٹی۔

تھوڑی سی کش مکش، اصرار وانکار، شوق جیتا، حیانے ہتھیار ڈال دیئے۔

بوڑھی رات مسکرانے لگی۔ شوق کی جنوں خیزیاں بڑھتی ہی گئیں۔ لطف وانبساط کی دنیائیں آباد ہو گئیں۔ نئی انوکھی دنیا کی سحر خیزیاں شبانہ کی حد خیال کبھی یہاں تک کہاں پہنچی تھی۔ یوں لگا رات پلک جھپکے میں گزر گئی ہے۔

پھر

ہر شب شب برات اور ہر روز روز عید بن گیا۔ دونوں ایک دوسرے میں جیسے مدغم

ہو گئے۔ چاہتوں کی جنوں خیزیاں بڑھتی گئیں۔ محبتوں کے تانے بانے مضبوط ہوتے گئے۔ پیار کے اظہار کی حشر سامانیاں سرور کا باعث بنیں۔

ارشد خوش تھا۔ بے حد خوش۔

بے خودی کے عالم میں کہہ اٹھتا۔۔ "مجھے تمہاری ہی تلاش تھی۔ شبی تم میرے خوابوں کی تعبیر ہو۔"

شبانہ کا دل وفور مسرت سے جھوم اٹھتا۔ وہ اپنا سر اس کی چھاتی میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتی۔۔ "میں؟"

"ہاں۔۔۔ میں نے ہمیشہ ایسی ہی بیوی کے لیے دعا کی تھی۔ خدا نے میری دعا سن لی۔۔۔ یہ میری خوش بختی ہے۔۔۔۔ میں بہت خوش نصیب ہوں۔"

"اوں ہوں۔" وہ شوخی سے مچل کر کہتی۔

"کیوں۔" وہ کہتا۔

"خوش نصیب تو میں ہوں۔ جو آپ مجھے مل گئے۔"

"واقعی شبی۔ تم ایسا سمجھتی ہو۔"

"ہاں۔"

ہر نئے جوڑے کی طرح عہد وپیماں بھی ہوتے۔ وفا کی قسمیں کھائی جاتیں۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کو سمجھنے اور زندگی کو آسودہ بنانے کے لیے پلان بھی بنتے۔

"وعدہ کرو ارشی! کہ تم اپنے پیار کی وسعتوں اور پھیلاؤ کو کسی سٹیج پر بھی کم نہیں ہونے دوگے۔"

"شبانہ تم اس پیار میں وقت کے ساتھ ساتھ گہرائی اور گیرائی پاؤ گی۔"

"وعدہ وفا کرو گے نا۔"

"جان سے جانا منظور۔ وعدے سے پھرنا نا منظور۔"

وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر اپنی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر پوری سچائی سے کہتا۔۔۔ شبانہ جھوم جاتی۔

دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی زندگی کا واقعی محور مان لیا تھا۔ اس محور کے گرد دونوں گھوم رہے تھے۔ ان دنوں تو دونوں کو سوائے ایک دوسرے کے کسی چیز کا احساس ہی نہ تھا۔

ارشد نے ایک ماہ کی چھٹی لے رکھی تھی۔ ہنی مون کے لیے مری جانے کا پروگرام تھا۔ لیکن آٹھ دس دن تو وہ گھر سے نکل ہی نہ سکے۔ رشتہ داروں، عزیزوں نے بھی تو گھیر رکھا تھا۔ پہلے تو گھر میں ہی گہما گہمی رہی۔ پھر کسی کے ہاں ڈنر، کسی کے ہاں لنچ، کہیں چائے۔ رشتوں کے لحاظ سے پیار کا اظہار ہی تھا یہ۔

لیکن

دونوں کو دل سے یہ سب کچھ کہاں پسند تھا۔ وہ تو ہر لمحے کو قربتوں کی نذر کرنا چاہتے تھے۔

"دیکھو بھئی۔" اس دن ارشد نے شبانہ سے کہا۔

"جی۔"

"بس اب مروت میں مارے جانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔"

"کیا؟"

"یہ روزروز لوگوں کے ہاں نہیں جایا جاسکتا۔"

"کیوں؟"

"جانتی توہو۔"

شوخی سے اسے گھورتے ہوئے ارشد نے کہا۔شبانہ مسکرادی ارشد بولا۔

"شبی۔"

"جی۔"

"چلو تیاری کرلو۔"

"تیاری؟ کہاں جانا ہے؟"

"مری چلتے ہیں۔"

"جی؟مری۔۔۔۔"

"ہاں !ہاں مری۔۔۔ کھانے وانے واپس آکر کھالیں گے لوگوں کے۔میری چھٹی ختم ہوئی جارہی ہے۔ میں چند دن تنہائی میں صرف اور صرف تمہاری قربت میں گزارنا چاہتا ہوں۔"

اس نے شبانہ کو بازوؤں میں سمیٹ کرپیار سے کہا۔

"مجھے کیا اعتراض ہے۔"وہ اس کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔

"خالہ سے پوچھ لیں۔۔۔۔"

"پوچھ لیا ہواہے۔تم تیاری کرو۔دس دن کا بجٹ ہے میرے پاس۔"

"زیادہ دن بھی ٹھہر سکتے ہیں۔میرے پاس بھی سلامیوں کے پیسے ہیں۔"

"وہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔۔۔۔۔"

"کیوں۔"

"میرے پاس پیسے ہیں جانم۔۔۔تمہارے پیسے تمہارے پاس ہی رہنے چاہئیں۔"

"میرے تیرے ابھی سے شروع کردیا۔"

شبی اس سے روٹھ گئی۔اپنے آپ کو اس کے بازوؤں سے نکالا اور منہ پھلا کر پرے ہوگئی۔

"ارے !ارے۔"ارشد لپک کراس کی طرف آیا۔

شبانہ پوری طرح روٹھ گئی۔

ارشد ہنس پڑا۔لیکن وہ منہ بنائے کھڑی رہی۔

پھر

روٹھنے اور منانے کا سلسلہ چل پڑا۔وہ بگڑتی رہی۔ارشد اسے مناتا رہا۔۔۔لطف وانبساط کے صدہا پہلو اس سلسلے سے نکلے۔۔۔بڑی مشکلوں سے ارشد نے اسے منایا تو وہ مسکراہٹ چھپاتے ہوئے ادائے دلبرائی سے بولی۔

"جایئے نہیں بولتی آپ سے ،بہت خراب ہیں آپ۔"

"سر نیاز خم ہے۔جو جی میں آئے کہئے جناب، لیکن مان ضرور جایئے۔"وہ ہنسا۔

"مان آپ بھی جایئے نا۔کہ پیسے میرے نہیں،آپ کے بھی ہیں۔"

"مان لیا جی،مان لیا۔کوئی حکم۔"ارشد نے سرخ کردیا۔وہ کھل کھل کر ہنس پڑی۔

دونوں ہنسی خوشی مری جانے کی تیاریوں میں لگ گئے۔موٹے کپڑے نکالے گئے۔ضروری چیزیں لی گئیں۔

دوسرے ہی دن جانے کا پروگرام بن گیا۔

رات شبانہ اور ارشد امی ابو اور بھائی بہنوں سے ملنے گئے۔ دونوں کو خوش و خرم دیکھ کر سب کا جی باغ باغ ہو گیا۔اماں تو نہال ہو گئیں۔

"خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ۔"

اماں کے دل سے دعا نکلی!

چھوٹی بہنیں بھی بے طرح خوش تھیں۔ان کی آپی خوش و خرم تھی۔اور بڑے لوگوں کی طرح ہنی مون منانے مری جا رہی تھی۔ فخر و انبساط ہی کی بات تھی نا۔

اوائل ستمبر میں مری کا موسم انتہائی خوشگوار تھا۔۔۔جولائی اگست کی بارشوں کے بعد فضا خاصی نکھر آئی تھی۔لوگوں کر رش بھی نہیں تھا۔چھٹیاں گزار کر لوگ واپس جا چکے تھے۔بیشتر گھر خالی ہو چکے تھے۔جو لوگ تھے، بھی وہ بھی سیزن گزارنے کے بعد واپسی کے پروگرام بنا رہے تھے۔۔!ہوٹلوں میں اب اتنا رش نہیں تھا۔انہیں ہوٹل مرحبا میں آسانی سے

کمرہ مل گیا۔۔دونوں کی خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

مری کا قیام رنگین و حسین تھا۔پوری پوری تنہائی اور سکون میسر تھا۔ساری ساری رات جاگتے رہتے، سارا سارا دن سوئے رہتے۔ کبھی سیر کے لیے نکل جاتے۔ مری کے مضافات بھی انہوں نے گھوم پھر کر دیکھے۔

تنہائی اور یکجائی نے ایک دوسرے کی عادات و خصائل کو سمجھنے میں بڑی مدد کی۔

وہ نتھیا گلی بھی گئے۔وہاں مری سے بھی زیادہ سکون تھا، خاموشی اور تنہائی۔۔ گھنٹوں گھنے درختوں تلے پڑے دل کی کہانیاں ایک دوسرے کو سنا رہے ہیں۔چڑھائیاں چڑھ رہے ہیں۔نشیبوں میں جا رہے ہیں۔ کبھی قہقہے برس رہے ہیں۔ کبھی روٹھے بیٹھے ہیں۔ منانے میں پہل کرنے کا سوچ رہے ہیں۔

پندرہ سولہ دن وہ زندگی کی خوشیاں لوٹتے رہے۔چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔۔اس لیے واپسی کا سوچ رہے تھے۔

"دل تو نہیں چاہتا واپس جانے کو۔"ارشد نے کمرے کی کھڑکی سے باہر اونچی نیچی چوٹیوں پر بادلوں اور سوچوں کی کرنوں کی آنکھ مچولی کا خوبصورت منظر دیکھتے ہوئے کہا۔

"سچی۔۔۔میرا دل بھی نہیں چاہ رہا۔۔"

شبانہ بولی۔"میں تو چاہتی ہوں۔۔۔عمر ہی یہاں بیت جائے۔"

"اگلے سال پروگرام بنائیں گے گرمیوں میں یہاں آنے کا۔۔۔۔"

"واقعی۔"

"بڑا مزا آئے گا۔"

"خاک مزہ آئے گا۔"

ارشد نے شوخی سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟"وہ حیرانگی سے بولی۔

"اگلے سال محترمہ کی گود میں ایں ایں کرتا ایک بچہ۔۔۔"وہ شرارت سے ہنسا۔

"ہائے اللہ!"شرما کر شبانہ نے اس کی بات کاٹی اور اسے دو ہتڑ مارنے کو دوڑی۔

ارشد بھی بھاگا۔دونوں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔اور بچوں کی طرح بیڈ کے گرد آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

واپسی کا پروگرام بن گیا۔آخری دن دونوں نے گھر والوں کے لیے چھوٹے موٹے تحفے تحائف خریدتے ہوئے گزرا۔مری کی ٹوکریاں بھی شبانہ نے خریدیں،ڈرائی فروٹ بھی لیا۔اپنی امی اور خالہ کے لیے

خوبصورت قمیصیں بھی خریدیں۔

دوسرے دن وہ مری سے واپس آرہے تھے۔ دونوں کچھ کچھ اداس تھے۔ اتنا خوبصورت قیام گوانہوں نے کیمرے کی آنکھوں میں بند کر لیا تھا، پھر بھی مری چھوڑتے ہوئے خوشی نہیں ہو رہی تھی۔

پنڈی سے لاہور ویگن سے آنا تھا۔ دونوں سامان سمیت ویگن کے اڈے پر پہنچ گئے۔ اس دن ویگنوں کے اڈے پر بہت رش تھا۔ پہلی ویگن میں جگہ نہ ملی، دوسری میں بھی نہ ملی۔ انہیں دو گھنٹے وہاں کھڑے رہنا پڑا۔ جو ویگن آتی، اس میں لوگ بھر جاتے۔

خدا خدا کر کے ایک ویگن میں دو سیٹیں ملیں۔ لیکن ایک سیٹ فرنٹ پر خالی تھی، دوسری پیچھے۔

"نہیں، اس میں نہیں بیٹھتے۔" ارشد نے کہا۔ "ابھی کوئی ویگن شاید آجائے۔ جس میں فرنٹ کی دونوں سیٹیں مل جائیں۔ اکھٹے بیٹھ کر تو جائیں گے۔"

شبانہ تھک گئی تھی۔ یوں بھی مری کے خوشگوار موسم کے مقابلہ میں پنڈی گرم تھی۔ اس طرح اڈے پر کھڑے رہنا مشکل تھا۔ وہ جلدی سے بولی۔ "کوئی بات نہیں اسی میں بیٹھ جاتے ہیں۔ فرنٹ سیٹ پر جو عورت ہے، اس کے ساتھ میں بیٹھ جاتی ہوں۔"

ارشد نے ہنس کر اسے دیکھا، پھر بولا۔ "ابھی سے ساتھ چھوڑ رہی ہو۔"

"اللہ۔" وہ جھنجھلائی۔ "کیسی باتیں کرتے ہیں، چلیں بیٹھیں۔ یہ بھی بھر گئی تو خدا جانے

گلی ویگن کب آئے۔ اب بھی چلیں، تو پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔" اس نے اسی ویگن میں سوار ہونے کے لیے اصرار کیا۔ ارشد کی مرضی بالکل نہیں تھی۔ پنڈی سے لاہور تک کا وہ سفر شبانہ سے دور سیٹ پر بیٹھ کر کب کرنا چاہتا تھا۔ لیکن شبانہ نے اسے مجبور کر دیا۔

بادل نخواستہ اس نے دو ٹکٹ لیے اور شبانہ کو فرنٹ کی سیٹ پر بیٹھا کر خود سب سے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کا

موڈ خراب ہو گیا تھا۔ دو ایک بار شبانہ نے اسے مسکرا کر دیکھا بھی لیکن اس نے منہ پھلا کر رخ دوسری طرف کر لیا۔ شبانہ اس کی ناراضگی سے لطف لینے لگی۔

ویگن چل پڑی۔ چار بجنے والے تھے۔ شبانہ کا اندازہ صحیح تھا۔ پہنچتے پہنچتے رات ہو ہی جانا تھی۔

لیکن۔۔۔۔۔۔

وہ کیا جانتی تھی۔۔۔۔۔۔۔

کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایسی رات ہو جائے گی، جس کا کوئی سویرا ہی نہ ہو گا۔ اندھی اندھیری رات جس کی طوالت ختم ہی نہ ہو گی۔ دن کی ساری روشنیوں کو کھا جائے گی۔

ویگن جہلم کے قریب تیز رفتاری سے ایک موڑ کاٹ رہی تھی کہ سامنے سے آنے والے ٹرک سے ٹکرا گئی۔ ایک خوفناک دھماکہ ہوا۔ چیخیں فضا کا سینہ چیر گئیں۔

ویگن کا اگلا دروازہ دھماکے سے کھل جانے پر شبانہ تو بال بال بچ گئی لیکن اس کا ارشی۔۔۔ خوابوں کا شہزادہ، اس کی زندگی کا محور، عمر بھر ساتھ دینے کے وعدے توڑ کر، وفا کی قسمیں نبھائے بنا۔۔۔ عہد و پیماں کا پاس کیے بغیر روٹھا روٹھا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے منہ موڑ گیا۔ ہمیشہ کے لیے روٹھ گیا۔

خباروں میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی۔

ٹرک اور ویگن کے حادثہ میں ایک شخص ہلاک اور چھ زخمی ہو گئے۔۔۔

لیکن کسے خبر تھے کہ اس چھوٹی سے خبر کے پیچھے کتنا بڑا المیہ۔۔۔؟۔۔۔ کن ہاتھوں کی سجی مہندی خونچکاں ہو چکی ہے۔ کس کی مانگ کا سندور لٹا ہے اور ڈھول بھری ہے۔ کس کی کائنات لٹ گئی ہے۔۔۔ کس کے ذہن کا توازن درہم برہم ہو گیا ہے۔۔۔

اور۔۔۔۔۔۔

اس حادثے سے کون جیتے جی مر گیا ہے۔

قصوروار

گلی میں پانی کے نل پر عورتیں، بچے اور مرد برتن لیے کھڑے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں بالٹی تھی۔ کسی میں ڈول، کوئی لکڑی کی ہتھی لگا ٹین لیے تھا اور کوئی گاگر، چھوٹے چھوٹے بچے بھی کوئی نہ کوئی برتن اٹھائے تھے۔ صبح ابھی اچھی طرح طلوع بھی نہ ہو پائی تھی۔ گلی میں ملگجا سا اجالا تھا۔۔ گرمی میں بلا کی شدت تھی۔ ساری رات ہوا کا اک جھونکا نہ آیا تھا۔ سورج ابھی نکلا بھی نہ تھا۔ لیکن فضا میں اس کی حدت بس گئی تھی۔ ننگ دھڑنگ بچے اور دھوتیاں لنگوٹیاں پہنے لوگ پانی کے لیے نل کے ارد گرد جمع تھے۔ اٹھارہ بیس گھروں کے لیے یہ ایک ہی نل تھا۔ صرف اسی محلے کے نہیں، ساتھ والی گلی کے لوگ برتن اٹھائے ادھر چلے آتے تھے۔۔۔ کبھی کبھی پانی کے لیے دھینگا مشتی بھی ہو جاتی۔ عورتیں تو اکثر باری ٹوٹنے پر تو تکار پر اتر آتی تھیں۔۔۔ کبھی کبھی اتنی زبردست لڑائی ہوتی۔۔۔ ہاتھا پائی کی نوبت آ جاتی۔ گھڑے ٹوٹتے اور گھروں کے رازوں کے بخیے ادھڑتے۔۔۔ خامیاں اچھلتیں، کمزوریاں مشتہر کی جاتیں۔۔۔ لیکن بیچ بچاؤ کرانے والے بھی بیچ ہی میں ہوتے۔ محلے داری کے ناطے جلد ہی صلح صفائی کرا دی جاتی۔۔۔ کہ پانی بھرنے آنا روز کا معمول تھا۔ اور دن میں ایک دفعہ نہیں، چار دفعہ جب پانی آتا، نلکے کے چاروں طرف انہی کا اجتماع ہوتا تھا۔ نل صرف لڑائی جھگڑے ہی کی جگہ نہیں تھی۔۔۔ محلے کا نیوز بیورو بھی تھا۔۔۔

خبریں یہاں سے نکلتیں۔۔۔ اچھی بری، چٹ پٹی، مصالحے دار، سبھی قسم کی خبریں یہاں سے جنم لیتیں اور آناً فاناً محلے میں پھیل جاتیں۔ پانی کے ساتھ لوگ خبروں کا بھی بار اٹھائے پھرتے۔۔۔ عورتیں تو عورتیں، مرد

بھی مزے لے لے کر خبریں سناتے اور سنتے۔۔۔ یہ خبریں نہ تو سیاسی ہوتیں، نہ ملکی معیشت کی۔۔۔ یہ خبریں زیادہ تر گھروں کے راز ہوتے۔۔۔ گھروں کی باتیں ہوتیں۔۔۔ ایک کے کان میں کوئی بات پڑ جاتی تو جب تک سب کے سامنے اگل نہ لیتا، چین نہ پڑتا۔ بڑی رازداری سے خبر سنائی جاتی۔۔۔۔ ادھر ادھر دیکھا جاتا۔۔۔ اور جب یقین ہو جاتا کہ خبر سے متعلقہ شخصیت یہاں کھڑی نہیں ہے۔۔۔ تو خبر اگل دی جاتی۔۔۔ ان میں کئی مخبر بھی ہوتے، متعلقہ شخص کو بتا دیتے، پھر چپقلش ہوتی۔۔۔ بول چال بھی بند ہو جاتی۔

لیکن

معمول ٹوٹتا نہیں تھا۔۔۔

باتیں ہوتی رہتیں۔ خبریں بنتی رہتیں اور پورے محلے میں پھیلتی رہتیں۔

"اے تمہیں پتہ ہے۔۔۔ راجو کے ابا نے دو بکس چیزوں سے بھرے بھیجے ہیں۔ راجو کی اماں کو۔۔ بھئی کیا مزے ہیں۔۔۔ دوبئی جانے والوں کے۔"

"اندر ہی اندر گھسائے جا رہی ہے سارا مال۔۔ سچ سواد کا کبھی کپڑا پہنا ہے نہ گھر میں کوئی چیز نظر آتی ہے۔"

"سن۔۔۔۔"

"کیا؟"

"تجھے نہیں پتہ۔۔۔"

"کیا؟"

"بیچتی ہے مال۔۔۔ دونے داموں۔۔۔۔ ہوں۔"

"اچھا یہ بات ہے۔۔مال بناتی ہے۔"

"بہت۔"

مال پر تبصرے کرنا نلکے کے گرد کھڑے ہونے والوں کا حق ہوتا۔۔۔پھر کسی دوسرے گھر کی بات چھڑتی۔

"رمضان نے فرج خریدی ہے۔۔۔"

"ہاں بھئی خریدے گا کیوں نہیں۔۔۔مال تھوڑا تو نہیں بناتا۔۔دنوں ہی میں بن گیا ہے۔۔۔مکان کی اوپر کی چھتیں ایسے ہی تو نہیں ڈلوا رہا۔۔۔"

"بڑی رشوت لیتا ہے۔۔۔"

"اے بہن! کسے نہیں پتہ۔۔۔توبہ ہے۔اپنا اپنا ایمان۔"

کبھی کوئی رازداری سے دوسرے کے کان میں کسی کی بات کہتی۔"پتہ نہیں کون کون آتا ہے ان کے گھر۔"

"ہاں!۔۔۔۔مجھے بھی کھٹکتا ہے۔۔۔چار چار مسٹنڈے تو ان گنہگار آنکھوں نے اندر جاتے دیکھے ہیں۔"

"کچھ ایسے اچھے لوگ نہیں لگتے۔۔۔۔"

"ہمیں کیا۔۔۔۔کوئی نہ کوئی گل کھلے گا، دیکھ لینا۔"

یوں کسی نہ کسی کے راز فاش ہوتے ہی رہتے۔ان میں کتنی حقیقت اور کتنا مغالطہ ہوتا۔۔۔یہ کوئی نہ دیکھتا۔۔۔۔

پھر

اس دن ایسے ہی اک دھماکہ خیز خبر پھوٹی۔۔۔۔نیما گوالن ٹین کے منہ بند ڈبوں میں دودھ لا کر محلے کے تین چار گھروں میں دیتی تھی۔

ایک گھر سردارے کا بھی تھا۔

ابھی ابھی وہ اسی گھر سے نکل کر گلی میں آئی تھی۔۔۔تیز تیز قدموں کے ساتھ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔۔۔اور بدحواسی کی سی گھبراہٹ اس کے چہرے پر پھیلی تھی۔

آتے ہی اس نے دونوں ڈبے نلکے کے قریب تھڑے پر پٹخ دیئے اور خود بھی بیٹھتے ہوئے بولی۔۔۔۔"ارے کچھ سنا تم لوگوں نے۔"

"کیا۔۔"کئی آوازیں بیک وقت آئیں اور چہرے اس کی جانب پلٹے۔

"سردارے کی بہن بھاگ گئی۔۔۔"اس نے ادھر ادھر دیکھ کر یقین کرتے ہوئے کہ سردارے کے یہاں سے کوئی نہیں ادھر۔۔۔جلدی سے دھماکہ کیا۔

"کیا کہا؟"۔۔۔۔عورتیں مرد پانی بھول کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔

"سردارے کی بہن بھاگ گئی ہے۔"۔۔۔نیما اب پورے اطمینان اور فخر سے یہ خبر سنا رہی تھی۔۔۔محلے میں ابھی تک کسی کو پتہ نہیں چلا تھا۔وہی پہلی ہستی تھی جو اتنی بڑی خبر دوسرے لوگوں تک پہنچانے کا موجب بنی تھی۔

"سردارے کی بہن؟"

"وہ۔۔۔۔۔۔وہ رخسانہ۔۔۔۔"

"مریل سی لڑکی۔"

"تمھیں کس نے کہا۔"

"بے پر کی اڑا رہی ہو۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"وہ لڑکی ایسی نہیں تھی۔۔۔"

"لوگ بھی ایسے نہیں۔۔۔۔عزت دار لوگ ہیں۔۔۔۔۔"

"ایسے کسی کی بات نہیں اڑاتے۔۔۔۔"

لیکن جب گوالن نے گال پر انگلی رکھ کر سب کو ملامت کرتے ہوئے کہا۔"لو بھلا مجھے کیا ضرورت

ہے جھوٹی بات کہنے کی۔ابھی ابھی تو میں دودھ دینے گئی تھی۔۔۔۔۔خود جا کر دیکھ لو۔۔۔پوچھ لو۔۔۔ان کے گھر میں تو جیسے ماتم ہو گیا ہے۔ سردار سر نہیواڑے ہاتھ مل رہا ہے۔اس کی بیوی بین کر رہی ہے۔اے وہ۔۔۔کیا نام ہے اس کا۔۔۔۔"

"مختارا۔۔۔۔۔"کسی نے کہا۔

"ہاں وہی۔۔۔وہ تو غصے سے لال پیلا ہو رہا ہے۔ بھئی میرا تو کلیجہ کانپنے لگا۔ کہیں رخسانہ اس کے ہاتھ آ گئی تو زندہ نہیں چھوڑے گا۔۔۔۔"

سب دم بخود اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"بہت برا کیا اس چھوکری نے۔۔۔۔سردارے کی بیوی کا زیور بھی۔اور سردارے نے کل ہی دو ہزار روپیہ دکان کا گھر لا کر رکھا تھا۔"

"اس کا بھی صفایا کر گئی۔"کسی نے کہا۔

"اور کیا۔۔۔ابھی تو موٹی موٹی چیزیں ہی دیکھی ہیں۔خدا جانے کیا کچھ لے گئی۔۔۔۔"

"توبہ توبہ۔۔۔"کوئی بولا۔

"منہ کالا کر گئی اپنا۔۔۔"دوسری عوت نے کہا۔

"ساتھ گھر والوں کا بھی کر گئی۔۔۔"تیسری نے لقمہ دیا۔

"اے ہے مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔۔۔"کس اور نے کہا۔"بڑی ٹھہری ہوئی لڑکی تھی۔محلے میں ننگی نہیں نکلتی تھی۔۔۔"

"شریفوں کی اولاد تھی۔"

"اس کی ماں کو خدا بخشے۔۔۔برسوں ہی اس محلے میں رہی۔کبھی کسی نے اونچی آواز نہ سنی تھی۔۔۔۔۔۔"

"بیاہ کر ہی یہیں آئی تھی۔۔۔۔۔"کسی معمر عورت نے کہا۔

رخسانہ کے فرار کی خبر نکلنے پر پھوٹی اور آناً فاناً پورے محلے میں پھیل گئی۔۔اتنی بڑی

ور بری خبر کو سہارنا بھی بڑا کام ہوتا ہے۔۔۔۔خبر ہر کسی نے سن لی تھی۔۔۔پھر بھی ہمسائیاں، ہمسائیوں اور ملنے جلنے والوں کو یہ خبر سنانے کی سعادت حاصل کر رہی تھیں۔

اشفاق کی اماں نے صحن کی درمیانی دیوار تھپ تھپا کر نجمہ کی ماں کو پکارا۔"اے بہن!۔۔۔۔کہاں ہو۔کچھ سنا تم نے۔۔۔۔۔"

نجمہ کی اماں جمعدارنی کو خبر سنا رہی تھی۔جلدی سے جواب دیا۔"سن لیا۔۔۔رخسانہ کی بات ہے نا۔۔۔اللہ ماری بھاگ گئی۔۔۔نام ڈبو دیا خاندان کا۔۔"

رسولواں مٹی کا گھڑا پانی سے پورا بھر کر بھی نہیں لائی۔۔۔چھلکتا گھڑا گھڑونچی پر رکھا۔۔ساس کو خبر سنائی۔۔۔"سردارے کی بہن بھاگ گئی۔وہ رخسانہ۔۔۔رخسانہ بھاگ گئی اماں۔"

ساس نے سینے پر دوہتھڑ مارا۔۔۔۔۔۔۔۔۔"اے نہیں۔"

"اللہ قسم۔۔۔۔بھاگ گئی۔۔۔کئی ہزار کا تو زیور لے گئی۔۔۔۔ہزاروں نقد اڑا لیے۔۔۔"

صدیق نے اپنے ہمسایے کو بتایا۔۔۔"بری بات ہے یار۔۔لوگ تو ایسے نہیں تھے۔اس لڑکی نے جانے کیوں یہ قدم اٹھایا۔۔۔"""

"جوانی دیوانی ہوتی ہے میرے بھائی۔۔۔لونڈیا نے کہیں اونچا ہاتھ مارا ہوگا۔"

جتنے منہ اتنی باتیں۔۔انہونی بات ہوگئی تھی۔چرچے تو ہونا ہی تھے۔۔۔گھروں ہی میں نہیں، گلی میں بھی باتیں ہونے لگیں۔بڑی بوڑھیاں تصدیق کرنے سردارے کے گھر بھی جا پہنچیں۔نیما گوالن نے جو بات کہی تھی۔بلاشبہ سچ تھی۔

رخسانہ بھاگ گئی تھی۔

بھابھی کے گلوبند بندے اور دو انگوٹھیوں کے علاوہ سردارے کا دوہزار روپیہ بھی لے گئی تھی۔۔۔

سب لعن طعن کر رہے تھے۔رخسانہ کو کوس رہے تھے۔اس کی جوانی کو بے لگام کہہ

رہے تھے۔عزت دار بھائیوں کو تسلیاں دے رہے تھے۔۔۔رخسانہ سے زیادہ زیور کو رونے والی بھابھی کی دل جوئی کر رہے تھے۔۔۔رخسانہ کا فعل قابل مذمت تھا۔اس نے گھر سے باہر قدم نکال کر اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگا دیا تھا۔۔۔ماں باپ کا نام ڈبو دیا تھا۔بھائیوں کی عزت اچھالی تھی۔جتنا کوسا جاتا۔۔۔جتنی لعن طعن کی جاتی۔جتنا برا بھلا کہا جاتا۔۔۔کم تھا۔۔۔سردارے کے گھر آنے جانے والوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔جو کوئی سنتا، تصدیق اور دل جوئی کرنے چلا آتا۔

رشتہ دار، عزیز، دوست احباب، سب ہی اس روح فرسا حادثے کی خبر سے متوحش تھے۔رخسانہ کی تلاش میں گھر والوں کا ساتھ دے رہے تھے۔رخسانہ کے ماموں نے تو تھانے رپورٹ بھی درج کروادی تھی۔

۔۔۔کسی پر شک شبہ تو تھا نہیں۔نہ ہی سردارے یا مختارے کی کسی سے ایسی دشمنی تھی کہ انتقام کا نتیجہ سمجھا جاتا یہ فرار۔

بہر حال

رخسانہ بھاگ گئی تھی۔

رخسانہ جو سولہ سترہ سالہ سوکھی سڑی دھواں کھائی لکڑی کی سی رنگت والی لڑکی تھی۔جس کے چہرے پر تروتازگی تھی نہ وجود میں کوئی جاذبیت۔جس پر کبھی کوئی پسندیدہ نظر پڑی بھی ہوگی تو بے نیل و مراد لوٹی ہوگی۔۔۔اسی گھر میں وہ پیدا ہوئی تھی۔پلی بڑھی تھی۔۔۔اور اسی گھر سے اسے بھائیوں کے کندھے دیے جانے والے ڈولے میں بیٹھ کر سسرال جانا تھا۔

لیکن

وہ ڈولے کا انتظار نہ کر سکی۔۔۔شاید اس کی دانست میں کوئی ایسا ڈولہ بنا ہی نہ تھا۔جس میں وہ سوار ہو کر بھائیوں کے کندھا دینے پر ہلچل مچے من کو بہ مشکل سنبھالتی پیا گھر روانہ ہوتی۔

رخسانہ ایک شریف متوسط گھرانے کی لڑکی تھی۔سات بھائی بہنوں میں اس کا نمبر آخری تھا۔بڑی تینوں بہنیں بیاہی جا چکی تھیں۔بھائی بھی گھر بار والے تھے۔مختارا اسی شہر کے کسی محلے میں کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔افتخار نوکری پیشہ تھا۔نگر نگر گھومتا پھرتا تھا، سردارے نے چونکہ باپ کی آرے کی مشین سنبھالی تھی۔بھائیوں میں بڑا تھا۔اس لیے اسی گھر میں مقیم تھا۔اس کی بیوی بھی چالاک ہوشیار عورت تھی۔جانتی تھی اس زمانے میں اپنا گھر نعمت ہے۔اس لیے سسر کے مرنے کے بعد ساس اور نند کا بوجھ گوارا کر لیا تھا کہ ایک احاطے کے اس دو منزلہ مکان میں مکانیت کے علاوہ سسر اور ساس کی عمر کی کمائی کی بنی کافی چیزیں بھی تصرف میں لائی جا سکتی تھیں۔رخسانہ اور اس کی امی کے پاس اوپر والی منزل کا ایک کمرہ تھا۔۔۔ان کے لیے یہی غنیمت تھا کہ باپ کے مرنے کے بعد بھائی روٹی دینے والا تو تھا۔۔۔روایتی ساس بہوؤں والی کش مکش یہاں بھی تھی۔لیکن بہو کا زور تھا۔اس لیے ماں بیٹی دم سادھے دن گزارے جا رہی تھیں۔

ان دنوں رخسانہ بارہ تیرہ سال کی تھی۔سکول جانا، واپسی پر بھابھی کے کام کرنا، اس کے بچوں کو کھلانا اور رات کو امی سے لپٹ کر سو جانا ہی اس کے کام تھے۔۔۔ماں کے سینے میں ممتا کی اتنی گرماہٹ ہوتی تھی کہ رخسانہ

حالات کی ساری تلخیاں اس گرماہٹ میں پگھلا دیتی، جو دکھ، جو چڑ کے بھابھی کے رویے سے لگے تھے۔ وہ ماں کے سینے سے لگتے ہی چھوٹ جاتے اور وہ نیند کی وادیوں میں کھو کر سنہرے سپنوں میں کھو جاتی۔
بھابھی کا رویہ اس سے کبھی بھی محبت بھرا نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ وہ آگے بڑھ بڑھ کر اس کے کام کرتی، اس کے بچوں کو کھلاتی پیار کرتی۔۔۔ اس کا بھی جی چاہتا جیسے بھابھی دودھ کا گلاس لیے لیے پھرتی ہے۔ جیسے ممتا سے اپنی بچی کے بال سنوارتی ہے۔ اسے بھی اپنے

بچوں میں شامل کر کے ایسے رویے اپنا لے۔
لیکن
وہ تو جیسے بھابھی کے سر پر بوجھ تھی۔۔۔ اس کی آنکھوں میں اپنے لیے اس نے ہمیشہ غیریت اور اجنبیت کے جذبے دیکھے۔ کبھی اپنائیت کا احساس نہیں جاگا۔۔۔ ایک غیر محسوس سی جلن اور لعن طعن ہی کی کیفیت دیکھی۔
بھائی کبھی کبھی اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا کرتا تھا۔ لیکن جب بھی ایسا ہوتا۔ اس کا کوئی نہ کوئی بچہ مچل کر مخل ہو جاتا۔ بھائی کی ساری توجہ اپنے بچے کی طرف مبذول ہو جاتی اور بھابی جس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی ہوتیں، ایک دم سے پھول کی طرح کھل اٹھتی۔۔۔ رخسانہ بے حد حساس تھی۔ دل ہی دل میں اس بے رحم رویے پر کڑھتی رہتی۔ شاید یہی وجہ تھی، وہ سوکھتی سڑتی چلی جا رہی تھی اور اس کی رنگت جوانی کے نکھار کی بجائے دھواں کھائی لکڑی جیسی ہوتی جا رہی تھی۔
انہی دنوں رخسانہ کی امی چند یوم بیمار رہ کر اللہ کو پیاری ہو گئی۔
رخسانہ کی دنیا اندھیر ہو گئی۔۔۔ وہ پاگلوں کی طرح ماں سے لپٹ لپٹ گئی۔ "اماں اب میں کس کے ساتھ سویا کروں گی۔ کون مجھے سینے سے لگایا کرے گا۔۔۔ اماں میں کیا کروں گی۔۔"

وہ بار بار یہی دہائی دے رہی تھی۔
کچھ لوگ اس کی دہائی پر آنسو بہا رہے تھے۔ کچھ چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ بھابھی کی خشمگیں نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔
"گھر میں اور تو کوئی رہا نہیں نا۔" جل کر اس نے ساتھ بیٹھی عورت سے کہہ دیا۔
"اے بی بی! بچی ہے نا۔۔۔ ماں۔۔۔ ماں ہی ہوتی ہے نا۔۔۔" اس معمر عورت نے کہا۔

"چوبیس گھنٹے ماں بیٹی کا ساتھ تھا نا، اب بچھڑ گئی بیچاری۔" تیسری عورت بولی۔
"ٹھیک ہو جائے گی۔ خدا کا شکر ہے بھائی بہن ہیں۔ سہارا مل ہی جائے گا۔" کسی اور نے کہا۔
تو بھابھی جل کر بولی۔ "سارے بار تو ہم نے اٹھائے ہوئے ہیں۔ اب بھی ہم ہی اٹھائیں گے۔ باقی بہن بھائی پہلے کونسا پوچھتے تھے، جو اب پوچھیں گے۔"
عورتیں آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسری کو اشارے کر کے چپ ہو گئیں۔ دو ایک نے اس کی بات کی تائید کی۔
"ہاں بہن۔۔۔ ماں بیٹی کو تم نے ہی سنبھالا تھا۔۔۔ اب ماں کی بیماری، سستی میں بھی تم ہی نے خدمت کی ہے۔ گور کفن کا انتظام کر رہے ہو۔۔۔ ایک بچی کا کیا ہے، جہاں اپنے بچے وہاں ایک یہ بھی۔"
"بالکل۔"
باتیں ہوتی رہیں۔ جنازہ اٹھا تو رخسانہ کی تڑپ دیدنی تھی۔ ننگے سر، ننگے پاؤں گلی میں سینہ کوبی کرتی نکل آئی۔ عورتوں نے سہارا دینا چاہا لیکن وہ لوگوں کے کندھوں پر سوار کٹھور بنی اماں کو جاتے دیکھتے چلاتی رہی۔۔۔
"میں کیا کروں اماں۔۔۔۔۔ کس کے ساتھ لپٹ کر سوؤں گی۔ کون پیار کرے گا مجھے۔۔۔"
رخسانہ کو واقعی ماں سے لپٹ کر سونے کی عادت تھی۔۔ جتنے دن گھر میں بہنیں رہیں۔ وہ اماں ہی کی طرح

اسے سینے سے لگا کر رات کو تھپکتیں۔ باتیں کرتیں اور سلا دیتیں۔ لیکن کب تک۔۔۔ بہنوں کو اپنے گھروں کو سدھارنا تھا اور رخسانہ کو حقیقت کا سامنا کرنا ہی تھا کہ ماں کے مرنے کے بعد وہ اکیلی رہ گئی ہے۔
روتی دھوتی تینوں بہنیں اپنے گھروں کو سدھاریں۔ دونوں بھابیاں بھی چلی گئیں۔

رشتے دار، عزیز، اماں کی مرگ پر آئے تھے، وہ بھی چل دیئے۔ اب گھر میں بڑا بھائی، بھابی اور بچے ہی رہ گئے۔ اس گھر کی مستقل فرد اماں بھی تھیں۔ جو اپنی جگہ اک خلاء چھوڑ کر عدم کو سدھار چکی تھیں۔
دن گزرا، رات آئی تو رخسانہ سہم گئی۔۔۔ بھابی سے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "اب میں کہاں سوؤں گی۔"
"کہاں سونا چاہتی ہو۔" بھابھی نے غیر ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔
"اماں کے کمرے میں اکیلی کیسے سوؤں گی، ڈر لگتا ہے مجھے۔"
"ڈرنے کی تو کوئی بات نہیں۔"
"نہیں بھابھی، وہاں اکیلی نہیں سوؤں گی۔"
"گڈو کو ساتھ سلا لیا کرو۔ گڑیا سو جایا کرے گی تمہارے ساتھ۔"
اس رات رخسانہ گڈو اور گڑیا کو اپنے کمرے میں لے گئی۔ اپنے سے کم عمر دونوں بچے اس کی ڈھارس بندھا سکے۔ وہ ساری رات جاگتی رہی۔
بچے دو چار دن وہاں سوئے، پھر وہ نیچے چلے آئے۔۔۔ انہیں ماں باپ کے ساتھ سونے کی عادت تھی۔ رخسانہ کی منتیں کرنے کے باوجود نیچے چلے آئے۔
"میں بھی نیچے آجاؤں بھابی۔۔۔" اس نے دونوں بچوں کو بضد پایا تو بولی۔
"نیچے کہاں سوئے گی۔"
"گڈو اور گڑیا کے پاس۔"

بھابی نے ایک زہریلی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہا۔ "تھوڑی اور بڑی ہو لے۔ پھر سونا بھائی بھابی کے کمرے میں۔"۔۔ رخسانہ چپ ہو گئی۔
پھر اس نے دل کڑا کیا اور اوپر کمرے میں چلی آئی۔۔۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ اب اسی کمرے میں سویا کرے گی۔۔۔ بالکل نہیں ڈرے گی۔۔۔ اپنا کمرہ ہے، تو ہے۔

اس نے لحاف میں اپنا منہ سر لپیٹ لیا۔۔۔۔ اماں کا گاؤ تکیہ سینے سے لگا کر اس کے گرد بازو اس طرح لپیٹے جیسے اماں کے بھاری بھر کم وجود کے گرد لپیٹ کر سویا کرتی تھی۔ اپنے آپ کو باور کرایا کہ یہ تکیہ نہیں، اماں ہی ہے۔
وہ واقعی سو گئی۔
لیکن رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔۔۔ اماں کے وجود کی جگہ اس کے بازوؤں میں گاؤ تکیہ تھا۔۔۔ ڈر کر اس نے چیخ ماری، پھر تھر تھر کانپنے لگی۔۔۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا تو یوں لگا اماں کمرے میں ٹہل رہی ہے۔۔۔ مری ہوئی اماں کہاں سے آگئی۔۔۔۔ خوف و دہشت سے اس کا وجود تھرا اٹھا۔ سردی کے باوجود پسینہ ہو گئی۔۔۔۔ اب تو چیخ بھی حلق میں گھٹ گئی۔ وہ بستر میں گر گئی۔ اللہ جانے بے ہوش ہو گئی یا خوف سے پتھرا گئی۔
پھر تنہائی کا خوف اس کے اندر بیٹھتا چلا گیا۔۔۔ وہ تنہا ہوتی چلی گئی۔ اس تنہائی کو نہ تو بھائی نے بانٹا، نہ بھابی نے، نہ ہی ان کے چھوٹے بڑے بچوں نے۔۔۔ رخسانہ بھرے پرے گھر میں بھی اکیلی ہو گئی۔
دن گزرتے چلے گئے۔
تنہائی کا احساس شدت اختیار کرتا گیا۔۔۔۔ رخسانہ کو یوں لگتا۔ جیسے وہ گھر کے ہر فرد سے کٹ چکی ہے۔ کوئی اس کا اپنا نہیں۔ وہ خود کسی کی نہیں۔۔۔ سارا دن مشین کی طرح بھابی کے کام کرتی۔ مفت کی نوکرانی ملی تھی

بھابی کو۔۔۔ان کاموں کو رخسانہ نے ہمیشہ ڈیوٹی سمجھ کر کیا۔ کبھی لگن اور خلوص سے نہیں کیا۔۔۔ مشین جو تھی۔۔ جذبے تو گوشت پوست سے بنے انسانوں میں ہوتے ہیں۔ جامد مشینوں میں تو نہیں۔

ذات کے اندر پھیلی تنہائی نے اسے بے حس بنا دیا تھا۔ نفرت اور سرد مہری سکھا دی تھی۔۔۔ بھابھی کا بڑا بیٹا بیمار پڑ گیا۔۔ تو اسے کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ اس کی بیٹی کا پاؤں پھسلا اور کئی دن پاؤں کی موچ سے وہ بستر پر پڑی رہی تو رخسانہ کے اندر خوشی کی لہریں پھوٹتی رہیں۔۔۔ بھابھی کا ہاتھ جل گیا تو اس کا جی چاہا اس جلن پر قہقہے لگائے۔۔ بھائی کی آرے کی مشین کا پٹہ ٹوٹنے سے کئی سو کا نقصان ہو گیا۔ تو اس کو جانے کیوں خوشی ہوئی۔

حالات نے اسے اذیت پسند بنا دیا۔

کسی نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ نہ رکھا۔ بھابھی نے تو شکایتیں کر کر کے بھیا کو بھی بدظن کر دیا تھا۔۔ اس کے لیے بھی اب رخسانہ گھر میں پڑی بیکار سی شے کے علاوہ کچھ نہ تھی۔ اسی لیے اب وہ سخت کھردری اور پتھریلی سی بنتی جا رہی تھی۔۔ اس کی اندرونی کیفیات کا جائزہ لے کر شفقت اور محبت سے رام کرنے والا کون تھا۔۔ اکھڑ اور بدمزاج سی لڑکی نے تو ملنے جلنے والوں کو بھی مایوس کر دیا تھا۔ وہ بھی اب بھابھی سے کہتے۔ "تمہارا ہی جگرا ہے بہن۔۔ جو اس لڑکی سے نباہ کر رہی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔ دوسری بھابیاں کنی کترا گئیں۔ یہ مصیبت کا پہاڑ تمہارے لیے کھڑا کر گئیں۔۔۔۔۔"

کوئی ملنے والی کہتی۔ "تمہارا ٹھیکہ تو نہیں۔۔۔ مختارے سے کہو اسے لے جائے۔۔۔۔ ہر وقت تمہارے اعصاب پر سوار رہتی ہے۔"

کوئی کہتی۔ "کہیں نکاح پڑھوا کر دفع دفعان کر دو۔۔ تمھیں کیا پڑی ہے اپنا دل و دماغ خراب کر رہی ہو۔۔"

نکاح کی بات پر بھابی جل بھن کر کہتی۔ "اے کون اس کا ڈولہ لینے آئے گا۔ صورت نہ شکل، بھاڑ میں سے نکل۔۔۔ یہ تو لگتا ہے ساری عمر میرے دماغ پر سوار رہے گی۔۔۔۔۔"

یہ باتیں رخسانہ بھی سنتی۔۔۔۔ تکلیف ہوتی اور اپنے اندر کی جلن کسی نہ کسی طور پر بھابھی یا اس کے بچوں پر نکال لیتی۔۔۔

جلن تو نکال لیتی۔۔۔۔۔ لیکن ذہن سلگتا ہی رہتا۔ احساس کمتری ڈنگ مارتا۔۔۔ اور وہ سوچتی، کیا وہ ایسی ہی بدشکل ہے۔ اتنی ہی مکروہ صورت ہے کہ کوئی اس کا ڈولہ لینے نہیں آ سکتا۔

وہ پہروں آئینے میں اپنا عکس دیکھتی رہتی۔ واجبی سے شکل تھی۔ جس پر حالات کی گرفتگی مسلط تھی۔۔۔ اسے یقین ہونے لگتا۔۔۔ کہ واقعی وہ ساری عمر بھابی کے سر پر سوار رہے گی اور اس کا ڈولہ لینے کوئی نہیں آئے گا۔

رخسانہ خوبصورت نہ تھی۔ پھر بھی لڑکی تو تھی۔۔۔۔ ایسی لڑکی جس پر جوانی آ رہی تھی۔ جوانی کا اپنا ہی حسن، اپنا ہی نکھار ہوتا ہے۔ لیکن خاموشی میں بھی اپنے ہونے کا احساس دلا دیتا ہے۔ بھابی تو اس کی شکل و صورت کو کوستی تھی۔۔۔ اس لیے کہ مفت کی نوکرانی نکاح پڑھوا دینے سے ہاتھ سے نکل جانے کا خدشہ تھا۔۔۔ ویسے گونگا حسن و نکھار تو وہ بھی محسوس کر رہی تھی۔

اس گونگے حسن و نکھار نے ٹھیکے دار کے بیٹے کو بھی متوجہ کر لیا تھا۔ ساتھ والا گھر ادھیڑ کر نئے سرے سے بن رہا تھا۔۔۔ ٹھیکے دار کے ساتھ سکوٹر پر بیٹھ کر اس کا لڑکا بھی کبھی کبھی آیا کرتا تھا۔۔۔ مزدوروں راجوں کے ساتھ چند گھنٹے وہ بھی گزارتا تھا۔۔۔ ابا اس کو زبردستی ساتھ لاتا تھا۔ آوارہ مزاج لڑکا تھا۔۔۔ پڑھائی سے جان چراتا تھا۔ نویں جماعت سے پڑھنا لکھنا چھوڑ دیا۔۔۔ باپ کے پیسے پر عیش اڑاتا۔۔۔ سارا سارا دن دوستوں کے

ساتھ اللے تللے کرتا تھا۔۔۔ تنگ آکر باپ نے اسے اپنے ساتھ کام کے لیے رکھ لیا تھا۔اس کے پاس دو تین ٹھیکے تھے۔۔۔۔۔۔۔ ہر جگہ وہ اسے ساتھ لیے لیے پھرتا۔

ان دنوں اس مکان کا ٹھیکہ لیا تھا۔۔۔ جو رخسانہ کے گھر سے ملحق تھا۔

رخسانہ جوان تھی۔ جوانی اس پر پھوٹ کر نہیں برسی تھی۔ ٹھنڈی نرم پھوار کی طرح بھی اندر بھگو نہیں گئی تھی۔۔ کورے کٹورے میں پانی پڑے تو سوں سوں کی آوازیں آپوں آپ آتی ہیں۔کچھ یہی حال رخسانہ کا بھی تھا۔۔ کورے کٹورے میں پانی پڑ رہا تھا۔اور سوں سوں کی آوازیں اسے چونکا رہی تھیں۔

انہی دنوں بھابی کا ابا بیمار پڑ گیا۔۔ بھابی بال بچوں سمیت میکے جانے کی تیاری کرنے لگی۔

رخسانہ نے پوچھا۔"بھابی۔۔۔۔۔ میں بھی ساتھ چلوں۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ ابا میرا بیمار ہے۔۔ تیرا کیا کام۔۔۔ پورا خاندان لے کر جا بیٹھوں ابا کے گھر۔۔۔"

"تو۔۔۔۔۔۔ تو میں اکیلی رہوں گی۔۔۔"

"اب تو اتنی بچی بھی نہیں۔۔۔ کہ اکیلی ڈرے گی۔۔۔ رات کو بھائی گھر آہی جایا کرے گا۔"

"لیکن دن کو۔۔۔۔"

"اے ہے، آباد محلے میں تو اکیلی رہے گی؟۔۔۔۔۔۔۔۔ آس پاس لوگ بستے ہیں۔ ویرانہ تو نہیں ۔۔۔۔۔۔"

"بھابی گڑیا کو چھوڑ جاؤ۔۔۔۔ مجھے اکیلے میں وحشت ہوتی ہے، خوف آتا ہے۔۔۔ گڈو یا گڑیا کو چھوڑ جاؤ۔۔۔ خدا جانے تمھیں کتنے دن رہنا پڑے وہاں۔۔۔ گڈو اور گڑیا کے سکول کا بھی تو حرج ہوگا۔"

لیکن بھابی نے بچوں کو اس کے پاس چھوڑنا گوارا نہ کیا۔۔۔ ناگواری سے بولی۔"ٹھہرو، سنیں آجایا کرے گی تیرے پاس۔"

"لیکن سارا دن تو کوئی نہیں بیٹھا رہے گا میرے پاس۔"

"بک بک نہ کر۔۔۔ کوئی نہیں کھا جاتا تجھے۔۔۔ کنڈی لگا لیا کرنا باہر کے دروازے کی۔۔۔"

"لیکن بھابی۔۔۔۔ مجھے خوف آتا ہے۔۔۔"

"کس کا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔۔۔۔ تو بھابی نے چمک کر کہا۔"کوئی نہیں اٹھالے جائے گا تجھے۔ایسی حور پری نہیں تو۔۔۔۔۔۔"بھابی تمسخر سے بولی۔وہ چپ ہوگئی۔

پھر

اسی شام وہ اپنے بچوں سمیت میکے جانے کے لیے سٹیشن چل دیں۔

رخسانہ گھر میں اکیلی رہ گئی۔۔۔ پہلے بھی بھابی کبھی کبھی اسے گھر میں اکیلی چھوڑ جایا کرتی تھی۔۔۔۔۔ لیکن چند گھنٹوں یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ دن کے لیے۔۔۔۔۔۔ یہ گھنٹے یا دن کاٹنا رخسانہ کے لیے کتنا مشکل ہوتا تھا، وہی جانتی تھی۔

اب تو جانے کتنے دن رخسانہ کو خاردار تنہائی کی جھاڑیوں میں الجھتے سلجھتے گزرانا تھے۔ لیکن یہ تنہائی اب کے زیادہ کٹھن نہیں ہوئی۔ برابر والا مکان بن رہا تھا۔اور مزدوروں، راجوں اور دوسرے کام کرنے والوں کا شور سنائی دیتا رہتا تھا۔

رخسانہ کام ختم کر کے باہر کے دروازے کی کنڈی اندر سے چڑھا کر اوپر اپنے کمرے میں آجاتی اور ادھ کھلی کھڑکی میں کھڑی ہو کر مزدوروں، راجوں اور دوسرے کاریگروں کو کام کرتے دیکھتی رہتی۔

اس کے اندر کی تنہائی کچھ مٹ سی جاتی۔

اس دن بھی وہ کھڑکی میں کھڑی تھی کہ ٹھیکے دار کے بیٹے امجد کی نگاہوں سے نگاہیں ٹکرا گئیں۔۔۔۔۔ جانے امجد کب سے اسے تک رہا تھا۔ وہ جھجک کر کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی۔

لیکن جانے کیوں تھوڑی دیر بعد اس نے پھر کھڑکی سے جھانکا، اب کے امجد کسی مزدور سے سیمنٹ کی کڑاہی اوپر لے جانے کو کہہ رہا تھا۔۔۔

وہ اسے دیکھتی رہی۔ اور جب وہ پلٹا اور اس کی نگاہیں اس پر پڑیں، تو وہ جلدی سے کھڑکی سے ہٹ گئی۔۔۔۔ شام تک یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل کھیلا گیا۔

اس رات رخسانہ کو یوں لگا جیسے کورے کٹورے میں پانی بار بار پڑ رہا ہے۔ اور ہر بار سوں سوں کی آوازیں تیز ہوتی جا رہی ہیں۔

اگلے دن جب رخسانہ کھڑکی میں آئی۔ تو جیسے پہلے ہی امجد منتظر بیٹھا تھا۔۔۔۔ آج وہ اسے دیکھ کر بڑے انداز میں مسکرا دیا۔

اس مسکراہٹ کی کوئی زبان تھی ضروری۔۔۔۔ رخسانہ سمجھ گئی۔۔۔۔ یہ سمجھنا ہی اس کے لیے الجھن کا باعث بن گیا۔ اس نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور دل تھام کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔

اسے یقین کب آ رہا تھا۔ کہ کوئی کب اسے اتنی اپنائیت سے، ایسی خوبصورت مسکراہٹ کا پیغام دے سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ سے سوال کرنے لگی۔ وہ حور پری نہیں تھی۔ صورت نہ شکل، بھاڑ میں سے نکل۔ بھابھی کے الفاظ اس کے ذہن میں کندہ تھے، پھر۔۔۔۔۔ پھر اس نوجوان کو کیا سوجھی۔۔۔۔۔

اس نوجوان کو کیا سوجھی؟

دو تین دن کے بعد اس پر واضح ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس دن بھی وہ کھڑکی کے پٹوں کو تھوڑا سا وا کیے درز میں سے اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔۔ وہ نوجوان چوکنا اور باخبر تھا۔ اسی لیے تو اس نے کاغذ کی ایک گولی سے

بنائی اور سب کی نظریں بچا کر کھڑکی میں پھینک دی۔ رخسانہ نے جلدی سے دونوں پٹ کھول دیئے۔ اور بے تابی سے کاغذ کی گولی اٹھالی۔

نوجوان امجد بڑے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔۔۔ آج اس نے دل پر ہاتھ رکھ کر اسے پیار کا سگنل بھی دیا۔

رخسانہ نے گولی کھولی اور مڑے تڑے کاغذ پر ایک تحریر رقم تھی۔ جن خوبصورت اور حسین الفاظ سے امجد نے اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ اس کے لیے انوکھے اور حیرت خیز تھے۔

تحریر پڑھ کر وہ اپنے آپ میں جیسے سما نہ پا رہی تھی۔ امجد نے اس کے سراپا کو قیامت خیز ٹھہرایا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک کو ستاروں سے تشبیہ دی تھی۔۔۔ اس کے ہونٹوں کو گلاب کی پنکھڑیاں کہا تھا۔

کیا وہ واقعی ایسی تھی؟

وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور جانے کیوں امجد کی تحریر کا ایک ایک لفظ اسے اپنے وجود، اپنی شخصیت کا آئینہ دار نظر آیا۔۔۔۔ وہ غرور اور تفاخر سے مسکرا اٹھی۔

دوسرے دن پھر کاغذی گولی کھڑکی میں آن گری۔

اس میں امجد نے اپنی بے تابیوں کا ذکر کیا تھا۔ ملنے کی استدعا کی تھی۔ اس کو ئی نہ کوئی راہ نکالنے کے لیے اکسایا تھا۔

رخسانہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو پھولتی جا رہی تھی۔۔۔ اوپر ہی اوپر اٹھتی چلی جا رہی تھی۔

اگلے دن پھر وہی استدعا لیے کاغذی گولی آئی۔

اس سے اگلے دن بھی۔۔۔

اب امجد کی بے تابیاں مجنونانہ رنگ اختیار کر رہی تھیں۔۔۔ ملنے کی تڑپ بڑھ رہی تھی۔۔۔۔ اس سے نہ

مل پایا تو ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔۔۔امجد نے یہ بھی لکھا تھا۔
اس کی قربت کی متمنی وہ بھی تھی۔۔۔۔اپنی بے کیف اور روکھی پھیکی زندگی میں رنگوں

اور خوشبوؤں کی بھرمار کرنے والے مہربان سے الگ تھلگ رہا بھی کیسے جا سکتا تھا۔۔۔
لیکن رخسانہ نہیں جانتی تھی کہ ملنے کی راہ کیوں کر نکالے۔
کئی گولیاں اصرار بن کر آچکی تھیں۔۔۔۔رخسانہ کا ذہن سوچ سوچ کر ماؤف ہو چکا تھا۔۔۔اس دن جو کاغذی گولی آئی۔اس میں امجد نے لکھا تھا۔"تم نے ملنے کی کوئی راہ نہ نکالی تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گا۔۔۔۔"
حربہ کارگر تھا۔۔۔رخسانہ گھبرا گئی۔۔۔اپنے محسن و مہربان کو مرنے کیوں کر دیتی۔۔۔کاغذ قلم لیا اور شکستہ سے عبارت لکھی۔
"میں گھر میں بالکل اکیلی ہوتی ہوں۔۔۔سمجھ نہیں پاتی۔تم سے کیسے ملوں۔"
گولی اس نے بھی امجد کی طرف پھینک دی۔۔۔امجد نے جھک کر قدموں میں گرنے والی کاغذی گولی اٹھائی۔
تڑامڑا کاغذ کھول کر پڑھا تو لب متبسم ہو گئے۔۔۔اسے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ رخسانہ گھر میں اکیلی ہوتی ہے۔۔۔۔۔
اس نے اسی وقت کاغذی پیغام لکھا۔"دوپہر کو دروازہ اندر سے کھلا رکھنا۔۔۔۔میں موقع پاتے ہی اندر آجاؤں گا۔۔فکر نہ کرنا۔سب کی نظریں بچا کر آؤں گا۔۔۔"
اس دن رخسانہ کی حالت دیدنی تھی۔۔۔۔خوشی اور گھبراہٹ نے مل جل کر اسے باؤلا بنا دیا تھا۔۔۔۔دوپہر اس نے دروازے کی کنڈی اندر سے نہیں چڑھائی۔۔۔الجھی الجھی، گھبرائی گھبرائی، بہکی بہکی صحن میں گھومتی پھری۔

اور جب دروازہ ہلکی سے چرچراہٹ سے کھل کر بند ہو گیا۔تو اس کا دل سینے میں اک لمحے کے لیے جامد سا ہو گیا۔۔۔پھٹی پھٹی آنکھوں سے وہ ڈیوڑھی سے صحن میں آنے والے امجد کو تکنے لگی۔۔۔امجد جو بالکل اجنبی تھا لیکن پھر بھی اپنا لگ رہا تھا۔
جھجھک اور گھبراہٹ امجد پر بھی طاری تھی۔اسی لیے ایک دم وہ صحن میں نہیں آیا۔۔۔دروازے ہی میں کھڑا رہا۔۔۔دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔مسکرائے اور

نگاہیں جھکا لیں۔۔۔۔
کئی لمحے گزر گئے تو امجد بولا۔"بیٹھنے کو نہیں کہو گی۔"
وہ ایک دم سے بولی۔"مجھے ڈر لگتا ہے۔۔۔۔۔"
"کس سے۔"
"پتہ نہیں کس سے۔۔۔۔تم واپس چلے جاؤ۔۔۔۔"
"کل آؤں۔۔۔۔"
"ہاں کل آجانا۔۔۔۔اس وقت واپس چلے جاؤ۔۔۔۔۔"
"کل بھی دروازہ کھلا رکھنا۔۔۔۔"
"اچھا۔۔۔۔"
امجد اس پر اک پیار بھری نگاہ ڈال کر مڑ گیا۔بیرونی دروازے کے پٹ ذرا سے کھولے۔کافی دیر گلی میں دیکھتا رہا۔۔۔۔پھر شاید میدان صاف دیکھا۔ایک دم دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔۔۔۔رخسانہ دوڑ کر گئی، دروازہ بند کر دیا اور پشت بند دروازے کے ساتھ ٹکا کر کتنی ہی دیر آنکھیں بند کیے غیر متوازن سانس لیتی رہی۔۔۔

دوسرے دن بھی چوروں کی طرح لوگوں کی نظروں سے بچتا امجد اندر آ گیا۔۔۔

آج وہ صحن میں آیا اور ایک پرانی کرسی پر بیٹھ گیا۔۔۔ رخسانہ سامنے والے کمرے کے دروازے میں کھڑی رہی۔

آج دونوں نے باتیں بھی کیں۔

امجد کو رخسانہ کے گھریلو حالات کا اندازہ دو تین ایسی ملاقاتوں ہی میں ہو گیا۔۔۔ گھاگ آدمی تھا۔ حالات کی ماری، محبت کی بھوکی اور تنہائی گزیدہ لڑکی کو رام کرنا مشکل کام تھوڑا ہی تھا۔۔۔ اس نے رخسانہ کی دکھتی رگ پکڑی۔

"میں تمہاری تنہائیاں بانٹ لوں گا رخی۔۔۔۔ تمہارے سارے دکھ اپنے اندر اتار لوں گا۔۔۔ تمھیں اکیلے پن کے کرب سے نجات دلاؤں گا۔۔۔۔"

"کون کہتا ہے تم بد صورت ہو۔ اپنے آپ کو میری آنکھوں سے دیکھو رخسانہ۔۔۔"

"تم اتنی پیاری، اتنی خوش اخلاق لڑکی ہو۔۔۔ تمھیں پا کر میں نے گویا دنیا کی سب سے بڑی دولت پا لی ہے۔"

"میں تم سے شادی کروں گا رخی۔۔۔ پھر ہم دونوں اپنا گھر بسائیں گے۔ چھوٹا سا پیارا سا گھر، جو جنتی رعنائیوں کا حامل ہو گا۔"

"میں تمھیں دکھوں کی اس دنیا سے دور لے جاؤں گا۔۔۔"

امجد شیشے میں اتارنے کے فن میں ماہر تھا۔ رخسانہ اس کے جال میں پھنستی چلی گئی۔۔۔۔

بھابھی کا ابا کچھ لمبا ہی بیمار پڑ گیا تھا۔۔۔ وہ مہینے بھر سے اپنے میکے ہی میں تھی۔ یہ وقت رخسانہ اور امجد کے لیے غنیمت تھا۔۔۔

اسی میں نظر بازی ہوئی۔ محبت نے جنم لیا۔ اور عشق پروان چڑھتے ہی مستقبل کے خاکے بنے۔۔۔ اک نئی دنیا بسانے کا ارمان جاگا۔ امجد اسے عشق کے مرحلہ وار سبق دینے لگا۔

رخسانہ خوش تھی۔۔۔ اتنی خوش کہ سمجھ نہ پاتی تھی۔ یہ خوشیاں کیسے سمیٹے۔۔۔

اس دن وہ امجد کی کرسی کی پشت پر جھکی، اس کے گلے میں بازو ڈالے کہہ رہی تھی۔ "امجد۔۔۔ بھابی آ گئی تو پھر کیا کریں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

امجد نے اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ "کب آ رہی ہے بھابی۔۔۔۔۔"

"پتہ نہیں کب آ جائے۔"

"پھر۔"

"تم ہی بتاؤ۔۔۔ وہ آ گئی تو میں کھڑکی تک سے تمھیں دیکھ نہ سکوں گی۔"

"ایسا نہ کہو رخی۔۔۔ میں تمہارے بغیر ایک دن بھی نہیں رہ سکوں گا۔"

"پھر کیا کریں؟"

"ہاں یہ سوچنا چاہئے۔"

دونوں سوچنے لگے۔

کئی دن سوچتے رہے۔ بالآخر سوچیں جس بات پر منتج ہوئیں، وہ فرار کی راہ تھی۔۔۔ امجد نے رخسانہ کو مستقبل کے ایسے سجیلے خواب دکھائے۔ اتنی بھرپور امیدیں دلائیں۔۔۔۔۔

اور پھر ان خوابوں اور امیدوں میں اتنا مان بھرا کہ رخسانہ اس کے ساتھ بھاگ جانے پر آمادہ ہو گئی۔ یوں بھی اس کی اس گھر اور گھر کے افراد سے کیا دلچسپی تھی۔۔۔ اک بے کار سی شے تھی، جو گھر میں پڑی رہتی تھی۔۔۔ نہ اس سے کسی کو پیار تھا، نہ ہی اسے کسی سے کوئی دلچسپی رہی تھی۔۔۔ بھائی بھابی اور بچے سبھی بے گانہ

تھے۔۔۔ جہاں جذبوں کا اظہار اور رابطے نہ رہیں، وہاں بے تعلقی کا احساس ہی جاگتا ہے۔

رخسانہ کو امجد نے پیار دیا تھا۔ محبت دی تھی۔ خواب دیئے تھے۔۔۔ امیدیں دی تھیں۔۔۔ اور اس سے بڑی بات کہ اس کے اندر خود رو کانٹوں کی طرح سے اگ آنے والی تنہائی کو ختم کر دیا تھا۔ پھر وہ اس کی بات کیسے نہ مانتی۔۔۔ جگ مگ کرتے مستقبل کو اندھا بنانے کے لیے کوئی سر پھرا ہی کوشاں ہو گا۔۔۔

دونوں کئی دن منصوبے بناتے رہے۔

پلان تیار کرتے رہے۔

بالآخرانہوں نے لائحہ عمل تیار کر ہی لیا۔۔۔ رخسانہ کو کیا کیا چیزیں گھر سے لینا تھیں۔۔۔ کیسے گھر سے نکلنا تھا۔۔۔ کہاں امجد نے انتظار کرنا تھا اور پھر دونوں نے مل کر کہاں جانا تھا۔۔ سب طے ہو گیا۔

جس رات رخسانہ نے گھر چھوڑنا تھا۔ اسی صبح بھابی اچانک ہی آگئی۔ بچوں کی سکول سے چھٹیاں زیادہ ہو گئی تھیں۔۔۔ ابا کی بیماری جانے کتنی طوالت پر محیط ہوتی۔ وہ اس ارادے سے آئی تھی کہ گڈو اور گڑیا رخسانہ کے پاس رہ جائیں تو انہیں یہیں چھوڑ کر واپس میکے آجائے اور اگر نہ رہ سکیں تو دونوں کی مزید چھٹیاں لے کر آجائے۔۔۔ ویسے بھی گھر بار دیکھنا تھا۔۔۔ بھابی کے آجانے سے رخسانہ کو کوئی فرق نہ پڑا۔۔۔ اس نے امجد کے ساتھ جو طے کیا تھا۔ پوری دل جمعی اور سکون سے اسی پر کاربند تھی۔

بھابی کے آجانے سے اتنا ضرور ہوا کہ اس کا زیور بھی رخسانہ کے ہاتھ لگ گیا اور زیور کے ساتھ بھائی کا دو ہزار روپیہ بھی۔۔۔

پلان کے مطابق رخسانہ نے قدم اٹھایا۔۔۔

اور

گھر سے فرار ہو گئی۔

اب گھر والے، عزیز رشتہ دار اور محلے والے لعن طعن کر رہے تھے۔۔۔ کوس رہے تھے۔۔۔ جو جی میں آرہا تھا کہہ رہے تھے۔۔۔ رخسانہ نے جو کچھ کیا تھا۔ کسی طور پر مستحسن نہیں تھا۔۔۔۔۔

لیکن

کیوں کیا تھا؟

کیا یہ بھی کوئی جانتا تھا۔۔۔ یا جاننے کی کوشش کر رہا تھا؟

بندھن

"اٹھیے سر، چائے حاظر ہے!" ایک مسحور آواز کانوں میں رس گھولتی اتر گئی۔

ڈبل بیڈ کے نرم و گداز بستر میں فوم کے تکیوں میں دھنسے وسیم ملک نے آنکھیں کھول دیں۔ شینو اپنے خوبصورت ہاتھ میں چائے کا کپ لیے ان پر جھکی تھی۔ اس کے حسین بدن کی مہک اور اس کی خوبصورت آنکھوں کا بولتا تبسم مدہوش کر دینے والا تھا۔ اس کے لبوں پر بڑی خوبصورت اور۔۔۔۔ حیات افروز مسکراہٹ پھیلی تھی۔

صبح انگڑائیاں لے کر بیدار ہو گئی تھی۔ پرندوں نے بسیرے چھوڑنا شروع کر دیئے تھے۔ بڑی خوش الحانی سے خدائے بزرگ و برتر کی حمد سرائی کر رہے تھے۔ دھندلکے چھٹ رہے تھے اور نرم ہوائیں مستانہ روی اختیار کیے تھیں۔ بیڈ روم کی پچھلی چوڑی کھڑکی کے آگے سے شینو نے پردہ سرکا دیا تھا۔ اور حد نگاہ تک پھیلا سبزہ اور گل رنگ سویرا لہراتا نظر آرہا تھا۔ پہاڑی کی آغوش میں بنے بنگلے کا یہ بیڈ روم مناظر کی دلفریبی کے لحاظ سے بڑی اہم جگہ پر تھا۔ یہ شینو ہی کا حسن انتخاب تھا۔ جو اس کمرے کو بیڈ روم بنالیا تھا۔ بیڈ روم کو سجایا بھی اس نے

اپنے ذوق نظر کی تسکین کرتے ہوئے کیا تھا۔اس بیڈروم میں داخل ہوتے ہی خوابوں کے کسی انجانے جزیرے کا احساس جاگ اٹھتا تھا۔نیند کی پریوں کے آنچل سرسراتے تھے۔اور ذہن کتنا بھی بوجھل کیوں نہ ہوتا۔افکار کتنے بھی پریشان کیوں نہ ہوتے۔بیڈروم میں آتے ہی کانوں میں لوریوں کا رس گھلنے لگتا۔

روز کی طرح آج بھی شینو کافرادائی سے چائے لائی تھی اور اپنی مخمور اور مسحور آواز میں شوخی سے وہی جملہ کہا تھا۔جو وہ روز کہتی تھی۔

"اٹھیئے سر،چائے حاضر ہے۔"

اس کا وسیم ملک پر جھکنے کا انداز بھی بڑا دلفریب اور توبہ شکن تھا۔وسیم ملک اک انگڑائی لے کر اٹھتے اور شینو بیڈ سے قدرے ہٹ کر مسکراتے ہوئے سائیڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کرتی۔

"چائے حاضر ہے۔جناب۔پی لیجئے۔ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

وسیم ملک پیالی اٹھا لیتے اور آنکھوں سے قریب آنے کا اشارہ کرتے۔کبھی تو وہ ہنستے ہوئے بات مان لیتی۔کبھی کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بیڈروم سے نکل جاتی۔

اور

جب ایسا ہوتا۔وسیم ملک چائے کا گھونٹ گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے سوچتے۔

"کیا شینو واقعی خوش ہے؟ یا خوش ہونے کی اداکاری کرتی ہے۔"

وسیم ملک کو خوش فہمی نہ ہوتی۔ہمیشہ اپنے سوال کے دوسرے حصے سے ہی اتفاق کرتے۔

اور پھر مایوس کن بے دردسی لہر ان کے اندر اٹھتی۔اور کانچ کا شیش محل ڈھیر ہو جاتا۔

آج بھی حسب معمول شینو ان کیلئے بیڈ ٹی لائی تھی۔وسیم ملک نے کئی بار کہا تھا۔"تین نوکر کس مرض کی دوا ہیں۔تم کیوں تکلیف کرتی ہو خود چائے بنانے کی۔"

وہ ہنس کر بڑے فخر وغرور سے کہتی۔۔۔"آپ کے لیے چائے بنا کر بڑی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔اور پھر یہ کوئی بڑا کام بھی تو نہیں۔ویسے بھی عادت پڑی ہوئی ہے۔جب سے ہوش سنبھالا۔امی کو بیڈ ٹی میں ہی بنا کر دیتی تھی۔"

اور

وسیم ملک کتنی کتنی دیر سوچتے رہتے۔وہ بجھ سے جاتے،انہیں یوں لگتا جیسے شینو خدمت کے جذبے سے ایسا کہتی ہے،ایسا کرتی ہے۔

خدمت اور محبت میں بہت فرق ہوتا ہے۔وہ ان باریکیوں میں الجھتے اور ذہنی سکون منتشر ہونے لگتا۔

کبھی کبھی تو ان کے من میں اتنی ہلچل مچتی کہ وہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرنے لگتے۔شینو سے شادی کر کے انہوں نے واقعی کوئی جرم کیا تھا؟

یہ سوال وہ کسی اور سے پوچھتے تو جواب بھی تسلی و تشفی کا باعث بنتا۔

لیکن

یہ سوال تو ہر ایسے موقع پر جب شینو چاہتی اور محبت کا بے پناہ اظہار کرتی،ان کے ذہن میں کلبلانے لگتا۔انہیں بے چین کر دیتا۔اور وسوسوں کو جگا دیتا۔

شینو سے انہوں نے چند ماہ ہوئے شادی کی تھی۔ان کی عمر اس وقت اکاون برس ہو چکی تھی۔۔۔اور شینو صرف تیئس سال کی تھی۔۔۔ حسین اور ہنس مکھ۔۔۔شادی کے بعد شوخی اور چنچل پن بھی نکھر آیا تھا۔اس کے قہقہے قلقل کرتے چشموں کی طرح بہنے لگے تھے۔اور اس کی ہنسی کی پھوار گھر کے سارے ماحول میں رچ بس رہی تھی۔

شادی کے فوراً بعد تو وہ ورلڈ ٹور پر نکل گئے تھے۔کیلیفورنیا اپنے بچوں کے پاس بھی گئے تھے۔دو تین مہینے تو

اس گھما گھمی میں گزر گئے تھے۔
لیکن جب سے وہ اپنے گھر واپس لوٹے تھے۔اور زندگی کے معمولات شروع ہوئے تھے۔انہیں وہم سا
ہونے لگا تھا کہ شینوان سے محبت اور چاہت کی اداکاری کرتی ہے۔
شاید اس کی وجہ اپنے بے تکلف دوستوں کی وقت بے وقت کہی ہوئی باتیں بھی ہوں۔
ریاض نے کہا تھا۔"شادی ضرور کر لیتے لیکن ذرا عمروں کا فرق بھی دیکھ لیتے۔"
عمر قدیر نے ہنس کر کہا تھا۔"مالدار آسامی ہو۔اس سے چھوٹی عمر کی لڑکی بھی مل سکتی تھی۔"

نصر اللہ تو بڑا بے باک تھا، بولا۔"خدا کرے نبھ جائے، امکانات بہت کم ہیں۔۔۔لڑکی ابھی جوانی کی طرف
بڑھ رہی ہے اور تمہارا بڑھاپا تم سے بغلگیر ہو رہا ہے۔لاکھ جواں بنو، حقیقت سے آنکھیں نہیں چرا سکتے۔"
شروع میں تو انہوں نے ان باتوں کی پروانہ کی تھی۔لیکن جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔یہ باتیں وسوسے بن
رہی تھیں۔۔۔ان وسوسوں کا کھل کر نہ سہی، دبے دبے لفظوں میں اظہار وہ شینو سے بھی کر چکے تھے۔
شینوان کی باتوں کو بے معنی کہتے ہوئے ہنس پڑتی تھی۔اس نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا تھا۔لیکن اس کے
باوجود دل کے کچھ حساس گوشے بڑے بے رحمانہ انداز میں انہیں احساس دلاتے رہتے تھے کہ یہ شادی انہیں
راس نہ آئے گی۔
یہ شادی
جو بالکل ڈرامائی انداز میں ہو گئی تھی۔

وسیم ملک ایک بہت بڑے بزنس کے مالک تھے۔ان کا دفتر ایک خوبصورت عمارت میں واقع تھا، دفتر کا عملہ
ملحقہ کمرے میں تھا۔جو بزنس کو کنٹرول کرتا تھا۔کلرک، ٹائپسٹ، اسٹینو اور کچھ دوسرے افراد تھے۔وسیم

ملک متوازن شخصیت کے بڑے حلیم، ملنسار اور بردبار قسم کے آدمی تھے۔عملے کے ساتھ ان کا سلوک
مشفقانہ اور سخت گیری نے مل کر دفتری توازن برقرار رکھا ہوا تھا۔کام خوش اسلوبی سے چل رہا تھا اور دولت
بہتی چلی آرہی تھی۔وسیم کی گھریلو زندگی ختم ہی ہو چکی تھی۔بیوی کا انتقال ہو گیا تھا۔دونوں بیٹے اسٹیٹس میں
تھے۔جہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمتیں کر رہے تھے۔وہیں دونوں نے شادیاں رچالی تھیں۔ایک
نے ایک اسپینش لڑکی سے شادی کی تھی۔دوسرے نے امریکہ میں مقیم پاکستانی لڑکی کو دلہن بنایا
تھا۔۔وسیم ملک معترض کیونکر ہوتے۔کچھ تو تھے بھی

روشن خیال، کچھ بیوی کے نہ ہونے سے دخل دینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ایک بیٹی تھی، جس کی شادی انہوں نے
اس کی اور اپنی ملی جلی مرضی سے کی تھی۔پچھلے سال وہ اس فرض سے بھی سبکدوش ہو گئے تھے۔تو زندگی کا
محور گھر کی بجائے دفتر ہی بن گیا تھا۔اپنے آپ کو انہوں نے دفتری ماحول میں مدغم کر لیا تھا۔گھر بسانے کا
کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ عمر میں اپنے سے اٹھائیس انتیس سالہ چھوٹی لڑکی کو زندگی کا ساتھی بنالیں گے۔

شینو چھ ماہ پہلے اس دفتر میں ملازم ہوئی تھی۔ملازمت اس کا شوق نہیں، ضرورت تھی جس کی خوشحالی کی
ضمانت نہیں ہوتی۔کئی سال پہلے اس نے بی اے کیا تھا تو ابو کی خواہش تھی کہ وہ ایم اے کر لے۔لیکن اس نے
داخلہ نہیں لیا۔
"کیا کروں گی ایم اے کر کے۔"اس نے کہا تھا۔
"کیا کرو گی گھر بیٹھ کر۔"اس کی امی نے پوچھا تھا تو وہ ہنس پڑی تھی۔
"گھر کا کام سیکھوں گی۔اچھے اچھے کھانے بنایا کروں گی۔نٹنگ سوئیٹنگ گھر کو ڈیکوریٹ کرنا۔۔۔"اس نے
ایک لمبی چوڑی فہرست گنوا دی تھی۔

اسے گھر داری کے بے حد شوق تھا لیکن امی جانتی تھیں کہ سفید پوشی کا بھرم رکھنے والوں کو رشتے ڈھونڈنے میں خاصا وقت لگتا ہے۔ بڑی دقت ہوتی ہے، اس لیے وہ چاہتی تھیں کہ گھر بیٹھنے کی بجائے وہ ایم اے کر لے اور ان دو سالوں میں وہ اس کے لیے دوڑ دھوپ کر کے موزوں رشتہ ڈھونڈ لیں۔

لیکن

اس نے داخلہ نہیں لیا۔

"بینا کو ایم اے کروالیں آپ کی خواہش پوری ہو جائے گی۔"

اس نے چھوٹی بہن، جو ان دنوں ایف اے میں تھی، کے متعلق کہا۔ ابو نے اپنی خواہش

دبالی اور شینو گھر بیٹھ گئی۔

امی اور ابو نے اپنے اپنے طور پر رشتے کی تلاش شروع کر دی۔ ابو نے اپنے ہر دوست سے کہا۔ امی نے ہر ملنے والی سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بیٹیاں خوبصورت تھیں۔ سلیقہ شعار تھیں، شائستہ تھیں اور تعلیم یافتہ تھیں۔

لیکن

انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ یہ ساری خوبیاں ایک سچائی سہی لیکن رشتہ حاصل کرنے کے لیے اصل سچائی پیسہ ہے۔ ان بچیوں کا پس منظر کسی کو سنہرا پن نظر نہ آیا۔ بات کسی اچھی جگہ بنتی نظر نہ آئی۔

پھر بھی مایوسی کی بات نہیں تھی۔ کوشش جاری تھی۔ خواہش تنومند تھی، پھر ابھی شینو کون سی ایسی بڑی ہو گئی تھی۔ کبھی نہ کبھی تو اچھا رشتہ ملے گا ہی۔

لیکن اچھا رشتہ ملنے کی خواہش دل میں لے کر ابو راہی ملک عدم ہو گئے۔ ان کی موت اتنی اچانک ہوئی کہ گھر کی بساط ہی الٹ گئی۔ کبھی سوچا تھا۔ نہ کبھی گمان کیا تھا کہ ایسا بھی ہو جائے گا۔ پر ہونی ہو گئی تھی، ہنستا بستا اپنی دنیا میں مگن یہ چھوٹا سا گھرانہ برباد ہو گیا تھا۔ دو بیٹیوں کا ساتھ اور سفید پوشی کا بھرم۔۔۔امی کے لیے

زندگی کی سب راتیں تاریک ہو گئیں۔۔۔ابو کی آمدنی اتنی تھی کہ چھوٹی سی فیملی کی گزر بسر سکون سے ہو رہی تھی۔ لیکن انہوں نے کوئی اثاثہ چھوڑا نہ جائیداد۔۔۔چھوٹا سا یہ گھر جس میں رہائش تھی، وہ بھی دادا کی وارثت میں ملا تھا۔ اس گھر کو ان لوگوں نے اپنے سلیقے اور ذوق نظر سے آرام دہ اور خوبصورت بنا لیا تھا۔ ماں بیٹیوں پر جو حادثہ گزرا۔ اس نے کچھ عرصے تو جیسے حواس ہی سلب کر لیے۔ زندگی سے بیزاری کا احساس پیدا ہو گیا۔ جیتے جی مر جانے کی تمنائیں جاگنے لگیں۔

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ زخم بھرے۔ حواس ٹھکانے پہ آئے اور زندگی کو ایک

حقیقت پایا تو سب نے حوصلہ باندھا۔۔ شینو نے انہی دنوں ملازمت کا سوچا۔

"میں ملازمت ڈھونڈوں گی امی۔"

امی دکھ سے تڑپ کر بولیں۔ "کہاں ملے گی ملازمت۔"

"ڈھونڈلوں گی۔"

چار چھ ماہ وہ ملازمت کے لیے سرگرداں رہی۔ اس دوران اس نے ٹائپنگ سیکھ لی تھی۔

اس کی کوششیں بار آور ہوئیں اور اسے وسیم ملک کے آفس میں جگہ مل گئی۔ آٹھ دس مردوں میں وہ تنہا لڑکی تھی۔ لیکن اسے صرف اپنے کام سے کام تھا۔ دوسرے یہاں ڈسپلن اچھا تھا۔ اس لیے وہ سکون سے نوکری کرنے لگی۔

تنخواہ زیادہ نہ سہی، معقول ضرور تھی۔ چھوٹے سے کنبے کا گزارہ بخوبی ہونے لگا۔

امی نے بیماری کا روگ تو ابو کے مرنے پر ہی پال لیا تھا۔ لیکن اندر ہی اندر اسے چھپائے بچیوں کے سنگ شاہرہ حیات پر چل رہی تھیں، کبھی کوئی دوائی کھالی۔ کبھی کسی ڈاکٹر کو دکھالیا۔ بس یہی کر رہی تھیں۔

لیکن

ایکا ایکی مرض کا شدید حملہ ہوا۔ شینو اور بینا نے۔۔۔ تیمارداری اور جانثاری میں مثال قائم کر دی۔ علاج معالجے میں کسر نہ اٹھا رکھی۔ گھر پہ علاج تسلی سے نہ ہو سکتا تھا۔ اس لیے انہیں ہسپتال ایڈمٹ کروانا پڑا۔

اس دن شینو بے حد پریشان تھی۔ ہر دوسرے تیسرے دن چھٹی لینا پڑتی۔

اکثر آفس ٹائم پر نہ پہنچتی، عملے کے لوگوں کو پتا تھا کہ اس کی ماں بیمار ہے اور سارا بوجھ اسی کے کندھوں پر ہے۔ اس لیے اس کی شکایت کبھی نہ کرتے۔ چھٹی بھی کئی دفعہ ظاہر

نہ کرتے۔۔ شینو کا واسطہ انہی لوگوں سے پڑتا تھا۔ اس لیے وہ ممنون احساس بھی انہی لوگوں کی تھی، وسیم ملک کو تو کبھی کبھی دیکھتی تھی۔۔۔۔۔۔ جب وہ ہال سے گزر کر دوسری طرف جاتے یا کبھی ان کے آفس میں فائل لے جانا پڑتی۔ ان سے براہ راست گفتگو کا موقعہ بھی نہ ملنے کے برابر تھا۔ ہاں باس کا رعب اس پر بہت تھا۔ دوسرے لوگوں سے وسیم ملک کی سخت گیری کی باتیں سن سن کر وہ مرعوب ہو گئی تھی۔

"میری امی بہت بیمار ہیں۔ دو ہفتے کی چھٹی لینی ہے میں نے۔" اس دن اس نے دفتر کے عملے کے سینئر آدمی اشفاق سے کہا۔

"پھر تو سر سے بات کرنا پڑے گی۔ دو ہفتے کی چھٹی ہم لوگ تو نہیں دے سکتے نا۔"

"آپ کریں نا ان سے بات۔"

"میں نہیں بھئی، کل سے ان کا موڈ بہت بگڑا ہوا ہے۔"

"پلیز!"

"نہیں بھئی۔ تم خود ان سے کہو، درخواست لکھ دو۔"

"درخواست لکھی ہوئی ہے، آپ اپروو کروا دیں۔"

"شاہد سے کہو۔"

"نہ بھئی۔ سر چھٹی کے معاملے میں رعائت نہیں دیتے۔"

"تم خود چلی جاؤ ان کے پاس۔ سارے حالات بتا دینا، چھٹی منظور کر لیں گے۔"

شینو مایوس ہو گئی۔

لیکن

دوسرے دن امی کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی۔ دو ہفتے چھوڑ اسے تو پورے مہینے کی چھٹی کی ضرورت تھی۔

آج وہ دفتر چھٹی لینے کے لیے آئی چھٹی نہ ملی تو وہ دفتر کو چھٹی دینے کے موڈ میں تھی۔

آج بھی اس نے اشفاق سے درخواست وسیم ملک تک پہنچانے کو کہا۔ اس نے حسب معمول ٹال مٹول کی۔ تو وہ اپنی درخواست اک جھٹکے سے اٹھا کر وسیم ملک کے دفتر کی طرف بڑھ گئی۔

"اندر آ سکتی ہوں سر۔" اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔

وسیم ملک اپنی نرم و گداز ریوالونگ چیئر میں بیٹھے تھے۔ فان اور براؤن کومبی نیشن میں بہت ہی پروقار لگ رہے تھے۔ چہرے پر سنجیدگی اور متانت تھی۔ کھچڑی بال سلیقے سے جمے تھے۔ پائپ ایش ٹرے میں پڑا دھیرے دھیرے سلگ رہا تھا۔ ان کے رعب و دبدبے کا احساس ہوتے ہی شینو کا دل دھڑکا۔ لیکن چھٹی لینا تھی۔

وسیم ملک نے اس کی طرف دیکھے بنا۔ "یس" کہا وہ اندر آ گئی۔

فون کرتے کرتے وسیم ملک کی نگاہ اس پر پڑی۔ شاید وہ اسے پہچان نہ سکے۔

ہاتھ کے اشارے سے کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

وہ گھبرائی گھبرائی ان کے عین سامنے میز کے دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

بات ختم ہو گئی تو وسیم ملک نے فون رکھ دیا۔ انٹر کام پر ہیڈ کلرک سے کوئی بات کی۔ پھر میز پر جھکتے ہوئے شینو کی طرف دیکھا۔

"آپ مس شہنہ وحید۔۔۔۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

"جی۔۔۔ سر مجھے چھٹی چاہیے۔۔۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"چھٹی؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔ معلوم ہوا ہے آپ پہلے بھی ہفتے میں دو ایک چھٹیاں کر رہی ہیں۔۔۔"

"سر میری امی بہت بیمار ہیں۔ وہ ہسپتال۔۔۔۔" اس کی آواز رندھ گئی۔

وسیم ملک نے بغور اسے دیکھا۔

"مجھے ہی ان کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے سر اور کوئی۔۔۔"

"اور کوئی نہیں۔۔۔۔"

"نہیں سر۔ ہم دونوں بہنیں ہیں یا ہماری امی۔"

"والد۔۔۔"

"فوت ہو چکے ہیں!"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شینو کا دل بھر آیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں؟ وہ بے اختیارانہ رو دی۔

اور

شاید یہی وہ نازک لمحہ تھا۔ یہی فیصلہ کن مرحلہ تھا۔ یہی رہنمائی کا وقت تھا۔ خوبصورت جھملاتی آنکھیں وسیم ملک کے دل پر اثر کر گئیں۔

انہوں نے شینو کی چھٹی منظور کر لی۔

"تھینک یو سر، تھینک یو ویری مچ۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے احسان مندی سے جھکتے ہوئے بولی۔

وہ اٹھنے کو تھی کہ وسیم ملک نے پوچھا۔ "اگر آپ کو ایڈوانس کی ضرورت پڑے۔ تو۔۔۔۔"

اس کی آنکھیں پھر سے برسنے لگیں۔

وسیم ملک گاڑی ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں پارک کر کے باہر نکلے اور برآمدے کی طرف آئے۔ شاید ان کا کوئی عزیز بیمار تھا۔ وہ طویل برآمدے کی گولائی مڑ رہے تھے کہ ان کو شینو نظر آئی۔ وہ تیسرے کمرے کے بغلی برآمدے سے ادھر آ رہی تھی۔

سر کو دیکھتے ہی اس نے احتراماً سر خم کر کے سلام کیا۔

وسیم ملک قریب آئے۔

"سر آپ کیسے؟" اس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"ایک عزیز کو دیکھنے آیا ہوں۔۔۔" انہوں نے شاید بے خیالی ہی میں اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔ شینو کے گالوں پر سرخی لہرا گئی۔

"آپ کی امی کیسی ہیں؟"

"کچھ بہتر ہیں اب۔۔۔۔"

"چھٹی بڑھانا پڑے گی؟"

"نہیں سر۔۔۔۔ میں انشااللہ دفتر حاضر ہو جاؤں گی۔"

"میں آپ کی امی کو دیکھ سکتا ہوں۔"

شینو کا دل خوشی سے پھول سا گیا۔ جلدی سے بولی۔ "کیوں نہیں سر، آپ کی نوازش ہے۔ امی خوشی ہوں گی۔"

وہ انہیں ساتھ لے کر اس وراڈ کی طرف آئی، جس کے بیڈ نمبر سات پر اس کی امی لیٹی تھیں۔

شینو نے وسیم ملک اور امی کا تعارف کروایا۔۔۔ پر وقار لیکن نحیف سی عورت نے بڑی شائستگی سے ان کا خیر مقدم کیا۔

وہ چند منٹ وہاں ٹھہرے، پھر باہر آ گئے۔ شینو بھی ان کے ساتھ آئی۔

"وارڈ میں آپ کی امی ڈسٹرب ہوتی ہوں گی۔" وسیم ملک نے کہا۔

شینو بجھ سی گئی۔ آہستگی سے بولی۔ "سر کمرہ لینا ہم لوگ افورڈ نہیں کر سکتے۔۔۔۔"

"آپ نے مجھ سے ذکر کیا ہوتا۔" وہ بولے۔ شینو نے پوری آنکھیں کھول کر انہیں دیکھا۔

وہ جلدی سے بولی۔ "میں آپ کے لیے کمرے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔۔۔"

"تھینک یو سر۔۔۔"

"دن رات آپ ہی ان کے پاس ہوتی ہیں؟"

"جی میں اور میری چھوٹی بہن بینا۔ ہم دونوں رات یہیں ہوتی ہیں۔۔۔"

وسیم ملک کچھ متفکر سے نظر آئے۔

"ابھی ایڈمٹ رہیں گی آپ کی امی۔"

"جی۔۔۔ شاید دو ہفتے اور رہیں، یہاں ویسے وہ روبصحت ہو رہی ہیں۔"

"ہوں۔"

وہ برآمدے کے گھماؤ تک ان کے ساتھ آئی۔۔۔ جاتے جاتے وسیم ملک نے کہا۔ "میں ان کے لیے الگ کمرے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

شینو کوئی جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ وہ قدم اٹھاتے دوسری طرف چلے گئے۔

اسی شام امی کو دوسرے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ اور شینو کو یہ جان کر حیرانی ہوئی اور مسرت بھی کہ سارے اخراجات وسیم ملک نے دینا منظور کیے تھے۔

وسیم ملک دوسرے ہفتے بھی شینو کی امی کو دیکھنے گئے۔ شینو کے لیے یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔ وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ اس نے بینا سے کہا۔ "کتنے مشفق اور مہربان ہیں سر۔"

بینا نے مسکراہٹ دبا کر کہا۔ "ضرورت سے زیادہ ہی۔"

"کیا مطلب۔" وہ حیرانگی سے بولی۔

بینا سمجھدار اور باصلاحیت لڑکی تھی۔ ویسے بھی چھٹی حس بہت تیز تھی، حالات کو پیشگی سونگھ لیتی تھی۔ شینو کی بات کا جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا۔ "یہ آپ کے سر جو ہیں۔۔۔۔ شادی شدہ ہیں۔۔۔؟"

"کیوں؟"

"یونہی پوچھا ہے۔"

"بال کھچڑی ہو چکے ہیں۔ عمر بھی پچاس سے تجاوز ہو گی۔ پھر اتنے امیر کبیر، ظاہر ہے شادی کی ہی ہو گی۔"

"ہوں۔"

"تمہارا مطلب کیا ہے؟"

"کچھ نہیں، یونہی پوچھا تھا۔ آپ کے سر انٹرسٹڈ لگتے ہیں آپ میں۔"

"بکواس۔۔۔۔ تجھے کیا سوجھی۔"

بینا ہنس پڑی۔

لیکن اسے سوجھی غلط نہ تھی۔ سر کی مہربانیاں اور نوازشیں بڑھ رہی تھیں۔ امی کے علاج کا سارا اخرچہ انہوں نے برداشت کیا تھا۔ شینو کو پے کا ایڈوانس بھی دیا تھا۔۔۔۔ اور جب امی ہسپتال سے گھر آئی تھیں تو وہ احوال پرسی کو گھر بھی آئے تھے۔

امی بے چاری سادہ سی عورت تھیں۔ ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پوچھ بیٹھی تھیں۔

"اپنی بیگم صاحبہ سے بھی متعارف کروایئے نا۔۔ انہیں بھی ساتھ لاتے ہمارے غریب خانے پر، ہمیں بے حد خوشی ہوتی۔۔۔۔۔"

اسی دن شینو کو سر کے گھریلو حالات کا علم ہوا تھا۔ وسیم ملک نے اس کی امی کو مختصراً اپنے اہل خانہ کے متعلق بتایا تھا۔

بینا کو بھی پتہ چلا۔ وہ کچن میں شینو کے ساتھ چائے کے لوازمات تیار کر رہی تھی۔ ہولے ہولے مسکرائے جا رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" شینو نے اس کی دبی دبی مسکراہٹوں کے پیچھے خوشی دیکھی تو پوچھا۔

"تمھارا سر رنڈوے ہیں۔"

"ہاں۔ مجھے آج ہی پتہ چلا ہے۔۔۔۔ بیچارے۔"

بینا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔۔۔۔ "بیچارے؟"

"ہاں تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

"مجھے لگتا ہے۔ دوسری شادی کے چکر میں ہیں۔"

"کوئی گناہ والی بات ہے۔ اکیلے ہیں بالکل۔ شادی کر بھی لیں تو کیا حرج ہے۔۔۔۔"

"کوئی ادھیڑ عمر عورت دیکھ کر جلدی سے ان کی شادی کروا دینی چاہئے ورنہ۔۔۔۔"

"ورنہ کیا ہوگا؟"

"مجھے لگتا ہے ان کی نظریں آپ پر ہیں۔"

"پھر وہی بکواس۔"

شینو نے بینا کے سر پر ہولے سے تھپڑ مارا۔۔۔۔ وہ ہنس پڑی۔

وسیم ملک بڑے دن سوچتے رہے۔ بات جچتی نہیں تھی لیکن دل کے تقاضے بڑھتے جا رہے تھے۔ ان تقاضوں پر کبھی غصہ آتا، کبھی ہنسی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیتے، عمروں کا فرق سچائی تھا۔

اسی لیے تو بات کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ شینو کے حالات سے آگہی تھی۔۔۔ لیکن وہ اس کی مجبوری سے بھی فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے تھے۔ تذبذب اور ادھیڑ بن میں کئی دن گزر گئے۔۔۔۔۔

پھر

انہوں نے اس معاملے میں شینو ہی سے بات کرنے کا سوچا۔ وہ باشعور لڑکی تھی۔ سوچ سمجھ کر قبول یا رد کر سکتی تھی۔

شینو نے اب پھر دفتر آنا شروع کر دیا تھا۔ وسیم ملک نے اسے اپنے

کمرے میں بلا بھیجا۔۔۔

"سر آپ نے بلایا ہے۔" وہ اب اعتماد اور جرأت مندی سے ان سے بات کرتی تھی۔

"ہاں۔" پائپ کا کش لے کر وہ ریوالونگ چیئر پر ہولے سے ادھر ادھر ہوتے ہوئے بولے۔

"جی فرمایئے۔"

وہ چند لمحے چپ رہے۔ پھر آہستگی سے بولے۔ "آج آپ کچھ وقت دے سکتی ہیں۔۔۔"

"جی۔۔۔ سر میں سمجھی نہیں۔۔۔"

"میں اگر آپ کو چائے کی آفر دوں تو۔۔۔"

"سر۔۔۔۔آپ۔۔۔"

"مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔"

"مجھ سے؟"

"ہاں۔۔۔۔آپ سے۔۔۔۔"

"تو، تو کیجیے سر۔۔۔"

"یہاں نہیں۔۔۔ شام چائے پر۔۔۔۔۔۔ کسی ریسٹورانٹ میں آرام سے بیٹھ کر۔۔۔۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"گھبرایئے نہیں۔۔۔۔"

"میں امی سے پوچھے بغیر کہیں نہیں جاسکتی سر۔"

"خوشی کی بات ہے۔۔۔ ٹھیک ہے آج امی سے پوچھ لیجیۓ گا۔ کل سہی۔"

وہ سر جھکا کر سوچ میں پڑ گئی۔

خبر دھماکہ خیز تھی۔ بینا کو تو جیسے پہلے ہی پتہ تھا۔ وہ تو امی سے لڑ پڑی۔

"امی آپ سوچیں تو سہی۔"

"کیا سوچوں؟"

"یہ بات موزوں ہے؟"

"سوچنے کی مہلت اسی لیے تو مانگی ہے۔"

"اس کی ضرورت کیا تھی۔ صاف انکار کر دیا ہوتا۔"

"شینو۔۔۔۔"

"ان کا تو دماغ ٹھکانے نہیں۔۔۔۔"

"لیکن سوچتی ٹھیک ہی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے آپ بھی حامی ہیں۔ غضب خدا کا، اف امی سوچیں تو سہی۔ شینو اور وسیم ملک صاحب کا کیا جوڑ ہے۔۔۔۔۔۔"

"شینو نے تو خاموشی سے رضامندی دے دی ہے۔ تم اتنا شور کیوں مچا رہی ہو۔ کچھ دن مجھے سوچنے دو۔۔۔ پھر دیکھیں گے۔۔۔"

بینا کا ماں پر بس نہیں چلا تو شینو کے پاس آئی۔ وہ اپنے بستر میں گھسی تھی۔ بینا نے ایک جھٹکے سے اس کا کمبل کھینچا۔ شینو محجوب سے مسکراہٹ لبوں میں دبائے تھی۔

"بہت خوش ہیں؟" بینا جھلائی۔

"تمہارا کیا خیال ہے خوش ہونا چاہیے یا نہیں۔۔۔۔۔"

"میرا جی چاہتا ہے اپنا منہ نوچ لوں۔"

"کیوں؟"

"آپ کے دماغ پر پردہ جو پڑ گیا ہے۔ وسیم ملک کی دولت لبھا گئی ہے؟"

شینو ایک دم سنجیدہ ہو کر بستر میں اٹھ بیٹھی۔ بینا منہ بنائے پائنتی کی طرف

بیٹھ گئی۔

چند لمحے شینو اپنی نرم و گداز خوبصورت انگلیوں کو مسلتی رہی، پھر ٹھوس لہجے میں بولی۔

"بہت غصہ آرہا ہے تمھیں۔ اس لیے صحیح اندازہ میں سوچ نہیں سکتیں۔ غصے میں آنے کی کیا بات ہے۔ ایک پروپوزل ہے، جسے منظور بھی کیا جا سکتا ہے رد بھی۔۔۔"

"لیکن رد کرانے کا سوال تو اس وقت پیدا ہوتا، جو منظور نہ کیا گیا ہو۔ آپ تو اپنی رضامندی کا اظہار بھی کر چکی ہیں۔۔۔"

"چلو یہی سہی۔۔۔ پھر۔۔۔۔ حرج کیا ہے۔"

"کچھ حرج نہیں۔ آپ جانتی ہیں وسیم ملک کی عمر کتنی ہے؟"

"عمر کے علاوہ اور کوئی اعتراض۔۔۔ یعنی شرافت، لیاقت و دولت عزت؟"

"شینو۔۔۔ آپ بھی۔ آپ بھی عام لڑکیوں کی طرح صرف اور صرف دولت کے لیے اتنا بڑا قدم اٹھائیں گی۔ اف میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔۔۔"

شینو ہنسی۔ "تمھیں کس نے یقین دلایا ہے کہ میں صرف دولت کے لیے۔۔۔۔۔۔"

"تو اور۔۔۔" بینا نے بات کاٹی۔

وہ غصہ میں بہت کچھ کہتی رہی۔ جسے شینو نے بڑے اطمینان سے سنا۔ جب وہ چپ ہوئی تو شینو نے انتہائی

متانت اور سنجیدگی سے کہا۔ "بینا شادی ایک فطری سی خواہش بھی ہے اور معاشرتی فرض بھی۔ امی کے ذہن پر جتنا بوجھ ہے، اس کا مجھے علم و احساس ہے۔ سو شادی لازمی ہے۔ اب یہ کہ وسیم ملک سے نہ ہو۔۔۔۔۔ تو پھر کس سے ہو۔ میری بہن۔۔۔۔۔ میں نے یونہی یہ رشتہ منظور نہیں کیا۔ سوچو تو اب تک کتنے امیدوار آئے ہیں۔ کتنے ہاتھ بڑھے ہیں ہماری طرف، جو کام کا رشتہ آیا وہ میں ریجیکٹ کر گیا کہ ہمارے پاس سنہری پس منظر نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ سوچو نا۔۔۔ کیا خامی ہے ہم میں۔ خوبصورت شاید ہیں، خاندان شریف ہے۔ پڑھی ہیں۔ لوگ سلیقہ شعاری اور شائستگی کی تعریف کرتے ہیں۔ اس کے باوجود میں

تئیس سال کی ہو رہی ہوں۔ تم بیس کی ہو چکی ہو۔ بتاؤ کون آیا؟ ایک خامی ہے نا دولت نہ ہونے کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

بینا چپ رہی۔

"یہ خامی تو اتنی بڑی ہے کہ۔۔۔۔۔"

"چھوڑو نا بینا۔۔۔۔ ہر طرف سے مکمل شخصیت ملنے کی خوش فہمی کے ہم لوگ متحمل نہیں ہو سکتے۔۔۔۔"

"کیا آپ سمجھتی ہیں کہ آپ ایڈجسٹ کر لیں گی۔"

"کیوں نہیں۔ جب میرے اتنے بار بٹ جائیں گے، مجھے سہارا مل جائے گا، تمہارے اور امی کے تحفظ کی ضمانت مل جائے گی تو پھر ایڈجسٹ کرنے میں کیا دشواری ہے۔"

"کہیں پچھتانا نہ پڑے۔"

"ہونہہ۔۔۔" وہ طنز سے ہنسی۔۔۔ "پچھتانا تو اس صورت میں ہوتا ہے جب اس سے بہتر کی امید ہو۔۔۔۔"

"آپ کی مرضی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔"

شینو ہنس پڑی۔ پھر شوخی سے بولی۔ "انہوں نے میرا ہاتھ مانگا، خدا کی قسم اگر تمہاری بات کرتے تو میں زبردستی تمھیں ان کے پلے سے باندھ دیتی۔۔۔۔۔۔۔۔"

بینا نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔ شینو ہنس پڑی۔

بینا یہی سمجھی تھی کہ شینو اپنا آپ قربان کر رہی ہے۔ امی کا بار ہلکا کرنے کو اور اسے امی کو تحفظ دینے کو۔

لیکن

شینو ذہنی اور دماغی طور پر اپنے آپ کو تیار کر چکی تھی۔ عمروں کا تفاوت اک

سچائی تھی، جسے اس نے تسلیم کر لیا تھا بلکہ اس نے تو اپنے انوکھے اصول ہی وضع کر لیے تھے۔ محبت، خدمت اور اطاعت یہ ایسی چیزیں تھیں جس سے ازدواجی زندگی کو کامیاب و کامران بنایا جا سکتا تھا۔ شادی کی کامیابی کے لیے محبت ایک ضروری عنصر ہے۔ محبت ضروری تو نہیں صرف نوجوان آدمی سے کی جائے، اس کا محور وسیم ملک جیسا ادھیڑ عمر آدمی کیوں نہیں ہو سکتا؟ محبت کسی چیز سے بھی کی جا سکتی ہے۔ کسی وجود سے، کسی شے سے، کسی نظریئے، کسی اصول، کسی ضابطے، غرضیکہ کسی سے بھی کی جا سکتی ہے۔ جب یہ کینوس اتنا وسیع ہے تو پھر تردد کی کیا بات تھی۔

شادی سادگی سے ہوئی۔

شینو اپنی رضامندی سے وسیم ملک کی شریک حیات بن کر اس کی سونی اور ویران زندگی میں بہار کا جھونکا بن کر آگئی۔ اس نے وسیم ملک کی شخصیت میں ایک مضبوط سہارے اور اک ٹوٹ کر چاہنے والے شوہر کو دیکھا۔۔۔۔ وہ بہت خوش تھی۔

خوش وسیم ملک بھی بہت تھے۔ شینو جیسی حسین بیوی اس عمر میں مل جائے، یہ خوش قسمتی ہی تو تھی۔ وہ صرف حسین ہی نہ تھی، جوان تھی، سلیقہ شعار تھی، شائستہ اور مہذب بھی تھی۔ خدمت گزار اور اطاعت شعار بھی۔۔۔۔ اور سب سے بڑی یہ بات تھی کہ اس شادی سے وہ خوش بھی تھی۔

گھوم پھر کر جب دونوں واپس آئے تو اک سگھڑ عورت کی طرح شینو نے گھر بار کا نظام سنبھال لیا۔ اس کے آرٹسٹک سے ذہن میں بڑے خوبصورت آئیڈیاز تھے۔ جنہیں تکمیل کے مراحل تک پہنچنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ لیکن اب اس کا اپنا گھر تھا، آسودگی تھی، وہ اپنے ذوق کی تسکین کے لیے جو چاہتی تھی کر سکتی تھی۔ اس نے اپنا گھر نئے سرے اور نئی ترتیب سے آراستہ کیا۔ کام میں مگن اور اس کی لگن دیکھ کر وسیم ملک بہت خوش اور

مطمئن ہوتے۔

لیکن

کبھی کبھی اک دھڑکا، اک وسوسہ جاگ اٹھتا۔ دبے دبے لفظوں میں وہ ذکر شینو سے بھی کرتے، کبھی وہ کھلکھلا کر ہنس پڑتی۔۔۔۔ کبھی شوخی سے چھیڑتی۔ "واقعی سر آپ ٹھیک سوچتے ہیں۔"

وہ جب شوخی کے موڈ میں ہوتی، اسے سر کہہ کر ہی پکارتی۔ اس کا انداز اتنی اپنائیت لیے ہوتا۔۔۔ کہ وسیم ملک پرسکون ہو جاتے۔ اس دن بھی وسیم ملک نے کچھ موہوم سے وسوسوں کا اظہار کیا۔

شینو کو غصہ آگیا۔ وہ ان کی تسلی و تشفی کئی بار کرا چکی تھی۔ وسیم ملک اس غصے پر ہنس پڑے، پھر بے چارگی سے بولے۔ "شینو میں کیا کروں، کبھی کبھی وہم سے ہونے لگتا ہے۔ کہ میں نے تم سے شادی کر کے تم پر ظلم کیا ہے۔"

شینو کو بھی ہنسی آ گئی۔ وہ بولی۔ "سر آپ کی سوچ کا انداز تعمیری نہیں ہو سکتا۔۔۔"

وہ مسکرانے لگے۔ شینو سنجیدگی سے بولی۔ "آپ کا بار بار اس طرح کہنا اچھا نہیں لگتا۔ خواہ مخواہ کی پریشانی مول لے لیتے ہیں آپ، جب میں خوش ہوں تو پھر آپ کو تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سوچ کے انداز بدلنے کی ضرورت ہے سر اور بس۔۔۔۔۔"

"شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔"

"شاید نہیں یقیناً۔" اس نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ پھر بڑی سنجیدگی سے اس نے جیسے بینا کو قائل کیا تھا، انہیں بھی قائل کرنے لگی۔ "حساب برابر کا ہے۔" وہ لمبی چوڑی تقریر کے بعد بولی۔

"کیسے؟" وسیم ملک نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

"ایک خامی میری، ایک آپ کی، حساب برابر ہے۔" وہ ہنسی۔

"مطلب؟"

اس نے مطلب سمجھایا تو وہ ہنس پڑے۔ شینو نے والہانہ شگفتگی سے اپنا آپ ان کے بازوؤں میں چھوڑ دیا۔

بڑی مدت کے بعد وسیم ملک کا دوست اس دن جب وہ اور شینو شاپنگ کے لیے ایک سٹور میں داخل ہو رہے تھے، مل گیا۔

"وسیم۔" وہ انہیں دیکھتے ہی جیسے ٹوٹ پڑا۔

وسیم نے بھی پرانے دوست کو دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔ دونوں لپٹ گئے۔

"کہاں غائب رہے اتنی مدت۔" وسیم ملک نے اس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مڈل ایسٹ۔۔۔ اسی ہفتے آیا ہوں، ملاقات ہو گئی۔ سناؤ کیا حال چال ہے۔۔۔۔ کیسے ہو۔۔۔۔۔"

"تم سناؤ۔۔۔۔۔"

لیکن کچھ سنانے سے پہلے ہی اس کی نظر شینو پر پڑی۔ بے اختیارانہ گرمجوشی سے اس کی طرف بڑھتے ہوئے پیار سے اس کے سر پر تھپکی لگاتے ہوئے بولا۔۔۔ "ارے تم نے اس کی بھی شادی کر دی۔"

شینو نے زیور پہنا ہوا تھا اور میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔۔۔ وہ سمجھا یہ وسیم کی شادی شدہ بیٹی ہے۔ وسیم ملک اس کی غلط فہمی پر گھبرا کر جلدی سے بولے۔ "یہ ریما نہیں ہے۔"

"تو۔۔۔۔۔۔ تو کون ہے؟"

"تمہاری بھابی۔"

"یعنی تمہاری۔"

"بیوی۔"

"اوہ۔۔۔۔"

وہ ہکلا گیا۔۔۔ مبارک بھی نہ دے سکتا تھا، وہ تو اسے ریما سمجھا تھا۔

وسیم ملک نادم نادم نظر آنے لگے تو شینو نے مسکراتے ہوئے خود ہی اپنا تعارف کروایا۔۔۔ ہنس ہنس کر باتیں کیں اور اسے گھر آنے کی دعوت بھی دے دی۔

گھر آ کر آج پھر اسے وسیم ملک کا اعتماد بحال کرنے کے لیے خاصے جتن کرنے پڑے۔

"السلام علیکم انکل۔" بڑا زوردار سلام مارنے کے بعد وہ وسیم ملک کی طرف بڑھا۔

شینو لاؤنج میں بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکی کے سامنے سے پردے ہٹا رہی تھی۔ وسیم ملک صوفے پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔ آج چھٹی تھی، دونوں دیر سے جاگے تھے اور ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوئے تھے۔

شینو نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک اونچے قد کا اسمارٹ نوجوان براؤن جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔۔۔۔ وہ بڑا وجیہہ نظر آرہا تھا۔

وسیم ملک نے زوردار سلام پر چونک کر دیکھا، پھر اخبار ایک طرف ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

سلام کا جواب دیتے ہوئے وہ نوجوان سے بغلگیر ہو گئے۔

"تم کب آئے؟"

"دو دن ہوئے ہیں۔۔۔ یہاں آیا تھا، سوچا آپ کو سلام کرتا جاؤں۔"

"جیتے رہے۔۔ جیتے رہو۔۔۔۔۔۔ آؤ بیٹھو۔"

صوفے پر وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔۔۔ شینو پردہ چھوڑ کر آہستہ آہستہ چلتی ادھر آگئی۔

نوجوان نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ وہ جان نہ پایا کہ وہ کون ہے، اس کی آنکھوں میں

نجان پن دیکھ کر شینو دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "جان پہچان نہ بھی ہو۔۔۔۔ سلام تو کرنا چاہئے نا۔۔۔"

"اوہ۔۔۔۔۔۔" وہ شرمندہ ہو کر ہنسا۔ "آپ کی تعریف۔۔۔۔"

"مسز وسیم ملک۔" شینو بڑے ہوشربا انداز میں مسکرائی۔ نوجوان ہڑبڑا سا گیا۔ جلدی سے اٹھا اور جھکتے ہوئے بولا۔ "معاف کیجئے گا۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔"

وہ بڑے دلفریب انداز میں ہنس دی۔

"دراصل۔۔۔۔۔۔۔ انکل نے بھی۔۔۔ تعارف نہیں۔" وہ بات نہ کر پا رہا تھا۔۔۔ انکل کی شادی کا اس نے سنا تھا۔ لیکن یہ نہ پتا تھا کہ اتنی حسین اور دلکش لڑکی ان کی زوجیت میں آچکی ہے۔

"تشریف رکھیے۔" وہ صوفے کی طرف بازو پھیلا کر ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"بیٹھو۔" شینو نے بڑے پروقار انداز میں کہا اور خود سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اور اس سے باتیں کرنے لگی۔

آصف عباس ابھی تک اپنے آپ کو باور نہ کرا پایا تھا کہ وہ واقعی بیگم وسیم ملک ہے۔۔۔ یہ بے جوڑ سا جوڑ جو تھا، وہ بار بار حیرانگی سے کبھی شینو اور کبھی وسیم ملک کو تک رہا تھا۔ شینو اس کی حیرانگی پر مسکرا رہی تھی۔

تھوڑی دیر باتیں ہوئیں۔ آصف عباس کے متعلق شینو کو پتہ چلا کہ وسیم ملک کے خالہ زاد کا بیٹا ہے، مکینکل انجینئر ہے اور ان دنوں ایک بہت بڑی پوسٹ پر سعودی عرب میں مقیم ہے۔ مہینے کی سالانہ چھٹی گزارنے آیا ہے، ہنوز غیر شادی شدہ ہے۔ ماں ہے نہ بہن، اس لیے شادی کا مسئلہ تاحال طے نہیں ہو پایا۔

شینو جلد ہی اس سے بے تکلف ہو گئی۔ شادی کی بات ہوئی تو ہنس کر بولی۔

"کوئی آئیڈیل کا چکر تو نہیں؟"

وہ ہنس پڑا۔۔۔۔۔ شینو بھی ہنس دی۔

اور

دونوں کی ملی جلی ہنسی خطرے کے الارم کی طرح وسیم ملک کے کانوں میں بج اٹھی۔

وسیم ملک دفتر سے آئے تو بریف کیس نوکر نے پکڑ لیا۔ دوسرے نے دروازہ کھولا۔ وہ اندر آگئے۔

لاؤنج سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ لاؤنج کی شیشے کی دیوار کے پار لان پر نظر پڑی۔

شینو اور آصف عباس بیڈ منٹن کھیل رہے تھے۔ دونوں بہت خوش نظر آرہے تھے۔ آصف کے ہر شاٹ پر شینو کی خوشی سے بھرپور چیخ نما آواز نکلتی۔۔۔۔ تو آصف عباس کھلکھلا کر ہنس دیتا۔

وسیم ملک وہاں ٹھہر نہ سکے، تیز قدم اٹھاتے اپنے کمرے میں آگئے جہاں بیڈ پر اپنا آپ گرانے کے انداز میں

ڈال دیا۔۔۔آنکھیں بند کر لیں لیکن ذہن متحرک تھا۔۔۔بڑی اذیت ناک اور کربناک وضاحتیں اس پردے پر ہونے لگیں۔

آصف عباس تقریباً روزانہ ہی یہاں آرہا تھا۔

کل وہ آفس سے لوٹے۔۔۔۔۔تو دونوں تاش کھیل رہے تھے۔اتنی بے تکلفی سے ریمارک پاس کر رہے تھے کہ وسیم ملک کا دل دہل گیا۔

ایک دن پہلے دونوں شاپنگ کے لیے گئے تھے، یہ شینو نے ہی انہیں بتایا تھا۔شاپنگ کے بعد دونوں امی کی طرف بھی چلے گئے تھے۔اور وسیم ملک کے آفس سے آنے کے کوئی دو گھنٹے بعد گھر لوٹے

اور

اس دن جب شینو نے آصف کی بطور خاص کھانے کی دعوت دی تھی تو سارا دن کچن میں گزارا تھا۔ہر چیز اپنے ہاتھ سے تیار کی تھی۔آصف نے بھی ایک ایک چیز کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیئے تھے۔

وسیم ملک کا شاید دل رکھنے کو کہہ دیا تھا۔"انکل آپ واقعی خوش نصیب ہیں، جوان جیسی ہم صفت موصوف بیوی ملی۔"

وہ تو کچھ نہیں بولے تھے، شینو نے البتہ کہا تھا۔۔۔۔۔"آپ کو حسد ہو رہا ہے۔"

وہ ہنس کر بولا تھا۔"بالکل۔۔۔۔۔"

شینو بھی ہنس پڑی تھی۔

چھوٹی چھوٹی کئی باتیں تھیں، ننھے منے کئی واقعات تھے، جو وسیم ملک کے ذہن کو آلودہ کر رہے تھے۔جن وسوسوں کو وہ تھپک تھپک کر سلا دیا کرتے تھے۔اب جاگ اٹھے تھے اور ان باتوں اور واقعات سے تقویت پر ک تنومند ہو رہے تھے۔

وہ دونوں ٹیرس پر آمنے سامنے کھڑے تھے۔شینو نے خوبصورت لباس زیب تن کیا تھا۔ہلکے میک اپ سے اس کا حسن جہانسوز قیامت ڈھا رہا تھا۔

دونوں باتیں کر رہے تھے۔آصف عباس سے وہ شادی کے مسئلے پر بات کر رہی تھی۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟"اس نے مسکرا کر آصف کو دیکھا۔

"دیکھیں جی۔۔۔۔۔صاف صاف کہہ دوں۔"وہ شوخی سے اس کو دیکھ کر بولا۔

"ضرور۔۔۔۔۔۔۔۔ضرور۔۔۔"

"تو بات یہ ہے کہ پہلے تو میرا آئیڈیل کوئی نہیں تھا۔لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"اب ہے۔

"بتادو۔۔۔"

"آپ ہیں میرا آئیڈیل ہر لحاظ سے مکمل۔۔۔۔"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

آصف سنجیدہ تھا۔"میں نے آپ کو پوری ایمانداری سے بتادیا ہے۔"

بالکنی سے گزرتے ہوئے وسیم ملک نے دونوں کی صرف اتنی ہی گفتگو سنی۔۔۔اس سے زیادہ کچھ سننے کی ان میں ہمت ہی کہاں تھی۔ان کی تو ہستی کا تانا بانا ہی بکھر گیا' جانے کیسے وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آئے' گاڑی نکالی اور باہر چلے گئے۔

شینو نے محسوس کیا کہ وسیم ملک کچھ بجھے بجھے سے رہتے ہیں۔ دو تین دفعہ اس نے بڑے اصرار سے پوچھا تو وسیم ملک بات بنا گئے۔ "کچھ کاروباری پریشانیاں ہیں۔"

شینو کے پاس اس کا کیا علاج تھا۔ اس لیے خاموش ہو گئی۔ ویسے بھی ان دنوں ان کا ذہن بہت مصروف رہتا تھا۔ ادھیڑ بن تذبذب شش و پنج میں مبتلا تھی۔۔۔

کچھ کہنا چاہتی تھی۔

لیکن

کہہ نہ پاتی تھی۔

کچھ کرنا چاہتی تھی۔

لیکن

کر نہ پاتی تھی۔

جب بھی موڈ بناتی۔۔۔ کہہ دینے کا حوصلہ مجتمع کرتی وسیم ملک پریشان حال نظر آتے' سارا کیا دھرا رہ جاتا۔

یوں

کئی دن گزر گئے۔

اس رات جب شینو اپنے بیڈ روم میں آئی تو وسیم ملک بستر میں لیٹے تھے۔ آج ان کا موڈ قدرے بدلا ہوا تھا۔ یوں لگتا تھا ذہنی بار کسی حد تک کم ہو گیا ہے۔

ان کے ذہن سے بار اترا تو نہیں تھا' البتہ کچھ ہلکا ضرور ہو گیا تھا۔ انہیں پتہ چلا تھا کہ آصف عباس اگلے ہفتے واپس جا رہا ہے' اس کے جانے کے بعد ہی صورتحال سے نپٹا جا سکتا ہے۔

شینو ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ کپڑے بدلے خوبصورت نائٹی پہنی اور بالوں میں برش کرتے ہوئے وسیم ملک کی طرف دیکھا۔

"سر۔۔۔۔۔۔" اس نے شوخی سے کہا۔

"ہوں۔۔"

"طبیعت کچھ سنبھلی؟"

"کیوں۔ کیا ہوا تھا مجھے۔"

وہ برش رکھ کر بیڈ میں آ گئی۔۔۔۔ وسیم ملک نے نظر بھر کر اسے دیکھا اور پھر گہری سانس چھوڑتے ہوئے اس کی طرف کمر کر لی۔

"کیا بوریت ہے۔" وہ بولی۔

وسیم ملک اب سیدھے لیٹے تھے۔ گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ شاکی انداز میں انہیں تک رہی تھی' حسن کا یہ کونسا انداز ہے' لگتا تھا کہ وہ کچھ بھی تو نہ سمجھ پائے۔

چند لمحے اسے دیکھا۔۔۔ پھر جانے کیا خیال آیا۔ بڑے چبھتے انداز میں بولے۔

"آصف واپس جا رہا ہے۔"

شینو ایک دم چونکی اور پھر جیسے کہنے کو راہ مل گئی جلدی سے بولی۔ "ہاں میں۔۔۔ اسی کے متعلق آپ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔"

وسیم ملک کا دل ایک لمحے کو تھم گیا۔۔۔ سانس تک لینا جیسے بھول گئے ہوں۔ آنکھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ انہوں نے سختی سے آنکھیں میچ لیں۔

شینو بستر میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔۔۔۔۔ بازو وسیم کی چھاتی پر رکھتے ہوئے ان پر جھک گئی۔

"ایک بات کہوں۔" اس نے سر ان کی چھاتی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"کہو۔" ان کی آواز جیسے قبر سے آئی۔

اس نے سر اٹھایا' مسکراتے ہوئے وسیم ملک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "آصف عباس بہت اچھا لڑکا ہے۔۔۔۔"

وسیم ملک کے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا۔

وہ اترتے ہوئے بولی۔ "اتنے دنوں میں نے اسے خوب جانا پرکھا ہے۔ وہ بہت اچھا۔"

"تو۔۔۔۔تو۔۔۔۔۔۔" جیسے یہ الفاظ آپ ہی آپ ان کے منہ سے پھسل گئے۔۔۔۔

"اگر آپ چاہیں۔۔۔۔تو۔۔۔۔" وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ بمشکل ادا کر پائی۔

"کیا۔۔۔۔۔" جھلاّ کر وسیم ملک نے اسے اپنی چھاتی سے پرے کیا اور بستر میں قدرے سرک کر اونچے ہو گئے۔

شینو ان کا چہرہ نہ دیکھ پائی کہ اپنی سوچوں کو عملی جامہ پہنا رہی تھی۔ ان کی آنکھیں غضب ناک انداز میں کھلی تھیں اور چہرے پر بھیانک رنگ بکھر گئے تھے۔

شینو اپنی انگلیاں مسلتے ہوئے بولی۔ "کہنا اچھا تو نہیں لگتا پھر بھی آصف عباس اتنا اچھا لڑکا ہے۔ کہ جی چاہتا ہے۔۔۔۔"

"کیا جی چاہتا ہے؟" وسیم ملک اب پھر مٹی کا ڈھیر ہو رہے تھے۔ مریل سی آواز نکلی۔

"آپ بینا کا رشتہ آصف سے کروا دیں۔۔۔۔" شینو نے شرمیلی سی مسکراہٹ سے ان کو دیکھا۔

وسیم ملک ششدر سے رہ گئے۔ ایک لمحے کو تو جیسے شینو کی بات ہی نہ سمجھ پائے۔

شینو نے اپنے بازو ان کے گلے میں ڈال دیئے بڑی لجاجت سے بولی۔ "ہمارے ابو نہیں' امیّ بیمار رہتی ہیں' بینا کا فرض بھی انہوں نے ادا کرنا ہے۔ میں چاہتی ہوں بینا کا رشتہ بھی اچھی جگہ ہو جائے۔۔۔ آصف ہر لحاظ سے موزوں ہے۔ بینا بھی میری طرح ہے بلکہ مجھ سے زیادہ صلاحتیں ہیں اس میں۔ آصف نے مجھے آئیڈیل بنالیا ہے۔ بینا یقینا" اسے پسند آئے گی۔ وہ اس سے مل بھی چکا ہے۔"

وسیم ملک چپ تھے۔۔۔۔ اپنے وسوسوں ہی کے گلے گھونٹ رہے تھے۔ وہ کچھ نہ بولے۔

تو شینو نے اپنے بازوؤں ہی سے جو ان کی گردن میں حمائل تھے۔ ہولے سے جھٹکا دیا۔۔۔۔۔

"سن رہے ہیں آپ کاروباری مسائل ذرا ذہن سے نکال کر میری بات سنیئے نا۔۔۔۔ آپ کوشش کریں تو یہ رشتہ ہو سکتا ہے۔ میں کئی دنوں سے آپ سے کہنا چاہ رہی تھی۔ لیکن اپنے منہ سے کہتے اچھا نہ لگتا تھا۔۔۔۔ اب وہ واپس جا رہا ہے۔ جانے سے پہلے پلیز آپ کوشش کر دیکھیں نا۔"

وہ شینو کا خوبصورت چہرہ تکنے لگے۔

"سر کہاں گم ہیں آپ۔۔۔۔؟" مسکرا کر اس نے پھر ان کی گردن کو جھٹکا دیا۔

اس دفعہ معمولی سے جھٹکے سے ہی وسیم ملک کی گردن جھک گئی انہوں نے دونوں ہاتھوں میں شینو کا چہرہ تھام لیا اور طمانیت کی گہری سانس لیتے ہوئے بولے۔ "صرف کوشش ہی نہیں۔۔۔۔۔ یہ رشتہ کروا کے دم لوں گا۔"

"سچی سر۔۔۔۔" وہ خوشی سے بہک گئی۔

"بالکل۔۔۔۔" وسیم ملک نے اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹوں کو چھو لیا۔ وہ انداز سپردگی سے ان کی گود میں گر گئی۔

253

وسیم ملک کی بکھری بکھری دنیا پھر سے شادابیوں اور رعنائیوں میں سمٹ آئی۔

وسیم ملک کی کوشش سے بینا اور آصف ازدواجی بندھن میں بندھ گئے۔۔۔۔۔وہ دونوں بہت خوش تھے۔
شینو کے دل کی مراد بر آئی تھی' وہ بھی بہت خوش تھی۔ وسیم ملک کی ممنون احسان بھی۔۔۔اب تو اس
شخص نے اس کے لیے دیوتا کا روپ دھار لیا تھا۔

اب وہ دونوں ایک بھرپور خوشگوار زندگی گزار رہے ہیں۔ شینو نے ثابت کر دکھایا ہے کہ خلوص اور محبت کے
رشتوں پر عمریں اثرانداز ہوتی ہیں نہ کوئی اور بات۔۔۔۔۔یہ بندھن اپنی نوعیت کے اعتبار سے انوکھے اور
مضبوط ہوتے ہیں۔

اس کا اعتراف وسیم ملک بھی کرتے ہیں۔

لیکن

کبھی کبھی

جب انہیں اپنے ان وسوسوں اور غلط فہمیوں کا احساس ہوتا ہے تو اندر ہی اندر نادم ہوتے رہتے ہیں کبھی کبھی جی
چاہتا ہے کہ شینو کو بتا دیں۔

لیکن

ایسا دانستہ نہیں کرتے۔ نہیں چاہتے کہ خلوص اور محبت کے نازک رشتے کو اس بات سے کوئی دھچکا لگے۔

بات کا زہر

وہ دوڑنے کے سے انداز میں چلتی ڈیوڑھی سے صحن میں آئی اور تیز تیز قدم اٹھاتے صحن عبور کر کے سامنے

والے کمرے میں گھس آئی۔

دائیں ہاتھ باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھی اماں کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ آسیہ کے لیے سالن گرم کر کے پھلکا بنانے کو
پیڑا بنا رہی تھیں۔ آسیہ کو گرم پھلکا کھانے کی عادت تھی۔ اس لیے اماں اس کے کالج سے آنے پر تازہ پھلکا بنایا
کرتی تھیں۔ وقت کا اندازہ اماں دھوپ ہی سے کر لیتی تھیں۔ سامنے والی دیوار سے جب دھوپ ڈھل کر
کھڑکی کے چھجے پر اترنا شروع ہوتی تو اماں اٹھ کر باورچی خانے میں آ جاتیں۔ آسیہ کے لیے کھانا گرم کرتیں،
تازہ پھلکا بناتیں۔ آسیہ کتابیں پلنگ پر پھینک کر چادر سر سے اتارتی۔ اور پھر یونیفارم بدلے بغیر ہی باورچی
خانے میں دوڑی آتی۔

اماں اسے دوسری پیڑھی پر بٹھاتے ہوئے چھوٹی سی تپائی اسکے سامنے رکھ دیتیں۔ پھر پلیٹ میں سالن
نکالتیں۔ شیشے کے گلاس میں پانی بھر کر رکھتیں اور باریک سا ہلکا پھلکا اتار کر چھوٹی سی چنگیری میں رکھ کر اس
کے آگے رکھ دیتیں۔ آسیہ کھانا کھاتے ہوئے اماں کو سارے دن کی روئیداد سنایا کرتی۔

اس کے لیے سالن گرم کرنا اور تازہ پھلکا بنانا اماں کا معمول تھا۔ حالانکہ گھر میں بہو آ گئی تھی۔ اور سارا کام اس
نے اپنے ذمے لیا تھا۔ کھانا پکانا، گھر کی صفائی اور کپڑے

تک وہی دھوتی تھی۔

کئی بار اس نے اماں کی یہ ذمہ داری بھی اپنے ذمہ لینا چاہی تھی۔ وہ کہتی، اماں جی آپ تکلیف کیوں کرتی ہیں۔
میں جو ہوں، سارا کام کرتی ہوں۔ یہ کام بھلا مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ اماں مسکرا کر اسے دعا دیتے ہوئے کہتیں۔
جیتی رہو بہو۔۔۔۔۔۔سارا کام تو تم ہی کرتی ہو۔ یہ کوئی کام تھوڑا ہی ہے۔ مجھے شروع سے آسیہ کو پاس بٹھا
کر کھانا کھلانے کی عادت ہے نا۔۔۔۔۔۔اس سے کیا فرق پڑتا ہے جو دو پھلکے میں اتار لیتی ہوں۔"

بہو چپ ہو جاتی۔۔۔۔۔۔

جانتی تھی آسیہ ماں کی لاڈلی ہے۔ گھر میں سب سے چھوٹی ہے۔ اس لیے اماں کی کچھ زیادہ ہی لاڈو بن گئی ہے۔
اماں نے آسیہ کو اس انداز سے صحن سے گزرتے اور کمرے میں گھستے دیکھا تو سمجھ گئیں کہ آج پھر کچھ ہوا ہے۔
یہ ہونا تو ہوا بن گیا تھا۔۔۔۔۔۔
آسیہ تیر کی سی تیزی سے کمرے میں جا گھسی تھی۔ اماں کو سلام کیا تھا۔ نہ مسکراتے ہوئے چھوٹی سی بچی بن کر کہا تھا۔ "روٹی کہ پراٹھا۔۔۔۔۔"
اسی لیے تو اماں کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ معمول بے معمول ہو جائے تو بات تشویش ہی کی ہوتی ہے۔
اماں نے ہاتھ میں پکڑا پیڑہ واپس آٹے کی لگن میں رکھا، ہاتھ دوپٹے کے آنچل سے پونچھے۔ پھر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔
"آسیہ۔" انہوں نے باورچی خانے کے دروازے میں آتے ہوئے آواز دی۔
آسیہ کی جگہ بہو بولی۔ "اماں، آسیہ ادھر ہے۔"
"کیا ہوا۔" اماں کا دل دھک کرنے لگا۔

"وہی۔۔۔" بہو نے اندر ہی سے آواز دی۔ "آج اس نے پھر چھیڑا آسیہ کو۔"
اماں پریشان ہو گئیں۔ بد دعائیں دیتے ہوئے صحن میں آ گئیں۔ "اللہ اس شیطان کو غرق کرے، کہاں سے آ گیا شریف محلے میں۔ کسی کی آئے اسے۔ مردود، کمینہ کتا۔"
اماں دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کمرے میں آ گئیں۔
آسیہ بھابھی کے پلنگ کی پائنتی کی طرف کنارے پر ٹکی بیٹھی تھی۔ وہ بہت پریشان اور گھبرائی گھبرائی لگ رہی تھی۔ بھابھی اس کے قریب بیٹھی پوچھ گچھ کر رہی تھی۔
"پھر موئے نے چھیڑا تجھے۔۔۔" اماں سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔

آسیہ نے سر اثبات میں ہلا دیا۔
"باز نہیں آتا۔۔۔" بھابھی بولی۔ "کچھ کرنا ہی پڑے گا اس کا۔۔۔ کتنا پریشان کرتا ہے۔"
"رنگ ابھی تک اڑا ہوا ہے بچی کا۔۔۔" اماں بیٹی کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولیں۔
"کہاں تھا آج۔" بھابھی نے پوچھا۔
"گلی کے نکڑ پر۔ راجو چاچا کے مکان کی اوٹ میں کھڑا تھا۔۔۔" آسیہ بولی۔
"ہوں، وہاں سے گلی مڑتی ہے نا۔۔۔ یہ کم بخت گلیاں بھی اتنی تنگ ہیں کہ گزرنا مشکل ہوتا ہے۔" بھابھی نے کہا۔
"آج۔۔۔ آج تو اس نے بازو پھیلا کر میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔" آسیہ کے منہ سے گھبراہٹ کے مارے ٹھیک سے بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔ "بری بری باتیں بھی کیں۔" بھابھی پریشان ہو گئیں اور اماں کے چہرے کی رنگت پیلی پڑ گئی۔
"اب ایسی جرأت بھی کرنے لگا ہے وہ۔۔۔" اماں بولیں۔

"اماں آپ کریں نہ کچھ اس کا۔۔۔ اس کے گھر جا کر ماں باپ سے شکایت کریں۔ وہ بڑھتا ہی جا رہا ہے۔۔۔ اس لوفر اور آوارہ لڑکے کا کیا ہے، عزت پر تو ہماری حرف آئے گا۔۔ پہلے وہ خاموش کھڑا رہتا تھا۔"
"ہاں۔" اماں نے کہا۔
"پھر آوازے کسنے شروع کیے۔" آسیہ نے کہا۔ "ایسی گندی گندی باتیں کہتا تھا۔ میں کان لپیٹ کر گزر جاتی۔۔۔ آج۔۔ آج اس نے بازو پھیلا کر راستہ روکا اور۔۔۔"
"تمہارے بھیا کو بتانا پڑے گا۔ اماں تو ایسے ہی ڈرتی ہیں۔ کیا کرے گا ہمارا۔" بھابھی جوش میں آ گئیں۔ "مار مار کر ادھ موا نہ کر دیا تیرے بھیا نے تو۔۔۔"

"کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" اماں سوچتے ہوئے بولیں۔ "میں تو ڈر کے مارے شبیر سے بات نہیں کرتی۔۔۔ جوشیلا سا ہے، غیرت میں آکر کہیں جان ہی سے نہ مار ڈالے اسے۔"

"ایسے ذلیل کتوں کو تو جان سے ہی مار ڈالنا چاہیے۔" آسیہ غصے سے بولی۔

اماں سوچ میں پڑ گئیں۔ بھابھی نے آسیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تو فکر نہ کر، میں اسے ٹھیک کرواؤں گی، حوصلہ نہ پڑے گا۔ کبھی اپنے دروازے میں بھی کھڑا ہونے کا۔ بھیا کو آج آ لینے دے۔"

بہو کا جوش دیکھ کر اماں ڈر گئیں۔ جلدی سے بولیں۔ "ذرا ٹھہرو۔۔ سوچ سمجھ لینے دو۔ مردوں تک بات پہنچانے سے پہلے ہمیں خود کچھ کرنا چاہیے۔"

"کتنی دفعہ تو کہا ہے کہ آپ اس کے گھر جا کر اس کے ماں باپ سے شکایت کریں۔ آپ وہاں بھی نہیں جاتیں۔ ادھر سے کچھ ہوتا جو نہیں، اس لیے وہ شیر ہوتا جا رہا ہے۔ آج راستہ روکا ہے، کل کو خدانخواستہ۔"

"ہاں اماں۔ مجھے تو سخت ڈر لگنے لگا ہے، کالج سے آتے آتے۔" آسیہ خوفزدہ ہو گئی۔

"اچھا۔ میں آج جاتی ہوں ان کے گھر، اس کے ماں باوا سے شکایت کرتی ہوں۔" اماں نے کہا۔

"پھر بھی باز نہ آیا تو سمجھ لیں گے اس سے۔"

"اچھی طرح سمجھ لیں گے۔" بھابھی بولی۔ "چھٹی کا دودھ نہ یاد کروا دیا تو بات نہیں۔ تیرا بھیا خود اس پر بھاری ہے۔ پھر ضرورت پڑی تو صغیر اور بشیر کو بھی بلا لیں گے۔ اب چپ چاپ تماشا دیکھنے سے تو رہا نہیں جائے گا۔"

"ہاں بہو۔ باز نہ آیا تو کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا۔" اماں نے کہا، پھر خود ہی بولیں۔ "اللہ جانے کہاں سے آن مرے ہیں یہ لوگ۔ شریفوں کے محلے میں اپنے کی تمیز ہی نہیں۔ مدتیں ہو گئیں اپنی گلیوں میں رہتے سہتے۔ کبھی ایک دوسرے کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ محلے کی بہو بیٹی سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ اپنا جوانی سے

بڑھاپا انہی گلیوں میں آ گیا۔ کبھی کسی نے کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔"

"سلیمان چاچا نے خواہ مخواہ گھر ایسے لفنگوں کو کرائے پر دے دیا۔" آسیہ چادر اتارتے ہوئے بڑبڑائی۔

"خالی پڑا تھا، کرائے پر تو اٹھنا ہی تھا گھر۔" بہو بولی۔ "چاچا بے چارہ کیا جانتا تھا کہ کرایہ دار ایسے لوفر لفنگے ہوں گے۔"

"میں آج ہی جاتی ہوں ان کے گھر۔" اماں نے کہا۔

"آج نہیں، ابھی جائیے۔" بہو بولی۔ "اس وقت وہ شہدا بھی گھر پر ہی ہو گا۔ ذرا اس کی ماں کے سامنے اس کے کرتوت بتائیں جا کر۔"

بھابھی آسیہ کے لیے کھانا گرم کر کے پھلکے بنانے کو باورچی خانے میں چلی آئی۔

آسیہ سیکنڈ ایر میں تھی۔ بس سے کالج آتی اور جاتی تھی، شہر کے اندرونی علاقے میں گھر تھا۔ بس بڑی سڑک پر ٹھہرتی تھی۔ آسیہ کو تین گلیاں چل کر سڑک پر آنا پڑتا تھا۔ اپنی گلی سے چھوٹی تنگ گلی میں آتی، اس کے بعد موڑ مڑتا اور نسبتاً کشادہ گلی سے گزر کر سڑک تک پہنچتی تھی۔ گلیاں آباد تھیں۔ عورتیں مرد بچے سب ہی آتے جاتے تھے۔ صبح تو بہت گہما گہمی ہوتی، اسکولوں کالجوں کے لڑکے لڑکیاں، دفتروں کے بابو لوگ اور کام کاج جانے والے کاریگر مزدور سب ہی گھروں سے نکل کر اپنی گلیوں کو پار کر کے باہر سڑک پر آتے تھے، واپسی پر البتہ اوقات مختلف ہونے کی وجہ سے اتنی رونق نہ ہوتی، خاص کر تنگ گلی میں شاذ ہی کوئی آتا جاتا تھا۔ آسیہ اپنی گلیوں سے آتے جاتے جوان ہوئی تھی۔ اسکول کے بعد کالج میں داخلہ لیا تھا۔ کبھی کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ یہ جانی پہچانی گلیاں تو گھر کا آنگن تھیں۔

لیکن جب سے سلمان چاچا کے گھر میں نئے کرائے دار آئے تھے۔ اور ان کا آوارہ سا نوجوان بیٹا آسیہ کی راہ میں

آنے لگا تھا، یہ گلیاں اسے خوفزدہ کرنے لگی تھیں۔ شروع شروع میں تو وہ اپنے دروازے میں کھڑا رہتا تھا، آسیہ کو آتے دیکھتا تو دروازے سے باہر آجاتا۔ منہ سے کچھ نہ کہتا لیکن حرکات سے کوئی نہ کوئی غیر شریفانہ بات ضرور کہتا۔

آسیہ ادھر دھیان ہی نہ دیتی۔ چادر لپیٹے کتابیں سینے سے لگائے سر جھکائے تیز تیز قدم اٹھاتی گزر جاتی۔

اشاروں کنایوں سے بات نہ بنی تو اس نے آسیہ کو دیکھ کر سیٹی بجانی شروع کر دی، وہ دو تین سیٹیاں ضرور بجاتا۔ آسیہ کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ لیکن کچھ کہے بنا معمول کے مطابق چپ چاپ گزر جاتی۔

اب وہ کچھ زیادہ ہی جرأت مند ہونے لگا تھا۔ آسیہ کی خاموشی کو اس نے لڑکی کی شرافت نہیں سمجھا تھا بلکہ نیم رضامندی والی بات سمجھی۔۔۔۔ اسی لیے تو اب فقرے بازی کرنے لگا تھا۔

اب اس نے اپنے گھر کے دروازے کے بجائے تنگ گلی کے موڑ اور اوٹ میں کھڑا ہونا شروع کر دیا تھا۔

جہاں سے وہ آنے والے کو ایک دم نظر نہیں آتا تھا۔ آسیہ دو تین دفعہ اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ وہ اس کے سٹ پٹانے پر بڑا خوش ہوتا تھا۔ اس نے اسی خوشی کے اظہار میں دونوں بار سرگوشی کے انداز میں بڑی نازیبا بات کہہ دی تھیں۔

آسیہ نے شروع شروع میں تو گھر والوں کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اپنے آپ ہی میں سہمی رہتی تھی۔

لیکن اس کی گستاخیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس نے بھابھی سے اس کا ذکر کر ہی دیا، بھابھی سے بات امی تک پہنچی، دونوں فکر مند ہو گئیں۔ دونوں نے ہی آسیہ کو سمجھایا۔

"کتے بھونکتے ہیں۔ راہگیر چلتے ہی رہتے ہیں۔ تم ناک کی سیدھ میں چلی جایا کرو۔ اس کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ نہ کبھی کسی بات کا جواب دینا۔ خاموشی بہتر ہے۔ خود تنگ آکر دفع دفعان ہو جائے گا۔"

لیکن وہ دفع دفعان نہیں ہوا۔ اس کی گستاخانہ جرأتیں بڑھتی ہی گئیں۔

اور آج اس نے آسیہ کو گلی میں تنہا پا کر راستہ روک لیا۔

"تھوڑی دیر کے لیے رکو، میری بات سنو۔" اس نے بے سروپا باتیں شروع کر دیں۔

آسیہ سخت وحشت زدہ نظر آئی۔ چہرہ سپید پڑ گیا۔

"ہٹو۔۔۔ راستہ دو مجھے۔"

"پہلے میری بات سنو۔"

"بکواس بند کرو۔"

"ذلیل کمینے۔"

"غصے میں تو اور بھی بجلیاں گرا رہی ہو۔۔ میں۔۔۔"

اس کی بات ادھوری رہ گئی تھی۔ گلی کے نکڑ والے چوبارے میں کسی کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ گلی میں کھلنے والی کھڑکی کی چک اٹھا کر شاید کسی نے نیچے جھانکا بھی تھا اور وہ ایک سیکنڈ میں رفوچکر ہو گیا۔۔ اور آسیہ بے طرح گھبرائی متوحش سے گلی کو دوڑتے ہوئے عبور کر کے اپنی گلی میں آئی۔ وہاں سے بھی بھاگتے بھاگتے اپنے گھر آئی۔

اماں جہاندیدہ عورت تھیں، بھابھی اور آسیہ انہیں اکسا رہی تھیں کہ فوراً ہی اس کے گھر جا کر شکایت کریں۔ اس کے ماں باپ سے اس کی مرمت کروائیں۔ اگر ایسے ٹھیک نہیں ہوا تو پھر آسیہ کے سارے بھائیوں اور رشتے کے دوسرے مردوں سے کہہ کر اس کا حلیہ درست کروائیں۔

اماں سوچ رہی تھیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ مردوں میں بات پہنچنے سے ان کے کوش غیرت میں کچھ کر گزرنے کا احتمال تھا۔ اگر اسے جان سے ہی مار ڈالا۔ تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ بات بڑھے گی اور بچی کا نام بھی آئے گا۔

وہ بیٹوں سے کہنے کے تو قطعی طور پر حق میں نہیں تھیں۔ہاں وہ اس کے ماں باپ سے شکایت کر سکتی تھیں۔
محلے داری کے ناطے انہیں ان حدود کا احترام کرنا چاہیے تھا۔ جو اہلِ محلہ نے از خود وضع کر لی ہوتی ہیں۔
اس لڑکے کو بلا کر بھی وہ سرزنش کر سکتی تھیں۔ محلے کی بہو بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں۔ بے شک وہ یہاں نئے
نئے آئے ہیں۔ پھر بھی ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔۔ان کا فرض ہے۔
ابھی وہ سوچ ہی رہی تھیں کہ بہو اور آسیہ نے اس کے گھر جانے پر پر جوش سی تقریریں

شروع کر دیں۔ بہو کا تو بس نہیں چلتا تھا، جو اماں کی جگہ خود چلی جاتی اور اس کے ماں باپ کے ہی سامنے ایسی
مرمت کراتی کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔
اماں کو ان کے ہاں جانا ہی پڑا۔
وہ متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ماں باپ چھ بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ تین بڑے لڑکے ملازمت کرتے
تھے۔ چوتھا لڑکا یہی تھا، جس نے نہ تو تعلیم مکمل کی تھی اور میٹرک کے بعد ہی آوارہ لڑکوں کی صحبت میں پڑ
گیا تھا۔ کام کاج کرتا نہیں تھا۔ بس سارا دن آوارہ گردیاں کرتا تھا۔ کھانے پینے کو مل جاتا تھا۔ بے فکری تھی،
باہر جانے کی رٹ لگا رکھی تھی۔ بڑے بھائی پیسہ خرچنے کو تیار تھے لیکن جب تک وہ کوئی دستی کام نہ سیکھتا باہر
کیسے بھیج دیتے۔ ائیر کنڈیشننگ کے کام کے لیے بڑے بھائی نے زور لگایا۔ داخلہ بھی دلوایا۔ لیکن اس نے
کوئی کام نہیں سیکھا، ایک موٹر مکینک کے ساتھ ابا نے لگا دیا کہ کچھ سیکھ لے، لیکن اس نے جم کر کام کرنا سیکھا
ہی نہیں تھا۔ یہ کام اس کی شان کی منافی تھے۔ چھوٹے بھائی نے ایف اے میں داخلہ بھی دلوا دیا کہ کچھ پڑھ
لکھ لے۔ لیکن طبیعت میں آوارگی رچ بس گئی تھی۔ اچھا کھانا مل جاتا تھا، اور جدید فیشن کے کپڑے لڑ جھگڑ کر
بنوا لیتا تھا۔ میٹرک کیے اسے چھ سات سال ہو گئے تھے۔ لیکن اس نے اپنا کیریر بنانے کے لیے کچھ نہیں کیا
تھا۔ لفنگے دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا۔ سولہویں صدی کے بجری قدامتوں جیسا حلیہ بنائے رکھنا۔ بے

تحاشہ سگریٹ پینا اور اسکولوں اور کالجوں کی لڑکیوں کو گھورتے رہنا یہی مشغلہ تھا۔ جب سے اس گھر میں آیا
تھا، آسیہ پر نظر پڑ گئی تھی۔ اسے کالج آتے جاتے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ صبح تو کافی لوگ ہوتے تھے، ہاں
کالج سے واپسی پر جب گلیاں تقریباً سنسان ہوتیں، وہ غنڈہ گردی کرنے میں تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔
اماں نے اس کی اماں سے ساری باتیں شاکی انداز میں کہتے ہوئے بھرپور طنز بھی کیے۔

"اسے شریفوں کے محلے میں رہنے کے آداب سے آگہی نہیں۔ وہ عادی ہو گا ان باتوں کا لیکن سن لو بہن،
یہاں عزت دار لوگ رہتے ہیں۔ تمہارا لڑکا باز نہ آیا تو پھر ہم اسے باز رکھنے کے گر بھی جانتے ہیں۔۔۔"
اس کی ماں شریف عورت تھی، گھڑوں پانی پڑ گیا۔ آنکھیں جھک گئیں۔ اس بیٹے نے تو اسے کہیں کا نہیں رکھا
تھا۔ اماں کو تسلی دیتے معذرت خوانہ انداز میں بولی۔ "معاف کرو بہن، ہم اسے ٹھیک کریں گے۔ آئندہ
شکایت کا موقع نہیں ملے گا آپ کو۔ آپ کی بچی، ہماری بچی ہے۔ اس کی طرف سے میں معافی مانگتی ہوں۔
آج اس کے ابا آلیں۔ سیدھا کر دیں گے اسے، آپ بالکل بے فکر رہیں۔"
اس شام اس کی ابا کے سامنے پیشی ہوئی۔ بڑے بھائی بھی آ گئے۔ اماں نے جو شکایت کی تھی، ان کا تو ندامت
سے سر ہی جھک گیا۔ کتنی بڑی بات تھی۔ شریفوں کی اولاد میں یہ لوفر لفنگا پیدا ہو گیا تھا۔ ابا نے لعن طعن کی۔
گالیاں دیں، برا بھلا کہا۔ بڑے بھیا نے طیش میں آ کر دو تین ٹھڈے بھی مار دیے۔ "آئندہ کبھی محلے سے
شکایت آ گئی نا۔ تو یاد رکھنا میں چاہے پھانسی چڑھ جاؤں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" غصے سے بھڑکتے ہوئے
بھیا نے کہا۔
"نالائق، نکما۔۔۔ ایک کام کاج نہیں کرتا۔ اس پر محلے کی بیٹیوں کو چھیڑتا ہے۔۔ خون پی لوں گا تیرا اگر اب
سنی کوئی بات۔۔۔"
امی نے بھی طنز و طعن کے تیر برسائے، وہ ڈھٹائی سے سب کی سنتا رہا۔

اور

دل ہی دل میں کھولتا رہا۔۔ آسیہ نے شکایت کی تھی اس کی۔ اسے باپ بھائیوں یا امی پر نہیں، آسیہ پر غصہ آرہا تھا۔۔ پیچ وتاب کھاتے ہوئے وہ اس لڑکی کی زندگی اجیرن کرنے کے طریقے سوچ رہا تھا۔

کئی دن وہ آسیہ کی راہ میں نہیں آیا۔۔ آسیہ خوش تھی، اماں کے شکایت کرنے کا کچھ تو اثر ہوا تھا۔۔ اب وہ بے دھڑک کالج آتی جاتی تھی۔۔

لیکن اس دن وہ بس میں سوار ہو رہی تھی کہ اس کے پیچھے وہ بھی لپک کر سوار ہو گیا۔۔ بس میں رش تھا، لوگ ایک دوسرے کے اوپر چڑھے آرہے تھے۔ آسیہ نے بہت بچنے کی کوشش کی لیکن وہ جیسے اس کے ساتھ ہی چپکنے کے درپے تھا۔ صرف کھڑے ہونے کی بات ہوتی تو بات بھی تھی۔ وہ تو اپنی گندی زبان سے بڑی بیہودہ باتیں بھی کر رہا تھا۔ آسیہ سخت پریشان ہو رہی تھی۔

وہ بکے جا رہا تھا۔

"جی بھر کے شکایتیں کر لو۔۔"

آسیہ کا خون کھول رہا تھا۔ وہ جگہ بنا کر آگے سرکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے کسی بات کا جواب نہ دینے کی قسم کھا رکھی تھی جیسے۔۔۔ لیکن جب وہ بہت ہی بیہودہ اور غیر مہذب سرگوشیاں کرنے لگا۔ تو آسیہ سے نہ رہا گیا۔۔ ہاتھ اٹھایا اور جتنی قوت سے تھپڑ مار سکتی تھی، اس کے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔۔ "آوارہ، لوفر، لفنگے۔۔۔" وہ چلائی۔

بس میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔۔ سیٹوں پر بیٹھے اور بمشکل جگہ بنا کر کھڑے لوگوں نے دونوں کو دیکھا۔ کنڈیکٹر آگے بڑھا۔۔ چادر میں لپٹی ایک شریف لڑکی کے چہرے سے خوف اور پریشانی ظاہر تھی۔ غیرت کا جذبہ ابھی ہر دل میں موجود تھا، لوگ اس پر پل پڑے۔۔۔ ڈرائیور کو بس روکنا پڑی۔

لوگ اسے پکڑ کر تھانے لے جانا چاہتے تھے۔ ایک نوجوان نے اسے گریبان سے پکڑ کر بس سے باہر دھکا دیا۔ اور لوگ بھی اترے۔۔

اس نے جان بچا کر بھاگنے میں ہی مصلحت سمجھی، گھونسے خوب پڑے تھے۔۔۔

منہ سے خون بھی نکل آیا تھا۔ لوگ اسے تھانے پہنچا ہی دیتے کہ وہ گریبان چاک کروا کر بھاگ گیا۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے بھی بھاگے لیکن دوسروں نے واپس بلا لیا۔۔ ان کے خیال سے اتنی لتاڑ ہی کافی تھی۔ اسے برا بھلا کہتے اور گالیاں دیتے لوگ واپس بس میں آبیٹھے۔ نوجوانوں کی بے راہ روی اور آوارگی پر بس کا ہر فرد نکتہ چینی کر رہا تھا۔۔

آسیہ بے حد خوفزدہ ہو گئی تھی۔۔ تھپڑ تو اس نے جوش جذبات میں مار دیا تھا، غصہ جو آگیا تھا۔۔ لیکن تھپڑ کا ردعمل اس طرح ہو گا۔ اس نے کب سوچا تھا۔ سارا وقت وہ ڈری ڈری رہی۔ کالج میں بھی یہ خوف اعصاب پر مسلط رہا۔ اس دن گھر لوٹتے ہوئے وہ بہت ہی نروس ہو رہی تھی۔ گلی سے گزرتے ڈر لگ رہا تھا۔ کتنی ہی دیر وہ سڑک کے کنارے کھڑی رہی۔ جب کچھ لوگوں کو گلی میں جاتا دیکھا تو اس نے بھی قدم اٹھائے۔ بڑی گلی میں لوگ تھے، تنگ گلی میں بھی دو ایک بچے نظر آئے۔ دل کڑا کر کے وہاں سے گزرنے لگی۔ لیکن اسی موڑ کی اوٹ میں وہ کھڑا تھا۔ آسیہ سخت متوحش ہوئی۔ الٹے پاؤں بھاگ جانے کا خیال بھی آیا۔ لیکن سامنے سے رحیم چاچا کو آتے دیکھ کر حوصلہ بندھا۔ وہ سر جھکائے جلدی جلدی قدم اٹھانے لگی۔ اس کے قریب سے گزری تو سارے جسم میں خوف سے جھرجھری آگئی۔

آج بھی اس نے بات کی۔ ہولے سے سرگوشی کے انداز میں۔

"میں تم سے سمجھوں گا۔" اس نے دھمکی دی تھی۔ دھک دھک کرتے دل اور اڑی اڑی رنگت لیے وہ دوڑ کر گلی عبور کرتے ہوئے گھر پہنچی۔

اس کے ساتھ بھابھی اور اماں بھی پریشان ہو گئیں۔ خواہ مخواہ ہی کی دشمنی ہو گئی تھی، اماں تو الٹا اسے ہی غصے ہوئی۔ تو نے بھری بس میں کیوں اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ تو کمینہ آدمی ہے۔ پتہ نہیں اب کیا گزرے۔ لیکن اس نے کچھ نہیں کیا۔ آسیہ کو وہ پھر کبھی نظر نہیں آیا۔ گلی میں اور نہ کہیں بس میں

اس سے مٹھ بھیڑ ہوئی۔

دو تین ماہ بعد وہ لوگ یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے گئے تو آسیہ کے دل کا دھڑکا ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اب آسیہ بلا جھجک اور بے دھڑک اپنی گلیوں میں سے آنے جانے لگی تھی۔

وقت گزرتا گیا، ایک سال گزر گیا پھر دوسرا سال بھی۔ وقت نے اس واقعے کو دھول کی تہہ میں دبا دیا۔ ذہن سے بالکل ہی محو کر دیا۔

آسیہ نے بی اے کر لیا۔

اب اماں کو شادی کی فکر تھی، رشتے کی تلاش زور شور سے جاری تھی۔ اماں اپنی زندگی میں اس کے فرض سے سبکدوش ہونے کی خواہشمند تھیں۔

کوشش بسیار کے بعد آسیہ کے لیے اپنے ہی طبقے کے لوگوں میں سے رشتہ آ گیا۔ لڑکا بی اے پاس تھا۔ بنک میں نوکری کر رہا تھا اور محنتی اور ایماندار تھا۔ مستقبل سے اونچی نہ سہی، اچھی امیدیں وابستہ تھیں۔

بہت شریف خاندان تھا۔ دو بڑی بہنیں بیاہی ہوئی تھیں، ایک بھائی بھی سعودی عرب میں تھا۔ اور شادی شدہ تھا۔ باپ کسی محکمے میں ہیڈ کلرک تھا۔ کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ لیکن گھر تعمیر کرنے کا ارادہ تھا۔ زمین لے رکھی تھی۔ لڑکے نے بینک سے قرضہ لینے کی درخواست دی ہوئی تھی۔ رشتہ معقول اور موزوں تھا۔

بھابھی نے تھوڑا سا اعتراض کیا۔ "گھر تو ہونا چاہیے تھا اپنا۔"

اماں نے مطمئن ہو کر کہا۔ "گھر بنا لیں گے۔ لڑکا بنک سے قرض لے رہا ہے، گھر ہی بنائے گا۔"

بھابھی ذرا اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی تھیں۔ آسیہ کے لیے بھی چاہتی تھیں۔ ایسا گھر تو ملے، جہاں مالی دشواریاں نہ ہوں۔ لیکن رشتے بازار میں تو نہیں ملتے جو خرید لیے جائیں۔ پھر بقول اماں وہ خود کون سے امیر کبیر لوگ ہیں۔ لڑکی پڑھ لکھ جانے سے اس کے مالی

حالات بدل تو نہیں جاتے۔ باپ تھا نہیں، تینوں بھائیوں نے مل کر ہی شادی کرنا تھی اور اماں کسی کو مجبور نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ جو کہ ان سے بن پڑے گا، وہی کر دیں گے۔

منگنی ہو گئی۔ اور شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پہلے پہلے تو آسیہ کو بھابھی کی طرح یہ رشتہ کچھ جچا نہیں تھا لیکن جب منگنی ہوئی اور تیاریوں نے زور پکڑا تو ہر نوجوان لڑکی کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی نشیلے خواب سجنے لگے۔ جاگتے میں بھی خوابوں میں کھونے لگی۔ دلہن بن کر پیا کے آنگن میں اترنے کا تصور ہی مسحور رکھنے لگا۔

اماں اور بھابھی نے مل کر جہیز تیار کیا۔ تینوں بھائیوں کی کاوش سے خاصا معقول جہیز تیار ہو گیا۔ بیاہی بہنیں بھی خوبصورت تحفے لائیں۔

وہ دن آ ہی گیا، جس کا نشہ آسیہ کے دل و دماغ پر چھایا تھا۔ گھر میں خوب گہما گہمی تھی۔ رشتہ دار جمع تھے۔ رنگین آنچل لہرا رہے تھے۔ زیوروں کی چمک دمک دیدنی تھی۔ لڑکیاں بالیاں ڈھولک پیٹ پیٹ کر سر سے بے نیاز گیت گا رہی تھیں۔ مسرور سا ہنگامہ تھا۔ بارات کے آنے پر یہ ہنگامہ اور بڑھ گیا۔ بارات کا خیر مقدم جوش مسرت سے کیا گیا۔ نکاح ہوا، چھوہارے بٹے، مبارک سلامت کا غلغلہ اٹھا۔

آسیہ پچھلی کوٹھری میں اپنی سہیلیوں میں مایوں کے پیلے جوڑے میں ملبوس تھی۔ رات مہندی کا شگن تھا۔ ہاتھوں اور پاؤں میں سہیلیوں نے خوبصورت بیل بوٹے بنا کر مہندی لگائی تھی۔ چڑھاوے میں پندرہ جوڑے

اور دو ساڑھیاں اور زیور کا ایک سیٹ آیا تھا، ہاتھوں میں دو دو تولے کی چوڑیاں تھیں۔ کچھ زیور اماں نے بھی
بنوایا تھا۔ شادی کا جوڑا بھی اپنے ہی گھر کا تھا۔ یہ جوڑا بڑی بھابھی نے دیا تھا، سرخ کمخواب کا غرارہ اور ٹیشو
کا کامدانی دوپٹہ، آسیہ کی سہیلیاں جوڑے کی بہت تعریف کر رہی تھیں۔
اتنے میں بھابھی بھی آگئی اور آسیہ کی سہیلیوں سے بولی۔ اب تم لوگ آسیہ کو دلہن

بنانا شروع کر دو۔ بھابھی نے بیوٹی بکس اٹھا کر ان کے سامنے رکھ دیا۔ ابھی تیار کرنا شروع کرو گی تو کہیں دو
تین بجے تک فارغ کرو گی اسے۔ بارات کے کھانا کھانے تک بالکل تیار ہونا چاہیے، اتنے میں بھابھی چلی گئی۔
لڑکیاں آسیہ کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ گئیں، ہنستے مسکراتے وہ اس کا میک اپ کرنے لگیں۔ ان کی چھیڑ چھاڑ
سے آسیہ بے حد محفوظ ہو رہی تھی، قلقل کرتی ہنسی کی پھواریں تن بدن سے پھوٹ رہی تھیں۔
میک اپ سے واقعی آسیہ کچھ سے کچھ بن گئی۔ عام شکل وصورت کی لڑکی تھی لیکن میک اپ، عروسی جوڑے
اور زیورات نے اسے اتنا خوبصورت بنا دیا کہ جس نے دیکھا عش عش کر اٹھا۔ اتنا روپ ایسا نکھار دلہن کے گھر
لایا جاتا تھا۔ ابھی تک مہمان عورتیں اور بچے کھانا کھا رہے تھے۔ بھابھی نے صحن میں بمشکل جگہ بنا کر دو
کرسیاں رکھوائیں۔ دولہا کے ساتھ دلہن کو بٹھانا تھا۔
بھابھی نے آسیہ کی سہیلیوں سے کہا۔ "ابھی دولہا سلامی کے لیے اندر آئے گا۔ جب میں کہوں تو آسیہ کو
گھونگھٹ نکال کر باہر لے آنا۔"
لیکن
دولہا اندر نہیں آیا۔
باہر ہی ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ دولہا نے ڈولی لے جانے سے صاف انکار کر دیا تھا۔
تھوڑی دیر پہلے اسے ایک آدمی ضروری بات کرنے کے لیے دوسری طرف لے گیا تھا۔ بات کیا ایک وزنی بم

تھا۔ "آسیہ بد کردار اور آوارہ لڑکی ہے، اس کے مجھ سے ناجائز تعلقات رہے ہیں۔ میں جب دو سال پہلے اس
گلی میں رہتا تھا۔ یہ میری محبوبہ تھا۔ میں ہر بات کا ثبوت مہیا کر سکتا ہوں۔"
اس نے جانے اور کیا کچھ کہا۔ لڑکے کو اس طرح بھڑکایا اتنے وثوق سے یقین دلایا

ہ اسے ثبوت مانگنے کی ضرورت ہی نہ رہی، اس نے واپس آکر باپ اور بھائی سے ساری بات کہی۔ ان کی
غیرت پہ تازیانہ لگا۔ گم صم سے ہو گئے۔
لڑکے نے صاف انکار کر دیا۔ اپنی سنہری پگڑی اتار کر پرے پھینکی، گلے میں پڑے نوٹوں والے ہار نوچ کر اتار
دیے۔
بات کیا بھڑکی، آگ بھڑکی۔ ساری تقریب کو اس آگ نے لپیٹ میں لے لیا۔ آسیہ کے بھائی گنگ رہ گئے۔
رشتہ دار، عزیز دولہا والوں کی منت سماجت کرنے لگے۔
اماں نے سینہ پیٹ لیا۔ بھابھی بے دم سی ہو کر رہ گئی۔
محلے والوں نے آسیہ کی پاکیزگی کی قسمیں کھائیں، رشتے داروں نے ہاتھ باندھ کر ڈولی لے جانے کے لیے کہا،
لیکن بات کا زہر اس کے ذہن میں پھیل گیا تھا۔ وہ کسی طور پر آمادہ نہیں ہوا۔
آسیہ نے سنا تو پتھرا ہی گئی۔
"یہ کیا ہوا آسیہ، یہ کیا ہو گیا۔" سہیلیاں اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھ رہی تھیں، کوئی رو رہی تھی۔ کوئی سینے پہ
ہاتھ مار رہی تھی۔ "ہائے اللہ اتنا ظلم۔ ایسا اندھیر، کسی خبیث نے آگ لگائی۔" وہ بڑبڑا رہی تھیں۔
وہ گھر جہاں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ مسرتوں کے فوارے ابل رہے تھے، ماتم کدہ بن گیا تھا۔ بارات
لوٹ گئی تھی۔ کتنا رسوا کن، کیسا تباہ کن منظر تھا۔
اماں اونچی آواز میں بین کر رہی تھیں۔ بہنیں اور بھابھی اس ناحق تہمت لگانے والے کو کوس رہی تھیں۔

مہمان منہ لٹکائے بیٹھے تھے، کچھ واپس جارہے تھے۔

آسیہ کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا، کچھ نہیں سمجھ رہی تھی کہ کیا ہوا ہے۔اسے نہ تو اماں کا واویلہ سنائی دے رہا تھا، نہ بھائی اور بہنوں کی غصیلی دردیلی آوازیں۔اسے تو صرف ایک جملہ سنائی دے رہا تھا۔

"میں تم سے سمجھوں گا۔"

***

مجرم کون؟

میری ہڈیاں چیخ گئی تھیں۔گوشت جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔۔۔۔خون کی پتلی سی لکیر میرے ہونٹوں کے دائیں کنارے سے نکل کر ٹھوڑی سے ہوتی ہوئی گردن تک آرہی تھی۔۔۔۔۔۔غالباً میرا کوئی دانت گال میں اتر گیا تھا۔۔۔۔۔۔میرے چہرے پر زوردار گھونسے پڑ گئے تھے اور کئی جگہیں ابھر آئی تھیں۔چربی بوٹوں کے ٹھڈوں سے میں گیند کی طرح لڑھکتا سامنے والی دیوار کے ساتھ جا ٹکراتا۔۔۔چوٹ لگتی۔نیل پڑتے ہڈیاں چٹختیں، گوشت پھٹتا۔

لیکن

زبان سے اف نکلنے سے پہلے ہی صاحب زخمی شیر کی طرح غراتا تھا۔گالیاں دیتا، مجھے بالوں سے پکڑ کر اٹھا کر پھر میدان میں گھسیٹتے ہوئے لے آتا۔اور اپنی پوری حیوانی قوت سے زوردار ٹھڈا لگاتا۔

اس نے کہا تھا۔

"میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔جان سے مار ڈالوں گا۔"

وہ بے شمار ننگی گالیاں بکتے ہوئے بھی یہی کہہ رہا تھا۔کوٹھی کے دوسرے نوکر سہمے سہمے کھڑے تھے۔کسی کو جرأت نہ ہو رہی تھی کہ آگے بڑھ کر مجھے چھڑانے کی کوشش کرتا۔۔۔

مار مار کر ادھ موا کر دینے کے باوجود صاحب طیش وغضب سے بے قابو ہوا جا رہا تھا۔اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔۔۔چہرہ لال بھبھوکا تھا۔۔۔اور سر کے بال الجھ کر اتنے بے ترتیب ہو گئے تھے کہ اس کی ہئیت ہی بدلی ہوئی لگتی تھی۔

میرے کپڑے پھٹ چکے تھے۔قمیص کا ایک بازو الگ ہو کر میرے ہاتھ پر الٹ آیا تھا۔دوسرے کے چیتھڑے لٹک رہے تھے، گریبان گھیرے تک پہنچ گیا تھا۔صاحب نے میرے پھٹے گریبان کو مٹھی میں پکڑا کر اک جھٹکے سے مجھے اٹھا کر اپنے سامنے کھڑا کیا۔

مار کھا کھا کر میرے قدموں میں اتنی سکت نہ رہی تھی کہ میں خود سے کھڑا ہو سکتا۔صاحب کے ہاتھ کے سہارے ہی میں کھڑا ہوا۔

"ذلیل کتے۔۔۔میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔۔۔"صاحب نے میرا گریبان چھوڑ کر میری گردن اپنے ہاتھوں میں پکڑ لی۔اس کے ہاتھوں کا شکنجہ تنگ ہونے لگا۔۔۔میری آنکھیں ابل پڑیں اور زبان منہ سے باہر لٹک آئی۔۔۔اس وقت میرے منہ سے عجیب سی چیخ نما بھدی سی غراہٹ نکلی۔۔۔تو مالی بابا بے اختیار ہو کر آگے بڑھا۔صاحب کے دونوں بازوؤں کو اس نے پوری قوت سے پکڑ لیا۔

"مر جائے گا۔صاحب مر جائے گا۔چھوڑ دیں۔۔۔چھوڑ دیں۔۔۔قتل۔۔۔"مالی بابا پوری قوت سے چلایا۔

تو صاحب نے کہنی سے اسے پرے دھکا دیا۔"میں اسے قتل کر دوں گا۔۔"

خانساماں بھی حالات کی سنگینی دیکھ کر جرأت سے آگے بڑھا۔مجھ سے شاید ہمدردی محسوس ہوئی۔یا صاحب ہی

کو قتل کی واردات سے بچانا مقصود تھا۔ وہ جوان اور گرانڈیل تھا۔۔اس نے جھٹکے سے صاحب کے ہاتھ میری گردن سے چھڑاتے ہوئے صاحب کو مجھ سے پرے کرتے ہوئے غصے سے میری طرف دیکھ کر کہا۔

"دفع ہو جا یہاں سے۔۔۔۔بے حیا۔"

پھر اس نے مالی بابا سے کہا۔"بابا اسے کوارٹر میں لے جا۔"

صاحب خانساماں کے ہاتھوں سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھے خشمگین نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اب بھی زوردار گرج کے ساتھ میری ماں بہن ایک کر رہے تھے۔۔اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے میرا اگلا دبوچنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

"اس کمینے بدمعاش کی یہ جرأت۔۔۔۔میں اس کا خون پی لوں گا۔ دیکھوں گا کیسے بچتا ہے مجھ سے۔۔۔۔جان سے مار ڈالوں گا۔۔۔۔نہیں چھوڑوں گا اسے۔۔۔۔"

صاحب کے جبڑوں سے کف ہونٹوں کے کناروں تک آگئی تھی۔۔۔۔وہ بل کھا کھا کر خانساماں کے مضبوط ہاتھوں سے اپنا وجود چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے گالیوں کی بوچھاڑ سے نواز رہے تھے۔

مجھے مالی بابا دھکے دیتے ہوئے کوارٹر کی طرف لے گیا۔

صاحب اب بھی گالیاں دیتے ہوئے منہ سے کف اڑا رہے تھے۔

اور

ان کی انتہائی اسمارٹ اور ماڈرن بیگم بیڈ کے گدے پر ہچکیاں لیتے ہوئے اپنے نرم و گداز وجود کے ہلکے ہلکے جھٹکوں سے بیڈ میں زیروبم کی کیفیت پیدا کر رہی تھی۔ وہ پہلے تو بالکل گم صم ہو گئی تھی۔ سکتے کی سی کیفیت میں رہی تھی۔ پتھرائی ہوئی لگتی تھی۔

لیکن

اب وہ اوندھی پڑی سسکیوں اور ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

مالی بابا گالیاں بکتے ہوئے مجھے دھکے دیتے ہوئے کواٹر میں لے آیا۔۔۔۔مجھے میری چارپائی پر گراتے ہوئے اس نے غیر ہمدردانہ نگاہ مجھ پر ڈالی۔ پھر غصے سے دو چار گالیاں دیتے ہوئے بولا۔"کمینے ذلیل۔۔۔یہ تجھے کیا سوجھی۔۔۔۔"

میں بیدم سا الٹا سیدھا پڑا رہا۔

"سزا تو تیری یہی ہونا چاہیے تھی کہ صاحب تیرا اگلا دبوچ دیتا۔"

مالی بابا صاحب کے سامنے تو دم سادھے کھڑا تھا۔ اب اس واردات پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے دل کا غبار نکالنے لگا۔

"انسان کی اولاد ہے تو اتنی مار پھٹکار کو سمجھے گا۔ شریف گھرانوں میں نوکری کرنے کا سلیقہ ہی تجھے نہیں آیا۔۔۔۔حیوان ہی بن گیا تو۔۔۔۔"

بابا بہت کچھ کہہ رہا تھا۔۔۔۔شرافت نے دھچکا کھایا تھا۔ وہ جو کچھ بھی کہتا۔ حق بجانب تھا۔

باہر سے صاحب کے گرجنے برسنے کی آوازیں ابھی تک آ رہی تھیں۔ وہ مجھے پولیس کے حوالے کرنے کی باتیں چلا چلا کر کر رہے تھے اور خانساماں غالباً ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے منتیں کر رہا تھا۔"صاحب جی۔۔۔بات زیادہ نہ بڑھائیں۔۔۔۔بیگم صاحبہ کا نام آئے گا۔ خاندان کی بدنامی ہو گی۔۔۔۔آپ اس ذلیل کتے کو نکال دفع کریں۔ پولیس یا تھانے تک بات نہیں پہنچنی چاہیے۔"

"ناممکن۔۔۔۔۔میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔۔۔"

"صاحب جی۔۔صاحب جی۔۔۔خدا کے لیے۔۔۔"

خانساماں انہیں حقیقت حال سے آگاہ کرنے کے لیے عجز و انکساری سے کام لے رہا تھا۔ جانتا تھا صاحب کتنے

غصے میں ہیں اور جب انسان غصے میں ہو۔ اسے انجام و عواقب کی خبر نہیں رہتی۔ وہ اپنے وقتی جذبے کے
سامنے بے بس ہو جاتا ہے۔ اور انہی لمحوں کے رد عمل کے طور پر وہ کچھ کر گزرنا چاہتا ہے۔ جو غالباً ہوشمندی
کے علام میں نہیں کیا جانا چاہیے۔
میں قصوروار تھا۔ مجرم تھا۔

جرم اور ارتکاب جرم ایک ہی بات ہوتی ہے۔ وہ تو مالی بابا، بیگم صاحبہ کی چیخیں سن کر کمرے میں کھڑکی کے
ذریعے اندر کود آیا تھا۔ اور اتفاق سے ہی صاحب اپنا بریف کیس لینے آگئے تھے۔۔۔۔۔۔۔ بیگم کی قسمت
اچھی تھی۔۔۔۔۔۔۔ ورنہ میرے اندر کا وحشی انسان تو پوری طرح بیدار ہو کر پل پڑا تھا۔۔۔۔۔۔۔
مالی بابا غصے میں بھرا مجھے کوس رہا تھا۔
میں نے جو جرأت کی تھی۔۔۔۔۔۔۔ جو حرکت کر بیٹھا تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ قابل مذمت تھی۔۔۔۔۔۔۔
مالی بابا یا صاحب نہ آجاتے تو۔۔۔۔۔۔۔
"مجھے کیا ہو گیا تھا؟"

کیوں ہو گیا تھا؟
بابا کی گالیوں اور سرزنش کو سنی ان سنی کرتے اپنے آپ سے میں یہی پوچھے جا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ میرے اندر
کا جوان مردان سوالوں سے شرمندہ نہیں تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ بڑے طنز سے مسکرا رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور اس
سے جو فعل سرزد ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اس کو حق بجانب سمجھ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ وہ مجھے قصوروار نہیں سمجھ
رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ بلکہ ماڈرن اور خوبرو بیگم صاحبہ کو مجرم گردان رہا تھا۔ میں تو انتہائی شریف اور شرمیلا سا
نوجوان تھا۔۔۔۔۔۔۔ اور جب سے ہوش سنبھالی تھی، بڑے بڑے گھروں میں نوکری کر رہا تھا۔
یہاں آنے سے قبل میں ملک مختار احمد کے ہاں پورے پانچ سال نوکر رہا تھا۔ ان کی تین جوان بیٹیاں

تھیں۔۔۔ دو کی شادی میرے وہاں ہوتے ہی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔ میں پانچ سال وہاں رہا تھا۔ لڑکپن سے
جوانی وہیں آئی تھی۔۔۔۔۔۔۔ لیکن کبھی کوئی بیہودہ حرکت مجھ سے سرزد نہیں ہوئی۔۔۔۔۔۔۔ لڑکیوں
کے بارے میں کبھی کوئی برا خیال میرے دل میں نہیں آیا۔۔۔۔۔۔۔ میں نالاں تھا تو بیگم مختار
سے۔۔۔۔۔۔۔ جو ضرورت سے زیادہ سخت مزاج تھیں۔۔۔۔۔۔۔ کام کرنے کے باوجود ڈانٹ دیا کرتی
تھیں۔۔۔۔۔۔۔ یہ سخت مزاجی صرف مجھ تک

ہی محدود نہیں تھی۔۔۔۔۔۔۔ تینوں بیٹیوں پر بھی ان کی کڑی نگرانی تھی۔۔۔۔۔۔۔ انہیں اجازت نہیں
تھی کہ کسی بھی کام کے لیے مجھے اپنے کمرے میں طلب کریں۔ میرے سامنے وہ بغیر دوپٹے کے نہیں آتی
تھیں۔ بے جا آزادی دی ہی نہیں گئی تھی۔ یہ سختی ہی ان کا حصار تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ میں ان کی طرف
آزادانہ دیکھنے کی کبھی جرأت بھی نہیں کر سکا تھا۔
اس گھر میں آنے سے پہلے میں سال بھر گاؤں میں رہا تھا۔ میری ماں نے اپنی بھتیجی سے میری شادی کر دی
تھی۔۔۔۔۔۔۔ میں گاؤں ہی میں محنت مزدوری کرنے لگا تھا۔
"تم شہر کیوں نہیں جاتے۔۔۔۔۔۔۔ اچھی بھلی نوکری کرتے تھے۔ یہاں کیا ملتا ہے۔ ڈھنگ سے روٹی
بھی نہیں ملتی۔"
وہ شاید ٹھیک ہی کہتی تھی۔۔۔۔۔۔۔ میرے ہاتھ میں کوئی ہنر تو تھا نہیں۔ لیکن گھروں میں نوکری کر کے
اچھے پیسے مل جاتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ روٹی کپڑے کی بھی سہولت تھی۔ گاؤں کی رہائش سادہ سی ہوتی ہے،
تین چار سو روپے جس گھر میں نقد آجائیں۔۔۔۔۔۔۔ وہ تو خاصا خوشحال گنا جاتا ہے۔ ماں بھی زمیندار کے
ہاں کام کر کے آٹا چاول لے آتی تھی۔۔۔۔ نوراں کے کہنے پر میں شہر چلا آیا۔
اور اپنے گاؤں کے ساتھی نواز کے توسط سے اس گھر میں ملازم ہو گیا۔ بڑا متمول گھرانہ تھا۔ صاحب مل اونر

تھے۔خانساماں،مالی،دھوبی سبھی نوکر تھے۔ایک معمر ملازمہ بھی تھی۔۔۔۔۔۔۔مجھے بیرہ گیری سونپی گئی تھی۔۔۔۔۔۔۔اس کے علاوہ چھوٹے موٹے کام ہی مجھے کرنا پڑے تھے۔

صاحب کی شادی چند ماہ ہوئے،ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔ان کے ماں باپ الگ کوٹھی میں رہتے تھے۔صاحب اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ اس نئی کوٹھی

میں شفٹ ہوگئے تھے۔وہ یورپ اور امریکہ میں ہنی مون منا کر دو تین ماہ پہلے ہی لوٹے تھے۔۔۔۔دونوں بہت خوش تھے۔صاحب اکتیس برس کے ہوں گے جبکہ ان کی بیگم بمشکل بیس سال کی تھیں۔جوڑا خوب تھا۔۔۔۔۔۔ان کی مصروفیات بھی خوب تھیں۔

صاحب سات ساڑھے سات دفتر چلے جاتے۔۔۔۔۔۔ان کی واپسی تک بیگم صاحبہ کے لیے وقت گزارنا مشکل ہوتا۔۔۔۔۔۔دس بجے تک وہ اپنے بیڈروم میں ہی رہتیں۔۔۔۔۔۔پاپ میوزک سنتیں۔۔۔۔۔۔کبھی کلاسیکل موسیقی کے کیسٹ دھیمے سروں میں بجتے۔

ساڑھے دس بجے چائے یا کافی کی پیالی پیتیں۔پھر تیار ہو کر کبھی سسرال،کبھی میکے،کبھی سہیلی کے ہاں چلی جاتیں۔۔۔دوپہر کا کھانا صاحب کے ساتھ گھر پر ہی کھاتیں۔

ان کی شامیں رنگین وحسین تھیں۔کبھی ہوٹل،کبھی کلب،کبھی کسی دوست کے ہاں اور کبھی اپنے ہاں پارٹیاں ہوتیں۔ان کے ملنے والے بھی ان کی طرح تھے۔۔۔۔۔۔لگتا تھا۔۔۔۔۔۔کوئی فکر،کوئی سوچ،کوئی غم ان کے قریب نہیں پھٹکتا تھا۔

ان کی حسین ورنگین زندگی سے میں بھی مرعوب ومتاثر رہتا تھا۔۔۔۔۔رنگین سی گہما گہمی،خوشکن رونق اور بے تکلفانہ ماحول کی چہک مہک سے میں بہت خوش ہوتا تھا۔

مالی بابا اور خانساماں کبھی کبھی ان محفلوں پر تبصرہ کرکے دل کا غبار نکالا کرتے تھے۔۔۔۔۔ان لوگوں کو برا

بھلا کہتے تھے۔ان کی بے حجابیوں پر کڑھتے تھے۔عورتوں کے لباسوں پر تنقید کرتے،صاحب لوگوں کی سوئی ہوئی غیرتوں کو لعن طعن کرتے۔

لیکن

میں ان دونوں کی جی ہی جی میں مخالفت کرتا۔

امیر لوگ غم روزگار سے ناآشنا حال مست تھے۔ان کا اپنا نظریہ حیات تھا۔اپنی طرز زندگی تھی۔عیش ان آسودہ حال لوگوں کے ہی تو ہوتے ہیں۔آزادی

ے لیے یہی لوگ تو حقدار ہیں۔میری نظر میں نہ تو صاحب لوگوں کی غیرت سوئی ہوئی تھی۔نہ ہی ان کی بیگمات کی نیم عریاں لباسوں میں کوئی قابل اعتراض بات تھی۔۔۔۔۔۔ایک دو نہیں،سبھی ایک رنگ میں رنگے تھے۔۔۔۔۔۔اب وہ سب بے غیرت،بے حیا،اور بیہودہ تو نہیں تھے۔یہ تو ان کا اپنا مخصوص رہن سہن تھا۔۔۔۔۔۔زندگی نباہنے کا سلیقہ تھا۔بڑے لوگوں کی باتیں ہی تو انہیں عام لوگوں سے بڑا کرتی ہیں۔

میں نے اس گھر میں کام شروع کیا۔مجھے یہاں کی فضا اور ماحول اچھا لگا تھا۔۔۔۔۔۔اس لیے میں نے پوری دیانت داری سے کام کرنا شروع کیا تھا۔کام ہوتا ہی کتنا تھا۔اسی لیے میں نے اپنے کام سے علاوہ بھی کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

سارے کمروں کی جھاڑ پونچھ میں آپ ہی کر دیتا۔بے ترتیب چیزیں ترتیب سے رکھ دیتا۔بیگم صاحبہ کے کپڑوں کی الماری ٹھیک کرتا۔۔۔۔۔۔صاحب کے جوتے پالش کرتا،ان کی جرابیں رومال اور بنیانیں دھو کر استری کرکے رکھتا۔صاحب اور بیگم مجھ سے بہت خوش تھے۔

میرے کام کرنے کی لگن کو دیکھتے ہوئے ہی تو بیگم صاحبہ نے اپنے بہت سارے کام مجھ سے لینا شروع کر دیے تھے۔میں ایک طرح سے ان کا ملازم خاص ہوگیا تھا۔یوں ان کی مہکتی قربت میرے حواس پر چھانے

لگی تھی۔

اس دن وہ ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی تھیں۔ دونوں پاؤں سامنے والی میز پر رکھے گھٹنوں پر جھکے وہ ریمور سے اپنے پاؤں کے ناخن صاف کر رہی تھیں۔ میں لاؤنج میں چیزیں صاف کر رہا تھا۔

"اے بخشی!" انہوں نے ویسے ہی جھکے جھکے پکارا۔

"جی بیگم صاحب۔" میں ڈسٹر کندھے پر رکھ کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"ذرا میری ڈریسنگ ٹیبل سے نیل پالش تو اٹھا لاؤ۔۔۔۔۔" انہوں نے کہا۔ پھر

رنگ وغیرہ بتایا۔

میں مطلوبہ نیل پالش لے آیا۔

"رکھ دو۔" انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ اب بھی ناخن روئی سے لگے ریموور سے رگڑ رہی تھیں۔ ان کی اپنی مخصوص مہک میں سپرٹ کی بوتل مل گئی تھی۔

میں ان کے پاؤں دیکھنے لگا۔۔۔۔۔ سفید نرم و گداز پاؤں، گلابی گلابی ایڑیاں اور سڈول ٹانگوں کے اختتامی ہلکی سی گولائیوں والے ٹخنے۔۔۔۔۔ میں نے اتنے حسین پاؤں زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔ میرا دل بے اختیار ان کے پاؤں چھو لینے کو مچل گیا۔ میرے منہ میں پانی سا آ گیا۔

میں ان کے ارد گرد ہی منڈلاتا رہا۔ اور وہ مزے سے پائنچے اوپر کھینچے اپنے پاؤں کے ناخن رنگتی رہیں۔ اور میرے دل میں کھد بد ہوتی رہی۔

پھر

اس دن وہ اپنے کمرے میں قالین پر اوندھی لیٹی کوئی انگریزی میگزین دیکھ رہی تھیں۔۔۔۔۔ پاپ میوزک کے ساتھ ساتھ ان کی اوپر کو اٹھی ہوئی ٹانگیں ہل رہی تھیں۔ دونوں پاؤں جیسے گلے مل رہے تھے، دھمک کے

ساتھ پاؤں میں بھی دھمک پیدا ہو رہی تھی۔۔۔۔۔ آج انہوں نے میکسی پہنی ہوئی تھی۔ جو اوندھا لیٹنے سے الٹ کر ان کے گھٹنوں کے قریب اکٹھی ہو گئی تھی۔ ان کی حسین مرمریں ٹانگیں پاپ میوزک پر رقصاں تھیں۔

میں نے ادھ کھلے دروازے سے یہ حسین منظر دیکھا۔ میں بیگم صاحب کے لیے کافی لایا تھا۔

"کافی لایا ہوں بیگم صاحبہ۔۔۔۔۔" میں نے کافی دیر نگاہوں کو نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد کہا۔

"لے آؤ۔" وہ اسی طرح لیٹے لیٹے دونوں پاؤں کو ایک دوسرے میں الجھائے ٹانگوں کو ہلاتے ہوئے بولیں۔

میں نگاہیں جھکائے اندر داخل ہوا۔

"رکھ دو۔" انہوں نے میری طرف متوجہ ہوئے بغیر کہا۔ یوں لگا جیسے انہوں نے میرے اندر آنے کا نوٹس ہی نہیں لیا۔

میں چند لمحے کھڑا رہا۔

"اور کوئی چیز بیگم صاحبہ؟"

"نہیں اور ہاں سنو۔" وہ اٹھ بیٹھیں۔ تراشیدہ بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا۔۔۔۔۔ بغیر آستین کے میکسی کے گہرے گریبان کو ڈوری کھینچ کر انہوں نے ٹھیک کیا۔ پھر بولیں۔ "بخشی۔۔۔۔۔ میری گرین ساڑھی استری ہوئی ہے۔"

"کونسی بیگم صاحبہ۔"

"پھول والی گرین۔۔۔۔۔ الماری میں پڑی ہے۔۔۔۔۔ استری کر دو۔۔۔۔۔ مجھے شائستہ سے ملنے جانا ہے۔۔۔۔۔ ساتھ بلاؤز بھی پڑا ہے۔"

"اچھا جی۔"

"شاباش! اچھی طرح پریس کرنا۔"

"بہت اچھا جی۔"

میں کمرے سے نکل آیا۔ بیگم صاحب کی حسین ٹانگیں، خوبصورت پاؤں اور ڈھلانی ننگے کندھے پھل جڑیوں کی طرح رنگ برنگی چنگاریاں میرے ذہن میں بکھیرتے رہے۔

بیگم صاحبہ کو میرے کام کی وجہ سے مجھ پر بہت اعتماد ہو گیا تھا۔ اپنی زیوروں کی الماری وہ میرے سامنے کھولتیں۔ کپڑوں کے ساتھ میچ کر کے زیورات نکالتیں۔ میرے سامنے ہی اپنی گردن پر سجاتیں، کانوں سے لگاتیں۔ میرا ایمان متزلزل

ہونے لگتا۔۔۔۔۔ زیور کی وجہ سے نہیں۔۔۔۔۔ اس حسن کی وجہ سے جو زیورات سے دوچند ہو جاتا تھا۔

ان کا یہی اعتماد مجھے سرونٹ کوارٹر سے گھر کے اندر لے آیا۔ چند دن پہلے برابر والی کوٹھی میں چوری ہو گئی تھی۔۔۔۔۔ جس سے یہ لوگ بھی خائف تھے۔ گو گھر میں کتا موجود تھا۔ پھر بھی بیگم صاحبہ نے مجھے حکم دیا کہ تم لاؤنج میں سو جایا کرو۔۔۔۔۔ کوارٹر تو اتنے پیچھے ہیں۔ چور دور آ جائے تو کوارٹروں میں اطلاع اس وقت ہو گی، جب سب کچھ لوٹ کر لے جائیں گے۔"

صاحب نے بھی بیگم صاحبہ سے اتفاق کیا۔

میں اب کام کاج ختم کرنے کے بعد لاؤنج میں اپنا بستر ڈال لیتا تھا۔۔۔۔۔ ان دنوں میرے محسوسات عجیب ہوتے تھے۔۔۔۔۔ میں سونے سے پہلے کتنی دیر ٹکٹکی باندھے ماسٹر بیڈ روم کے دروازے کو تکا کرتا تھا۔

بیڈ روم خوبصورتی سے آراستہ تھا۔ اور جس میں ایک بے حد نفیس خوبصورت اور آرام دہ نرم و گداز سا بیڈ تھا۔

اس بیڈ پر ریشمی بستر اور نرم نرم تکیوں پر صاحب اور بیگم صاحبہ سوتے تھے۔

صبح بیڈ ٹی لی جاتی تو میں ہی لے کر جاتا تھا۔۔۔۔۔ وہ دونوں ہی بستر میں لیٹے ہوئے ہوتے تھے۔۔۔۔۔ بیگم

یا تو بعض اوقات جاگنے اور سونے کے درمیان ہوتیں۔ سر صاحب کے تکیے پر ہی رکھا ہوتا۔۔۔۔۔

جھالروں والی نائیٹی بے ترتیب ہوتی۔ ایک بازو صاحب کے سینے پر ہوتا۔۔۔۔۔

صاحب کبھی سگریٹ سلگا رہے ہوتے، کبھی کش لگا رہے ہوتے۔۔۔۔۔ مجھے بیڈ ٹی اندر لانے کا کہہ دیتے۔۔۔۔۔ انہوں نے خلوت میں مجھے کبھی مخل نہیں سمجھا تھا۔ میں نگاہیں جھکائے ٹی ٹیبل پر قریب رکھ دیتا۔ لیکن جھکی نگاہوں کے باوجود میرا روم روم بیگم صاحبہ کے جوان جسم کا طواف کر رہا ہوتا۔

اکثر صاحب مجھے چائے رکھنے کے بعد ٹیپ آن کرنے کا کہہ دیتے۔۔۔۔۔ کبھی اپنی من پسند کیسٹ ڈیک پر چلانے کا حکم دیتے۔۔۔۔۔ وہ مجھے ملازم سمجھ کر حکم دیتے تھے، میں بجا لاتا تھا۔

جانے کیوں یہ لوگ ملازم کو صرف اور صرف کام کرنے والی مشین سمجھتے ہیں۔ جسے چند سو سکے ماہوار دے کر وہ کام لینا جانتے ہیں، یہ کبھی بھی نہیں سوچتے کہ ملازم بھی انسان ہوتے ہیں۔ گوشت پوست کے بنے ہوئے۔ سینے میں دل رکھنے والی دھڑکنوں میں آرزوؤں، امنگوں اور ارمانوں کا سیل رواں رکھنے والے۔۔۔۔۔ ہر اچھی چیز انہیں بھی پسند ہوتی ہے۔۔۔۔۔ حسن کو بھی وہ پرکھ سکتے ہیں۔۔۔۔۔ ان کے جذبات میں بھی ہل چل مچ سکتی ہے۔ وہ بھی عورت کو صرف بیگم صاحبہ نہیں، عورت کے روپ میں دیکھتے ہیں۔۔۔۔۔ جنس کے وہ بھی غلام ہوتے ہیں۔ تحریک انہیں بھی ہو سکتی ہے۔

میں بیڈ ٹی دے کر ٹیپ یا ڈیک پر کیسٹ لگا کر کمرے سے نکل آتا۔ لیکن کمرے کی مسحور کن فضا مجھے بڑی دیر تک الجھائے رکھتی۔ فاسد خیالات مجھے گھیر لیتے۔ میں گھبرا جاتا۔ شیطان سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا۔۔۔ ایسے میں دانستہ نوراں کو یاد کرتا۔

لیکن

نوراں میں وہ جاذبیت، وہ چاشنی اور وہ حسن کہاں تھا۔۔۔ اس کے تو مٹی اور گوبر سے لپٹے کھردرے پیروں ہی

کو یاد کر کے مجھے کراہت محسوس ہونے لگتی۔۔ میں تو ان دنوں نرم گلابی ایڑیوں، مرمریں تراشی ہوئی پنڈلیوں اور خوبصورت جواں جسم کی تصوراتی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔

اس دن میں گہری نیند میں تھا۔۔ کوئی بڑا ہی سہانا سنہرا خواب میری آنکھوں میں اتر رہا تھا۔۔۔ رات کے جانے کس پہر کی بات تھی۔ میری سماعت سے آواز ٹکرائی۔

"بخشی۔۔ بخشی کے بچے۔۔ اٹھو۔"

آواز میں جھنجلاہٹ تھی۔۔۔ غصہ تھا۔ دکھ اور افسردگی تھی۔ میں بمشکل آنکھیں کھول پایا۔ میرے سرہانے کی طرف بیگم صاحبہ کھڑی تھیں۔

میں کچھ نہ سمجھ پایا۔ حواس باختہ سا ہوا۔ آنکھیں کھولیں، بند کیں۔ پھر گھبرا کر کھول دیں۔

"اٹھتے نہیں۔" انہوں نے قالین پر بچھے میرے بستر کو غصے سے ٹھوکر ماری۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

بیگم صاحبہ آسمانی رنگ کی مہین سی نائیٹی میں ملبوس گول مول کی ہوئی چادر کو سینے سے لگائے شاید ستر پوشی کے خیال سے لال بھبوکا چہرہ لیے کھڑی تھیں۔ ان پاؤں میں مخملیں سلیپر تھے اور سنہری پنڈلیاں ننگی تھیں۔۔۔ نائیٹی بمشکل گھٹنوں سے نیچے اتر سکتی تھی۔

"اٹھ کر گیسٹ روم کھولو اور بستر جھاڑ دو۔" انہوں نے صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔

"جی۔۔۔" میں اب پورے حواس میں تھا۔

"سنا نہیں۔۔۔" وہ غصے سے برسیں۔ "گیسٹ روم کھولو۔ بستر ٹھیک سے لگا دو، میں ادھر سوؤں گی۔"

غالباً صاحب اور بیگم صاحبہ میں لڑائی ہوئی تھی۔۔۔ اور وہ اپنا بیڈ روم چھوڑ کر گیسٹ روم میں سونے جا رہی تھیں۔

میں نے ان پر اک نگاہ ڈالی۔ آسمانی نائیٹی بڑی مہین اور نفیس تھی۔ بیگم جس طرح صوفے پر پڑی تھیں، لگتا تھا

جھاگ جھاگ پانی میں کوئی سنہری پھسلنی مچھلی بیدم ہو گئی ہے۔ میں جلدی سے گیسٹ روم کی طرف آیا۔۔۔ کمرہ کھولا۔۔۔ صاف ستھرا بستر بچھا تھا، پھر بھی میں نے چادر جھاڑ کر تکیے درست کیے۔۔۔ بیگم صاحبہ کو اطلاع دی۔۔۔ وہ تیر کی سی تیزی سے اٹھیں اور کمرے میں آئیں۔ دھم سے بستر پر اوندھی گر گئیں۔

مجھے یوں لگا جیسے جھاگ جھاگ نیلے پانیوں میں سنہری پھسلتی مچھلی نے تیرنے کے لیے غوطہ لگایا ہے۔

"دروازہ لاک کر کے جانا۔۔۔" بیگم شاید رو دینے کو مچل رہی تھی۔ بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ میں نے جلدی سے دروازہ لاک کر دیا۔ اور لاؤنج میں آ کر بے دم سا ہو کر بستر میں گر گیا۔ سنہری پھسلتی مچھلی جھاگ جھاگ پانی میں بیدم ہو جاتی۔ کبھی تیرنے کے لیے غوطے لگانے لگی۔ باقی ساری رات میری آنکھیں یہی کھیل دیکھتی رہیں۔

بیگم نے مجھے صرف اور صرف ملازم سمجھ کر گیسٹ روم کھولنے یا ادھر جا کر سونے کو کہا تھا۔۔۔ یہ میں اچھی طرح جانتا تھا۔ بیگم کے ذہن میں کوئی کثافت ہوتی تو وہ اس طرح میرے سامنے نہ آتی۔ مجھے گوشت پوست کا جوان آدمی سمجھتی وہ، یوں آدھی رات کو صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والی کیفیت میں میرے سامنے نہ آتی۔ وہ تو مجھے کام کرنے والی مشین ہی سمجھتی تھیں نا۔

میں ان دنوں اپنے آپ سے الگ ہو گیا تھا۔۔۔ میں، میں نہیں رہا تھا۔۔۔ میری سوچوں، میرے خیالات، میری جذبات میں اتھل پتھل ہوتی رہتی۔۔۔ مجھے لگتا جیسے میرے اندر شیطان بس گیا ہے۔ اس شیطان سے پیچھا چھڑانے کی میں شعوری اور لاشعوری کوشش کرنے لگا۔۔۔ شاید اس لیے میں گھر جانا چاہتا تھا۔ یہاں سے دور رہنا چاہتا تھا۔ اس فضا سے اس ماحول سے الگ ہونا چاہتا تھا۔

لیکن

بیگم نے چھٹی دینا منظور نہ کیا۔ "ہر دوسرے تیسرے دن تم لوگوں کو چھٹی چاہیے۔۔۔ گھر سے اتنے جلد اداس ہوناہوتاہے تواپنے گھر ہی رہاکرو۔۔۔"

بیگم کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے میں نے منت سے کہا۔ "چند دن کے لیے چھٹی دے دیجئے۔"

"ہمیشہ کے لیے چھٹی کر سکتے ہو۔" بیگم نے نخوت سے کہا۔ میں چپ ہو گیا۔۔۔

میرے اندر کی اتھل پتھل ختم نہ ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے سوچا۔ نوراں کو یہاں لے آؤں۔ کوارٹر تو میرے پاس تھاہی۔ نوراں ایک اکیلی تو تھی۔۔۔ لیکن بیگم صاحبہ نہیں مانی۔ خانساماں، مالی اور مجھے کوارٹر ملے ہوئے تھے۔ کسی کے بیوی بچے یہاں نہیں تھے۔ اس لیے نوراں کو بھی یہاں لانے کی اجازت نہ ملی۔

میرے اندر اگنے والے شیطانی جذبے سر کش ہو گئے۔۔۔۔۔۔ یہ لوگ ہمیں واقعی گوشت پوست کا بنا انسان نہیں، کام کرنے والی مشین ہی سمجھتے تھے۔ مشین جس میں پہلی تاریخ کو باقاعدگی سے تنخواہ کا تیل ڈالا جاتا تھا۔۔۔۔۔۔ اور مہینہ بھر مستعدی سے کام کرنے کے قابل بنایا جاسکتا تھا۔

اس شام بیگم اور صاحب کسی فنکشن میں جانے والے تھے۔ صاحب توسوٹ پہن کر تیار ہو گئے تھے۔ بیگم بڑے سے آئینے والے سنگھار میز پر سینکڑوں کاسمیٹکس کی چیزیں بکھیرے آئینے کے اوپر لگی دودھیا روشنیوں میں اپنا چہرہ خوبصورتی سی میک اپ سے سجارہی تھیں۔ کتھئی رنگ کا چولی نما بلاؤز پہنے اور اسی رنگ کے پٹی کوٹ میں وہ اسٹول پر بیٹھی تھیں۔ میں کتھئی خوبصورت اور قیمتی کام والی ساڑھی استری کر کے لایا۔ اندر آنے کی اجازت چاہی۔

"آجاؤ۔" بیگم نے ہونٹوں کے گرد پنسل سے آؤٹ لائن بناتے ہوئے کہا۔۔۔۔۔۔ ننگا سنہری پیٹ۔ ننگی پتلی سی کمر جس کے عین بیچوں بیچ ریڑھ کی ہڈی اندر کی طرف ہونے سے ہلکی سی نالی نما چیز بن گئی تھی۔ پشت تقریباً ساری ہی ننگی تھی۔ بلاؤز کی باریک باریک ڈوریاں بندھی تھیں۔

وہ میک اپ میں مصروف تھیں۔ شیشے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے بولیں۔

"بخشی! ذرا میری اسی رنگ کی سینڈل تو اٹھالاؤ اسٹینڈ پر سے۔"

"اچھا جی۔۔۔۔۔۔" میں بیگم کے قریب سے ہو کر گزرا۔ میرے نتھنوں میں اس کے جسم اور پرفیوم کی مہک گھسی۔ میں بے قابو سا ہوا۔ لیکن جلدی سے آگے

بڑھ گیا۔ اسٹینڈ سے ساڑھی کا ہم رنگ سینڈل نکالا اور بیڈ کے قریب رکھ کر کمرے سے نکل گیا۔ شیطانی اور حیوانی جذبے سر کشی کرنے لگے۔ میں نے بڑی کوشش سے اپنے آپ کو بچایا۔

بیگم آزاد خیال، روشن دماغ رکھنے والی ماڈرن عورت تھیں۔ جس ماحول میں وہ پلی بڑھی تھیں اور جس ماحول میں وہ اب رہ رہی تھی۔ اس کا تقاضا یہی تھا کہ عریانی اور نیم عریانی جسم کے ساتھ چمڑی کی طرح مڑھی قمیصوں کے گریبان اتنے گہرے ہوتے کہ ننگاپن محسوس ہوتا۔ وہ کبھی جینز پہن لیتی توسڈول سنہری پنڈلیاں قیامت ڈھانے لگتیں۔

لیکن میں جانتاہوں، وہ ان سب باتوں سے بیخبر ہوتی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ تین چار سو روپے میں کام کرنے والی مشین دل اور جذبات رکھنے والا مرد بھی ہے۔ نہ ہی اس کے صاحب نے اس بارے میں ذرہ برابر بھی وہم ذہن میں آنے دیا ہو گا۔۔۔۔۔۔ یہ ساری چیزیں، سارے فیشن، ساری آزادی، ساری عریانی توان کی زندگی کا حصہ تھی۔ ہم لوگ جسے عریانی کہتے یا سمجھتے ہیں، ان لوگوں کے لیے عریانی تھوڑا ہی ہوتی ہے۔

لیکن

میرے لیے یہ عریانی تھی، برہنگی تھی۔۔۔۔۔۔ ایک عورت کا نیم عریاں، نیم برہنہ وجود کیا ایک جوان اور بھرپور جذبات رکھنے والے مرد کے لیے چیلنج نہیں تھا۔

میں نے اس چیلنج کے سامنے کئی دفعہ ہتھیار ڈالنے اور کتنی دفعہ چیلنج کو چیلنج کیا۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں اپنے اندر کے شیطان کو کچلنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اپنی شرافت کو بچانے کے لیے بہت تگ و دو کی۔

لیکن

میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں کام کرنے والی مشین نہیں بن سکا۔ گوشت

پوست سے بنا، سینے میں دھڑکنیں بسائے رکھنے والا دل لیے تھے۔ چیلنج پوری قوت اور شدت سے میرا احاطہ کیے جا رہا تھا۔

اور

آج

ہاں آج میں نے یہ چیلنج قبول کر لیا تھا۔ میں غائب ہو گیا تھا اور میرے اندر کا شیطان باہر آ گیا تھا۔

بیگم نے دس سوا دس بجے کے قریب مجھے کافی لانے کا حکم دیا۔ میں کافی ٹرے میں لیے حسب معمول خواب گاہ کے داخلی دروازے کے قریب رک کر بولا تھا۔ "کافی بن گئی ہے بیگم صاحبہ!"

"لے آؤ۔" ان کی آواز آئی۔

میں اندر داخل ہوا۔ آج بیگم صاحبہ اپنے بیڈ پر ہی الٹی لیٹی تکیوں میں کہنیاں دیے کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ ڈیک پر کوئی انتہائی سریلی دھن ہولے ہولے چل رہی تھی۔

میں کافی لیے بیڈ کے قریب آ گیا۔

بیگم صاحبہ اتنی منہمک تھیں کہ انہیں جیسے میرے ہونے کا احساس نہ ہوا۔ میں کافی کی سلور ٹرے دونوں ہاتھوں میں پکڑے در زیدہ نگاہوں سے انہیں تکنے لگا۔۔ وہ کسی لچکیلے ریشمی کپڑے کا سوٹ پہنے تھیں۔ شلوار کے پائنچے بے ترتیبی سے کچھ اوپر اٹھ گئے تھے۔ بغیر آستین کی قمیض تھی۔۔۔۔۔۔۔۔ سڈول ڈھلانی

کندھے مجھے یوں لگا کسی قیمتی دھات سے تراشے گئے ہیں۔ ان کے بال کٹے ہوئے تھے۔ جو گردن کے کچھ حصے کو ڈھانپے ہوئے سامنے سینے کی طرف جھول رہے تھے۔ اور ان کے گہرے رنگ سے جھانکتا بدن ان آوارہ لٹوں سے جیسے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بیگم صاحبہ کافی۔" میں کسی لمحے چپ رہنے کے بعد بولا۔ اس لمحہ مجھے اپنی

واز کچھ بدلی بدلی سی لگی۔۔۔ میری آنکھوں میں کوئی بوجھل بوجھل شے اترنے لگی تھی۔۔۔۔۔۔۔

"رکھ دو۔۔۔۔۔۔۔۔" انہوں نے ایک نگاہ مجھ پر کی۔ پھر کتاب پر نظریں جما دیں۔

میں نے سائیڈ کی ٹیبل پر ٹرے رکھ دی۔

"بخشی۔۔۔۔۔۔۔" وہ اٹھ کر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔۔

"جی۔"

"ذرا بنا دو ایک پیالی۔"

"اچھا جی۔"

وہ گود میں کتاب رکھتے ہوئے مسکرائیں۔ "کافی اچھی بنا لیتے ہو۔"

"جی۔" میں صرف یہی کہہ سکا۔۔۔۔۔۔۔ میں بدنیت ہو رہا تھا۔ شیطان کے بہکاوے میں آ رہا تھا۔۔۔۔۔۔۔ اپنے وجودی خول سے باہر نکل رہا تھا۔

بیگم نے ایک ہاتھ سے قمیص اپنے شانوں پر ٹھیک کرتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے پھر کتاب اٹھا لی۔ میں نے ان کی طرف دیکھا۔

میرے ہاتھ کافی بناتے بناتے رک گئے۔

پھر

اچانک ہی جیسے بیگم کی چھٹی حس نے انہیں موقع کی سنگینی سے باخبر کر دیا۔۔۔۔۔۔۔وہ کتاب بند کر کے میری طرف دیکھتے ہوئے شاید کافی کے لیے کہنے کو تھیں۔

کہ

میں

میں چیتے کی طرح ان پر جھپٹا۔ آناً فاناً انہیں اپنے دونوں بازوؤں میں جکڑ کر بالکل وحشی بن گیا۔

بیگم ماڈرن آزاد اور فیشن ایبل ضرور تھی۔ لیکن بنیادی طور پر شریف عورت

تھی۔ میری اس حرکت پر وہ شاید ایک لمحہ کو پتھرائی لیکن پھر اتنا چیخی۔ اتنا چیخی کے لان میں کام کرتا مالی بابا کھڑکی سے کود کر اندر آ گیا۔

وہ ادھر کام نہ کر رہا ہوتا تو شاید شرافت ایک درندے کے ہاتھوں ذبح ہو جاتی۔

لیکن

جرم اور ارتکاب جرم ایک ہی بات ہے۔ میں نے بیگم کی عزت پر تو ہاتھ ڈالا تھا۔ صاحب طیش میں آ کر مجھے جان سے بھی مار ڈالتے تو بڑی بات نہ تھی۔ مجھے انہوں نے مار مار کر ادھ موا کر دیا۔ میرا بدن توڑ ڈالا ہے۔

میرے منہ سے خون نکل رہا ہے۔ ہڈیاں چیخ رہی ہیں اور گوشت جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے۔

میں مجرم ہوں۔

قصوروار ہوں۔

مجھے یہی سزا ملنی چاہیے۔

اب مالی بابا مجھے صلواتیں سنا رہا ہے۔ غصے سے تھوک رہا ہے مجھ پر۔

لیکن

میں سوچ رہا ہوں۔

کیا جرم وار صرف میں ہی ہوں؟

قصور صرف میرا ہی ہے؟

****